

مئی 2015

خواتین اور دانشوروں کیلئے اپنی طرز کا پہلا نامہ

خواتین معاشرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

راہنہ مال پاکستان خواتین ڈائجسٹ
راہنہ مال پاکستان خواتین ڈائجسٹ

MEMBER
APNS
CPNE

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیر — نگارہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیر — رضیہ جمیل

مدیر خصوصی — امت اصبور

بلقیس بھٹی

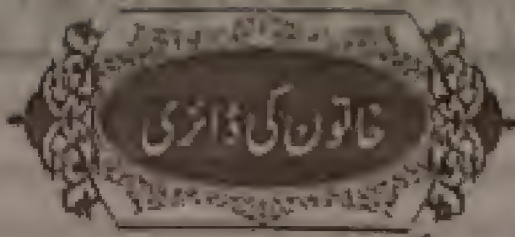
لفسیات — عدنان

رشتہ راز — خالدہ جیلانی

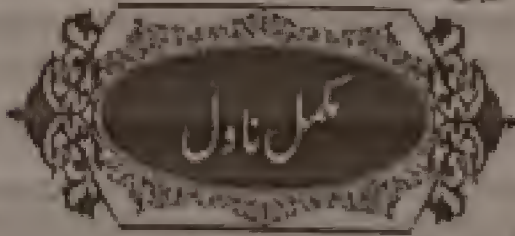
زنگ لائبریری کیلئے رجسٹری

پاکستان (3 سالانہ) — 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ — 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 8000 روپے

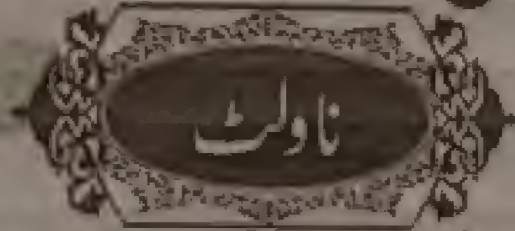




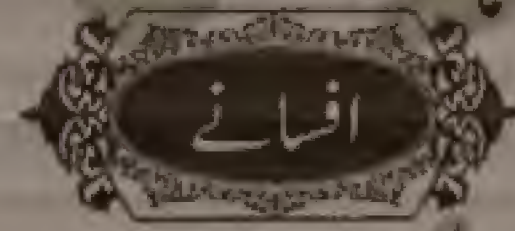
267 میری ڈائری سے (امت الصبور)



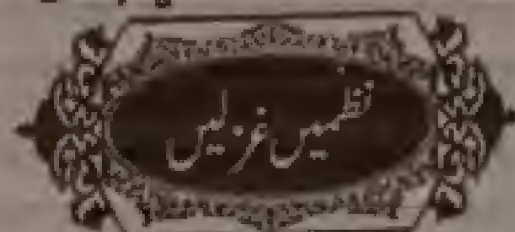
172 نملز احمد



80 سحر سابعہ
144 ام ایمان
118 عین دلی



74 قرۃ العین
106 غزالہ روشن
140 علیہ احمد
254 ازکی اخلاق
260 حیا بخاری

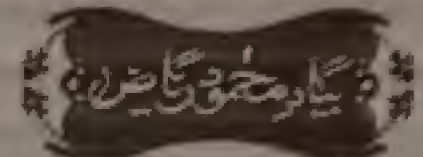


263 ناصر زیدی
263 نجمہ نسیم

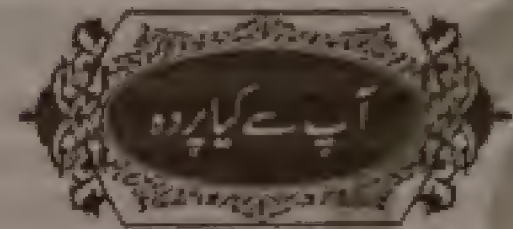
14 مدیر

15 ادارہ

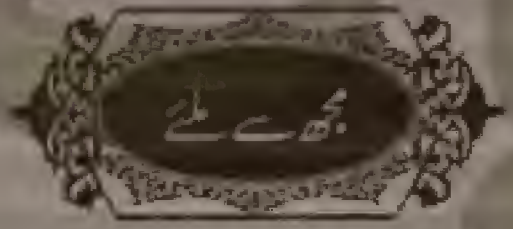
274 نادر خاتون



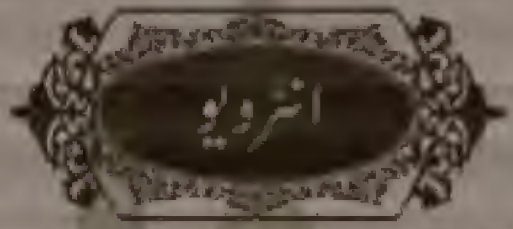
26 سعدیہ عزیز آفریدی
24 لبنی غزل



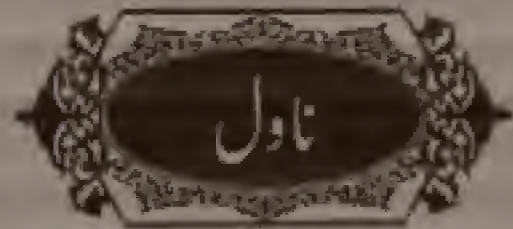
20 انشاجی



280 شاہین رشید

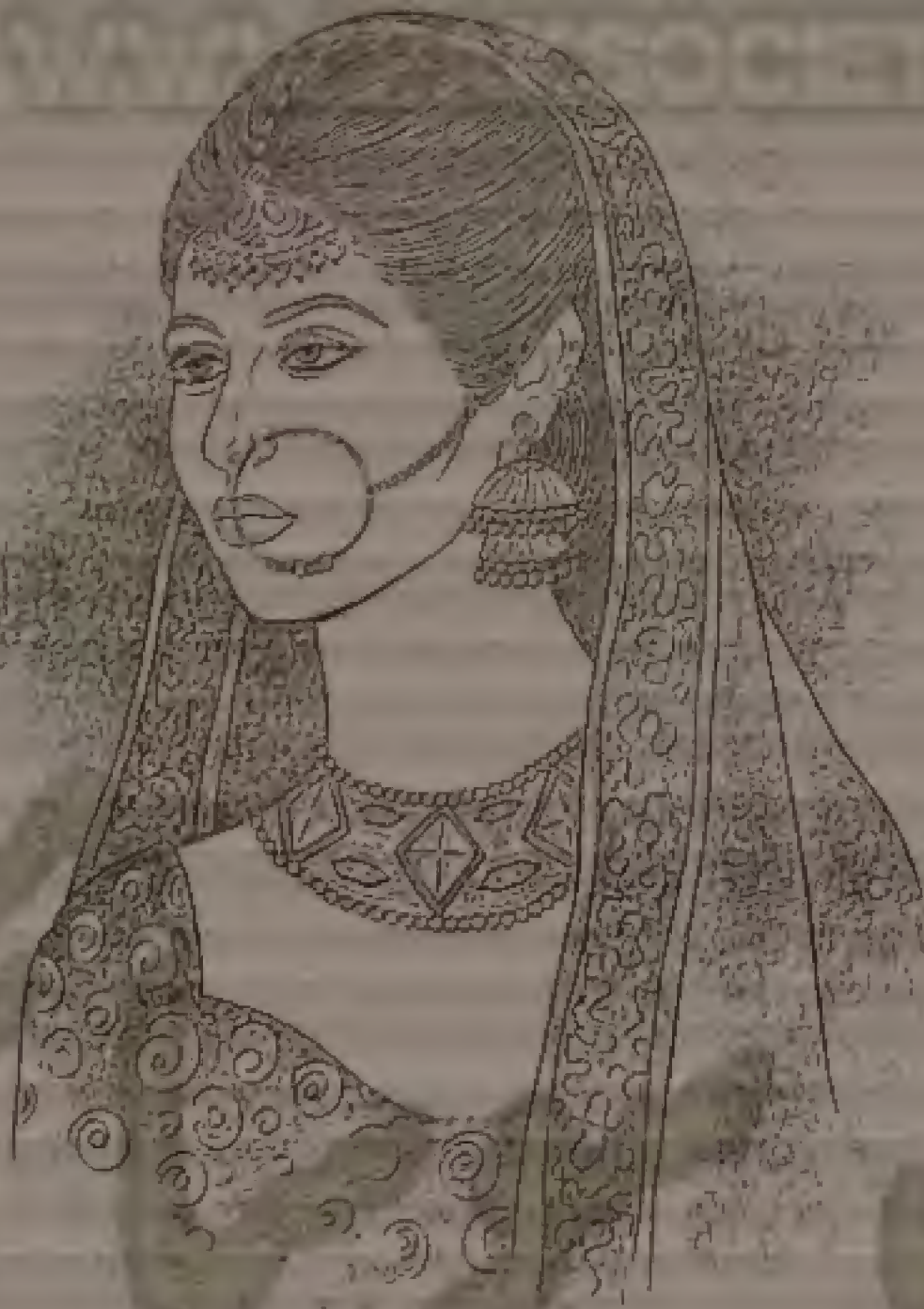


28 امت الصبور
269 شاہین رشید

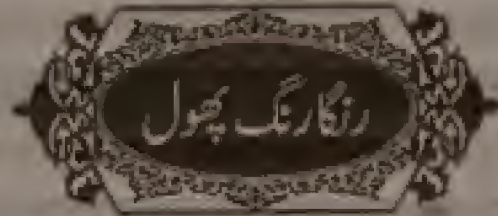


36 عمیرہ احمد
230 عفت سحر طاہر

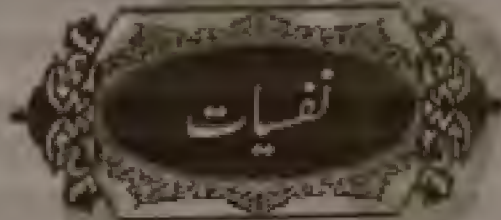
ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے مہینہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ دہی کا حق رکھتا ہے۔



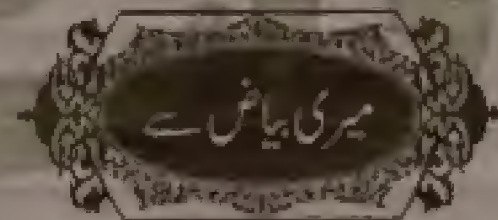
286 آپ کا باورچی خانہ کائنات خالد



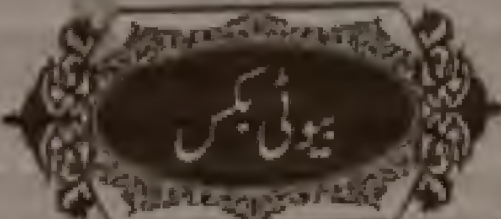
264 رنگارنگ سلسلہ شگفتہ جہاں
284 خبریں و بریں واصفہ آئیں



288 نفسیاتی ازدواجی الجھڑیں عدنان



268 آپ کی بیاض سے خالدہ جیلانی



290 بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور

مئی 2015

جلد 43 نمبر 1

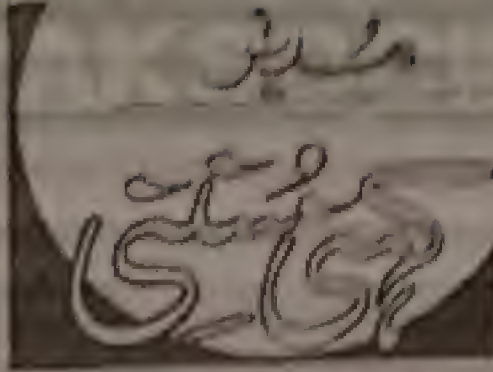
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذریہ بیاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا مئی کا شمارہ لے ماضیوں -
زندگی کیسا ہے کہاں سے آتی ہے کہاں چلی جاتی ہے، آغاز و انجام دونوں ہی نامعلوم۔ جو اس دنیا میں
آئی ہے، اسے جانا ہے۔ ایک اٹل حقیقت -
اس نگار خانہ ہستی میں موت و حیات کا یہ کھیل ازل سے جاری ہے اور ابد تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا
رہے گا۔

وہ لوگ جو ہماری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں، ہمارے سامنے ہوتے ہیں، ایک دن اچانک ہاتھ پھڑا کر بہت
دور نکل جاتے ہیں۔ انجان بستیوں کی طرف۔ اجنبی منزلوں کی طرف۔ اور کبھی ٹوٹ کر نہیں آتے، یہ کھو جانے
والے، پھڑپھڑانے والے اپنی یادیں، اپنی محبتیں ہمارے دلوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ زندگی اپنی تمام رعنائیوں
کے ساتھ جلوہ نگین رہتی ہے، دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے، لیکن جانے والوں کی یاد ایک کسک بن کر دل میں
جاں گزیں ہو جاتی ہے۔

زندگی کے اس مختصر سے وقفے کو معنی و مفہوم، ہم دوسروں کے لیے کچھ کر کے ہی عطا کر سکتے ہیں۔ انسان کا
دوسروں کے کام آنا ہی زندگی کو کچھ معنی دے سکتا ہے۔ ایسا کچھ کر کے چلو کہ بہت یاد رہو۔
ریاض صاحب کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے زندگی کے مفہوم کو سمجھا، اسے معنویت
عطا کی۔ خوش نصیب ان معنوں میں نہیں کہ وہ مرنے میں سونے کا چھو لے کر پیدا ہوئے اور ساری زندگی سکھ کا
جھولا جھولتے گزاری۔ زندگی میں انہوں نے بہت کچھ سہارا، محنت، محنت اور نامساعد حالات میں بہت جدوجہد
کے بعد اپنا مقام بنایا۔ ذہین، خوش شکل، خوش طبع، جوان بیٹوں کی دائمی جدائی کا صدمہ بڑی ہمت اور حوصلے
سے سہا۔

خوش نصیب ان معنوں میں تھے کہ انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے ادا کیں، خود سے
منسک تمام رشتوں کو خوش دلی سے نبھایا۔ ان کا خیال رکھا، سب کے کام بھی کئے۔ اور سب سے بڑی خوش نصیبی
یہ کہ جس پودے کو لگایا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پھلتے پھولتے، پردان چڑھتے دیکھا۔
خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن کی صورت جو چراغ روشن کیے، انہوں نے تاریک راستوں میں رہنمائی
کا فریضہ ادا کیا۔ اور روشنی کا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔
10 مئی کو ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں
کو درگزر فرمائے اور اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ نثر احمد کا مکمل ناول - غل،
- ۲۔ ایم ایمان قاضی کا مکمل ناول - اف یہ مہمی،
- ۳۔ سحر ساہو اور عنبرین ولی کے ناولٹ،
- ۴۔ عمیرہ احمد اور عنبرین ولی کے ناولٹ،
- ۵۔ قرۃ العین خرم ہاشمی، عزالہ روشن، جیسا بخاری، ازکی اخلاقی بٹ اور علی شاہ احمد کے افسانے،
- ۶۔ حرف سادہ کو دیا اعجاز کارنگ - مصنفین سے سروے،
- ۷۔ باصلاحیت بی بی ذبیحہ صباحت بخاری سے ملاقات،
- ۸۔ نوجوان فنکار آفاق وحید قریشی سے باتیں،
- ۹۔ کرن کرن روشنی - امادیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ۱۰۔ ہمارے نام، نفسانی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے مزید نوادیں لکھیں۔ منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک ایسا نوحہ نل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔ پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

ماکین کن روشنی

ادارہ

ضرورت سے زیادہ مارنا بھی اسی لیے ممنوع ہے کہ یہ حسن سلوک کے منافی ہے۔

بلی کی وجہ سے عذاب

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے قید کر دیا تھا حتیٰ کہ وہ مر گئی، چنانچہ وہ اس کی وجہ سے جہنم میں گئی۔ نہ اس نے اسے کھلایا پلایا جب کہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ اسے اس نے چھوڑا کہ وہ خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ حیوانات کے ساتھ بھی نرمی اور حسن سلوک ضروری ہے، سنگ دلی کا مظاہرہ حرام ہے۔

2۔ جانوروں کو قید کر کے پنجرے وغیرہ میں رکھنا جائز ہے بشرطیکہ ان کی خوراک اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

بغیر شرعی عذر کے یا حد ادب سے زیادہ غلام جانور بیوی اور اولاد کو سزا دینا ممنوع ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اور ماں باپ، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار (یا قریب کے) پر دسی، دور کے پر دسی، ہم نشین ساتھی اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے غلام ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“

(النساء۔ 36)

فائدہ :

ان تمام قسم کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جو حسن سلوک کے منافی ہو اور بغیر کسی شرعی عذر کے کسی کو سزا دینا یا ادب سکھانے کے لیے مارنے کی ضرورت پیش آجائے تو

جان دار چیز کو نشانہ بنانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کا گزر قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے ہوا جو ایک بوندے کو نشانہ بنائے اسے تیر مار رہے تھے اور بوندے کے مالک سے یہ طے کیا تھا کہ ہر چوک جانے والا تیر اس کا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو منتشر ہو گئے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا۔

”ایسا کام کس نے کیا ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کام کیا ہے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی جان دار چیز کو نشانہ بنائے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

کسی جاندار چیز کو تختہ مشق بنا کر اسے تیروں وغیرہ کا نشانہ بنانا کبیرہ گناہ ہے اس کام تک ملعون ہے۔

نشانہ بنانا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قتل یا نشانہ کے لیے) جانوروں کو باندھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب ہے کہ قتل کرنے کے لیے اسے قید کر دیا جائے۔

فائدہ :

باندھ کر یا قید کر کے مارنے کا مطلب ہے کہ اسے باندھ کر پھر تیروں یا گولیوں وغیرہ سے اسے نشانہ بنایا جائے حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جانور کو قابو کر کے اس کے گلے پر تیز چھری پھیری جائے تاکہ اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

ملازم کے ساتھ سلوک

حضرت ابو علی سدید بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں مقرن کے سات بیٹوں میں سے ساتواں تھا (ہم سات

بھائی تھے) ہماری ایک بیٹی تھی۔ اسے ہمارے سب سے چھوٹے بھائی نے طمانچہ مارا تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تم اسے آزاد کر دو۔ (مسلم)

ایک اور روایت میں ہے میں اپنے بھائیوں کا ساتواں تھا۔

فائدہ :

مملوک (غلام اور نوکر چاکر) کو بلاوجہ مارنا چڑھنا اور اس پر زیادتی کرنا سخت جرم ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے یا پھر کسی دوسرے طریقے سے اسے راضی کیا جائے ورنہ عند اللہ زیادتی کرنے والا مجرم ہو گا۔ یہ ساتواں بھائی صحابی اور مہاجر تھے۔

غلام کے ساتھ سلوک

حضرت ابو مسعود بنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی۔

”خبردار! اے ابو مسعود!“

مگر میں غصے کی حالت میں ہونے کی وجہ سے آواز کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ جب وہ (آواز دینے والے) میرے قریب ہوئے تو دیکھا کہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”خبردار! اے ابو مسعود! اللہ تعالیٰ تجھ پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہے جتنا تو اس غلام پر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے بعد میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ کی ہیبت سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔

ایک اور روایت میں ہے چنانچہ میں نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول! یہ اللہ کی رضا کے لیے آزاد ہے۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر تو آزاد نہ کرتا تو آگ تجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتی یا (فرمایا) تجھے جہنم کی آگ ضرور چھوٹی۔“ (یہ تمام روایات مسلم نے

بیان کی ہیں۔
فوائد و مسائل :

1۔ اس میں بھی غلاموں (اور نوکروں چاکروں) پر بلا وجہ سختی کرنے یا جرم سے زیادہ شدید سزا دینے کی وعید کا ذکر ہے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے جس جلالت و ہیبت سے سرفراز فرمایا تھا اس کا بھی کچھ بیان اس میں آگیا ہے۔

کفارہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس نے اپنے غلام پر کسی ایسے جرم کی حد لگائی جو اس نے کیا ہی نہیں یا اس کو طمانحہ مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دے۔“ (مسلم)

فائدہ :

قاضی عیاض فرماتے ہیں اس پر اجماع ہے کہ آزاد کرنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے، تاہم یہ آزادی گواہ میں بغیر کسی سبب کے آزاد کرنے کے برابر نہیں ہے، مگر اس کی زیادتی کا کفارہ ضرور ہوگی۔

لوگوں کو عذاب دینا

حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ”ان کا ملک شام میں کچھ جمعی کاشت کار لوگوں پر سے گزر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر زیتون کا تیل بہایا گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا ”یہ کیا ماجرا ہے؟“

ان کو بتلایا گیا کہ ”انہیں خراج کی وجہ سے سزا دی جا رہی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہیں جزیے کی وجہ سے قید کیا گیا ہے۔“ حضرت ہشام نے فرمایا۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔

”اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔“

پھر حضرت ہشام ان لوگوں کے گورنر کے پاس گئے۔ اور انہیں یہ حدیث سنائی تو گورنر نے ان کی بابت حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ خراج، اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو اس زمین کی پیداوار پر عائد کیا جاتا ہے جو کسی اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے قبضہ و تصرف میں ہو اور مسلمانوں کی زمینوں کی پیداوار سے جو مالیہ وصول کیا جاتا ہے اسے عشر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جزیہ، وہ سالانہ رقم ہے جو اسلامی مملکت میں رہنے والے زمیوں سے ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے عوض وصول کی جاتی ہے۔ مسلمان، سالانہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور غیر مسلم اہل ذمہ جزیہ۔

2۔ عذاب سے مراد وہ مخصوص قسم کی سخت سزا ہے جو اللہ تعالیٰ جہنم میں جہنمیوں کو دے گا، دنیا میں کوئی ایسی سزا کسی کو دے گا تو اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں آئے اور وہ قیامت والے دن ایسی سزا دینے والے کو سزا دے گا۔ چیلپاتی دھوپ میں کھڑا کرنا اور سروں پر تیل ڈالنا بھی، جہنم ہی کی سزاؤں میں سے ہے۔ اس لیے صحابی رسول نے حدیث رسول بیان فرما کر اس پر گورنر کو مشتبہ فرمایا اور انہوں نے یہ سزا موقوف کر دی۔

3۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

4۔ ظالموں کو ان کے ظلم سے ڈرایا جائے تاکہ وہ ظلم کے ارتکاب سے باز آجائیں۔

چہرے کو داغنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گدھے پر سے گزر ہوا جس کے چہرے کو داغایا گیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جس نے اسے داغایا ہے۔“ (مسلم)

اور مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مارنے اور چہرے کو

واغنے سے منع فرمایا ہے۔
فائدہ :

”اس پرندے کو اس کے بچوں کی وجہ سے کس نے
درد مند کیا (تکلیف پہنچائی) ہے؟ اس کے بچے
لوٹا دو۔“

اور آپ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جس کو
ہم نے جلا دیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔
”یہ بستی کس نے جلائی ہے؟“
ہم نے جواب دیا۔

”ہم نے (جلائی ہے)۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”آگ کا عذاب دینا تو آگ کے رب ہی کو سزا دار
ہے۔“

(اسے ابو داؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا
ہے۔)

چیونٹیوں کی بستی سے مراد چیونٹیوں کا ایسا مسکن
ہے جہاں چیونٹیاں موجود ہیں۔

فوائد و مسائل

1۔ پرندوں کے بچوں کو پکڑ کر پرندوں کو ایذا پہنچانا
چیونٹیوں اور دیگر حشرات الارض کے مسکنوں کو
کیڑے مکوڑوں سمیت جلانا منع ہے، البتہ خالی
مسکنوں کو جلانا ممنوع نہیں ہے۔

2۔ اگر کسی نے کسی کو آگ میں جلا کر مار دیا تو
قصاص میں ایسا کیا جاسکتا ہے کہ قاتل کو بھی جلا دیا
جائے، البتہ مقتول کے ورثاء چاہیں تو تلوار سے اس کی
گردن اڑا کر بھی قصاص لے سکتے ہیں۔

حق دار کا اپنے حق کا مطالبہ کرنے پر مال دار
آدمی کا ثمال مٹول کرنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم
دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو۔“ (نساء۔
58)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”پس اگر تمہارا بعض بعض پر اعتبار کرے تو
چاہیے کہ جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت
واپس کر دے“ (البقرہ۔ 283)

چہرہ چونکہ نہایت ہی لطیف اور حساس چیز ہے اس
لیے انسان ہو یا جانور اس کے چہرے پر مارنا یا اسے
واغنا یا کوئی اور ایسا عمل کرنا جو اس کی نزاکت کے
خلاف ہو، ممنوع ہے۔ اسی لیے بیوی، اولاد اور خادم
وغیرہ کو اگرچہ بطور تادیب مارنے کی اجازت ہے لیکن
یہ تاکید کی گئی ہے کہ اس مار سے چہرہ محفوظ رہے۔

ہر جان دار، حتیٰ کہ چیونٹی وغیرہ کو بھی آگ
میں جلانے کی سزا دینا منع ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں
روانہ کیا تو فرمایا۔

”اگر تم فلاں فلاں کو پاؤ تو ان کو آگ میں جلا دو۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے دو آدمیوں کا نام
لیا۔ پھر جب ہم نکلنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا۔ ”میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں
فلاں شخص کو جلا دینا۔ لیکن آگ کا عذاب تو صرف اللہ
ہی دے گا، اس لیے اگر تم ان کو پاؤ تو انہیں قتل کر
دینا۔“ (بخاری)

فائدہ :

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوسرے حکم میں
واضح فرمادیا کہ آگ میں جلانے کی سزا کسی کو نہیں دینی
چاہیے حتیٰ کہ اپنے شدید تر دشمن کو بھی نہیں۔

رحم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں
کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ساتھ تھے۔ آپ اپنی بشری حاجت کے لیے تشریف
لے گئے۔ ہم نے (چڑیا کی طرح کا) ایک سرخ پرندہ
دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے ان
بچوں کو پکڑ لیا۔ وہ پرندہ ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے
میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو آپ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ہبہ واپس لینے کی کراہت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص اپنے ہبے کو واپس لیتا ہے، وہ اس کتے کی طرح ہے جو تے کر کے اپنی تے کو چاٹتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے۔

”اس شخص کی مثال جو اپنا صدقہ واپس لیتا ہے، اس کتے کی طرح ہے جو تے کرتا ہے، پھر اپنی تے میں لوٹا اور اسے چاٹتا ہے۔“

ایک اور روایت میں ہے۔

”اپنے ہبے کو واپس لینے والا اپنی تے میں لوٹا اور اسے چاٹتا ہے۔“

ایک اور روایت میں ہے۔

”اپنے ہبے کو واپس لینے والا اپنی تے میں لوٹنے والے کی طرح ہے۔“

فائدہ :

اس کی شاعت و قباحت اس سے واضح ہے کہ ایک تو ایسے شخص کو جو ہبہ واپس لیتا ہے، کتے کے ساتھ تشبیہ مہدی ہے اور دوسرے، موہوب چیز کو تے سے تعبیر کیا جس سے انسان سخت کراہت محسوس کرتا ہے۔ تاہم علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اجنبی آدمی کے لیے ہے۔ اگر انسان اپنی اولاد یا پوتوں، بڑپوتوں کو کوئی چیز ہبہ کرے تو اسے واپس لینے کا یہ حکم نہیں ہے، اس کا واپس لینا اس کے لیے جائز ہے جیسا کہ عنوان باب سے بھی واضح ہے۔

صدقہ کی ہوئی اپنی چیز خریدنا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے

ہیں۔

”میں نے ایک شخص کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک گھوڑا دے دیا، چنانچہ جس کے پاس وہ تھا،

اس نے اسے ضائع کر دیا (اس کی دیکھ بھال نہیں کی۔) میں نے اسے اس سے خریدنے کا ارادہ کیا اور میرا

خیال تھا کہ وہ اسے معمولی سی قیمت پر بیچ دے گا۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کی بابت) پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اسے نہ خریدو اور اپنا صدقہ واپس نہ لو، اگرچہ وہ تمہیں ایک درہم میں دے دے، اس لیے کہ اپنا صدقہ واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو اپنی تے کو چاٹتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کو قیما خرید کر بھی واپس لینا جائز نہیں۔

مال یتیم کے حرام ہونے کی تاکید کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”بے شک وہ لوگ جو ناجائز طریقے سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ یقیناً اپنے پٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں اور عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔“ (النساء-10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا

”یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔“ (الانعام-152)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا

”یہ تجھ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، ان سے کہہ دے، ان کی اصلاح کرنی بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو (خرچ میں) اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے ہی بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے، خرابی کرنے والا کون ہے، اور اصلاح کرنے والا کون۔“ (البقرہ-220)



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تین چربہ کہانیاں ننھے منے بڑھوں کے لئے

انشائی

اٹھایا اور بائیں ٹانگ کے رسید کیا۔ گورو جی نے ہلبلا کر داہنی ٹانگ اوپر کر لی۔ اب پچھمی چند کی غیرت نے جوش مارا۔ اس نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور بائیں ٹانگ کی خوب ہی مرمت کی۔ گورو جی بہت چلائے۔

”ظالمو۔ کیوں مارے ڈالتے ہو، ہائے۔“ لیکن چیلے کہ علاقائی خود مختاری کے قائل تھے کب مانتے تھے۔ دونوں نے اخباری بیان جاری کیے اور زیادتی میں پہل کرنے کا الزام ایک دوسرے کو دیا۔ گورو جی کی ٹانگیں سوچ کر کیا ہو گئیں۔ مدتوں ہلدی چونا لگانا پڑا۔

”بس۔۔۔؟“
”نہیں۔۔۔ بس کیوں۔ کہانی آگے بھی چلتی ہے۔“
لالہ پچھمی چند کے کئی بیٹے تھے۔ بڑے ہونمار اور ہوشیار، پشاور، مل، لاہور، رام، سندھو پر کاش وغیرہ۔ جب لالہ چھمی چند کا دیہانت ہوا تو یہ ٹانگ انہوں نے ورثے میں پالی۔ وہ گورو جی کی ٹانگ تو دباتے تھے، لیکن کوئی ران کا حصہ زیادہ دیتا تھا۔ کوئی پنڈلی پر زیادہ محنت کرتا تھا۔ کوئی گھٹنے پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ آخر ایک زبردست جھگڑا ہوا اور طے ہوا کہ ہم اپنا اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔ لالہ پور بومل نے کہا۔ ہاں ہاں ٹھیک کر رہے ہو۔ میں بھی اپنے حصے کی ٹانگ کاٹ کر لے جا رہا ہوں۔ اب ان بر خورداروں نے گنڈا اسہ منگایا۔ ایک نے ران سنبھالی بوری میں ڈالی۔ دوسرے نے پنڈلی لے لی۔ تیسرے نے گھٹنا اٹھایا اور گھر کی راہ لی۔ اس کے بعد سے سب ہی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

”گورو جی کا کیا ہوا؟“

”معلوم نہیں کیا ہوا۔ کہانی میں اس کا ذکر نہیں۔“
”حد سے حد مر گئے ہوں گے۔ اچھا اب ایک اور کہانی سنو۔“

تین چربہ کہانیاں ننھے منے بڑھوں کے لیے!
اچھا تو میرے پیارے بزرگو! راج دلارے بزرگو! اب حقے کا ایک کش لو اور سو جاؤ۔ تم کام کر کے تھک گئے ہو گے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کل کا کام آج پر نہ ڈالو۔ یعنی جو کام کل ہو سکتا ہے، اسے آج مت کرو۔ آرام بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ بلکہ زریں اصول تو یہ کہ ”پہلے آرام، پھر بھی آرام۔“

”ارے بڑھو! انٹ کھٹ بڑھو! ہم کہانیاں کہاں سے لائیں۔ نئی کہانیاں تو آج کل قلم والوں کو بھی نہیں ملتیں۔ بے چارے کابل جاتے ہیں اور وہاں سے ہینگ، سلا جیت، ٹرانزسٹر ریڈیو اور چربہ کہانیاں لاتے ہیں۔ اچھا تم بھی کچھ نصیحت آمیز کہانیاں ہم سے سنو۔ لیکن شور مت کرنا، چین سے سننا۔“

1۔ ایک گرو کے دو چیلے

ایک تھا گورو۔ بڑا نیک، دھرم اتما۔ دو اس کے چیلے تھے۔ وفادار، جاں نثار، گورو کے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کے لیے تیار۔ ایک کا شہ نام پور بومل تھا۔ دوسرے کا پچھمی چند گورو جی جب لوگوں کو اپدیش دیتے اور ان کی مرادیں پوری کرنے کے بعد آرام کرنے کو لیتے تو چیلہ پور بومل ان کی داہنی ٹانگ دیتا اور پچھمی چند بائیں ٹانگ کی شمل سیوا کرتا۔ دونوں اپنے اپنے حصے کی ٹانگ کی منہی چالی کرتے۔ تیل چڑ کر اسے چمکاتے۔ جھنڈیاں اور گھنگرو باندھ کر اسے سجاتے۔ اس پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ ایک روز کرنا پرماتما کا ایسا ہوا کہ گورو جی ایک گروٹ لیٹ گئے اور ان کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے اوپر جاڑی۔ چیلے پور بومل کو بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً ”ایک ڈنڈا

مئی 2015

کے شمارے کن ایک جہت

بہنوں کا شعاع ایٹا مابنامہ



مئی 2015

کا شمارہ شائع

ہو گیا ہے

یہ راشدہ رفعت کا مکمل ناول "ہے زندگی کتنی حسین"،
یہ "خواب تھا کوئی" سمیت سب کے مکمل ناول کی دوسری اور آخری قسط،
یہ سمیرا خان کا مکمل ناول "چاند میری چوکھٹ پر"،
یہ رخسانہ نگار عدنان کا سلسلے دار ناول "ایک تھی مثال"،
یہ نبیلہ عزیز کا سلسلے دار ناول "رقصِ بسل"،
یہ سائدا اکرم کا ناول "سیاہ حاشیہ"،
یہ نسلِ رضا، قرۃ العین خرم ہاشمی، حمیرا نوشین، دیناز محمد سلیم اور نوشین ناز اختر کے افسانے،
یہ مقبول فنکارہ "روبینہ اشرف اور طارق" کا بندھن،
یہ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
یہ "رورڈ" آپ کے سوالات کے جوابات لیے "سمیرا حمید"،
یہ "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
یہ خط آپ کے، مسکراہٹیں، آئینہ خانے میں، کھانا کسی پہ،
موسم کے پھول اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع کا مئی 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

44 آدمی پانی نہ ملنے سے پیاسے مر جائیں تو
دوسرے میں 56 کو پکڑ کر تالاب میں ڈبو دیا
جائے۔ بے انصافی کب تک چلے گی۔
اچھا بس اب ہم تھک گئے۔
"ایک اور ایک اور۔"

3۔ دیو گری سے واپسی

اچھا اب ہم تمہیں ایک تاریخی حکایت سناتے
ہیں۔ ملک ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا محمد تغلق۔ بڑا
عقل والا۔ علم و فضل والا۔ ایک روز اس کو خیال آیا کہ
دہلی میں اور تو ساری خوبیاں ہیں، لیکن یہ ہندوستان

کے وسط میں نہیں۔ اس نے فوراً "نقشہ منکایا۔ پرکار
رکھ کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دکن کے اوپر دیو گری کا
مقام زیادہ مرکزی ہے۔ فوراً "حکم دیا۔

کہ مابعد دولت کا دار الخلافہ وہاں بنایا جائے اور دہلی کی
آبادی نہ صرف اہل کار بلکہ اہل حرفہ بھی کوچ کر کے
وہاں چلے جائیں۔ یہ ہمارا حکم ہے، کوئی سربانی نہ
کرے۔

رعایا نچروں اور چھکڑوں پر پیوی، بچے، مال، اسباب
لادروانہ ہوئے۔ کئی مہینے کی راہ تھی۔ کہیں ڈاکوؤں
نے حملہ کیا، کہیں جنگلی جانور آن پڑے۔ بہت سے مر
کھپ گئے۔ جو بچے انہوں نے وہاں سر چھپایا۔ کاروبار
جمایا۔ مقام پر فضا تھا، پسند آیا۔ لیکن نازک مزاج
شاہاں، ایک روز جانے کیوں ان کا جی دیو گری سے
اچھاٹ ہوا اور انہوں نے فرمان جاری کیا کہ چلو دہلی
واپس۔ یہاں ہمارا جی نہیں لگتا۔ جو لوگ بچ گئے تھے،
ان میں سے آدھے پھر ڈاکوؤں، جنگلی جانوروں اور راہ
کی سختیوں کا شکار ہوئے۔ بس تھوڑے سے برے
حالوں واپس پہنچے۔ اب اس سے بھی کئی اخلاقی نتیجے
نکلے ہیں۔ بھلا بتاؤ کیا؟

خراب۔ رستہ۔ رستہ۔ خراب۔ رستہ۔ رستہ۔

ارے کیا سو گئے۔ اچھا السلام علیکم! خدا حافظ شب
بخیر۔

2۔ مچھیرا اور انعام

"اچھا تو سنو! ایک مچھیرے کے ہاتھ ایک عمدہ سی
مچھلی آئی تو وہ انعام و اکرام کی خواہش میں اسے لیے
بادشاہ کے محل پر پہنچا اور اندر جانے کی کوشش کی۔
دربان نے روک دیا۔ "ہے کہاں جاتا ہے، پلٹ تیرا
دھیان کدھر ہے۔" مچھیرے نے مدعا بیان کیا۔ دربان
نے کہا۔ "دیکھ بابا! جو کچھ انعام ملے اس میں سے چھپن
فیصدی میں لوں گا۔"

مچھیرا آدھے پر راضی ہو گیا، لیکن دربان اپنے چھپن
فیصدی پر اڑا رہا، بلکہ بولا۔

"اگر بادشاہ نے اس مچھلی کو برآمد کر کے فارن
ایک بیچ کمایا تو اس میں سے بھی چھپن فیصد لا کر مجھے
دینا۔"

خیر اس بے چارے کو باہی بھرنی پڑی۔
بادشاہ مچھلی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ "مانگ
کیا انعام مانگتا ہے؟"

مچھیرے نے کہا۔ حضور، اللہ کا دیا اور تو سب کچھ
ہے۔ بس سو جوتے میرے سر پر کس کے لگا دیے
جائیں۔

بادشاہ بہت حیران ہوا، سمجھانے کی کوشش کی،
لیکن بوڑھا مچھیرا اڑا رہا۔ آخر بادشاہ نے ایک چوبدار
سے کہا۔ "اس کے سر پر ہلکے ہلکے سوچھتر لگا دو۔ داغ
خراب معلوم ہوتا ہے بے چارے کا۔"

جب گنتی 44 پر پہنچی تو مچھیرے نے کہا۔
"حضور بس، میرا اس میں اتنا ہی حصہ ہے۔ باقی
56 جوتوں کا حق دار باہر ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔"
بادشاہ نے پورا حل سنا۔ انصاف پسند تھا۔ اس نے
کہا۔

"ہاں بھی بات تو ٹھیک ہے۔ جمہوریت کا زمانہ
ہے۔ ہر چیز میں اس کو حصہ واجب ملنا چاہیے۔ خواہ
بے بھاد کے جوتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اب تو ہم اپنے
ملک میں بھی یہ کرنے والے ہیں کہ اگر ایک حصے میں



بیاد محمود دریا گاہن



آہ! کیسے بھلائیں ہم اہل دہلی سے
دلوں میں پیوڑ گیا اپنی داستاں وہ شخص

PAKSOCIETY.COM

روشنی کہ خوشبو

لبنی غزل

ڈائجسٹ کے آفس اپنی پہلی تحریر چھپوانے کی غرض سے گئی تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آج تو خواتین ڈائجسٹ کا دفتر بند ہے کیونکہ انشاء جی کی برسی ہے۔

میں اس بات پر حیران تھی کہ انشاء جی کی برسی پر خواتین ڈائجسٹ کا دفتر کیوں بند ہے۔

بہر حال میں کچھ دنوں کے بعد دوبارہ گئی تو ریاض صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں دیکھ رہی ہوں یا انشاء جی کو۔ دونوں میں حد درجہ مشابہت اور مماثلت۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ انشاء جی ریاض صاحب کے بھائی تھے جن کی وفات نے انہیں صدمے سے نہ حال کر رکھا تھا مگر دکھ کی اس کیفیت میں بھی ریاض صاحب نے میزبانی کا پورا حق ادا کیا اور بہت اچھی طرح ملے۔ وہیں امتل سے بھی تعارف ہوا اور ملاقات ہوئی بہت ادنیٰ ماحول میں۔ ریاض صاحب کے مزاج کی شکستگی ان کا خوش دلی سے ملنا ان کی شاعرانہ اور فو معنی باتیں موقع محل سے برجستہ جملے اور حاضر جوابی کا جواب نہیں تھا۔ ہر بات میں شعر بڑھنا ان کے اعلا ذوق کی نشاندہی تھا۔ میں چونکہ ابتدائی دور میں اپنی والدہ کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ ریاض صاحب میری والدہ سے پنجابی میں بات کرتے تو مجھے بہت خوشی اور اپنائیت کا احساس ہوتا تھا اور مجھے ریاض صاحب کہتے تھے۔

”تم تو جعلی پنجابی ہو جسے اپنی زبان بولنا نہیں آتی۔“ دیکھنے میں ریاض صاحب کی شخصیت نہایت سنجیدہ خاموش اور رعب دار تھی مگر مزاج میں دھیمہ پن شاعرانہ انداز اور بذلہ سبھی نمایاں تھی۔

طبیعت میں سادگی تھی اس لیے میں نے ان کے آفس میں ان کی میز کو بے ترتیب ہی پایا۔ بکھرے

ایک طویل عرصہ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق رہا، بے شمار کہانیاں، ناول افسانے لکھے، تعلق تو اب بھی ہے لیکن مصروفیات نے لکھنے سے دور کر دیا، جاب، نئے گھر داری اور دوسرے مسائل میں گھر کر بڑھنے کی حد تک تورشتہ قائم رہا، لیکن لکھنے کی مہلت نہ ملی۔

ایک عرصے کے بعد امتل کا فون آیا اور اس نے سالگرہ نمبر کے سروے میں حصہ لینے کو کہا تو نہ جانے کیا کیا یاد آیا۔

مئی کا مہینہ ہی تو تھا جب ریاض صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اپریل میں میرے شوہر شکیل کی پہلی برسی تھی، ایک طویل رفاقت کے بعد انہوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب ریاض صاحب کی برسی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔

اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا

یہ دنیا ایک سرائے ہے اور سب اس کے مسافر۔ اور مسافروں کو تو جانا ہی ہوتا ہے۔ کسی کو جلدی کسی کو دیر سے۔ مسافر تو چلا جاتا ہے، مگر اس کے جانے کے بعد اس کے قدموں کے نشان ہر قدم پر اس کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

انشاء جی، ریاض صاحب، محمود بابر فیصل، محمود خاور جو چاند نگر کے باسی تھے، اب اس جہاں سے کوچ کر چکے ہیں جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔ اپنے پیاروں کی زندگی بھر کی جدائی کا روگ سہنا کس قدر مشکل لگتا ہے، یہ اب میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔

وقت جو ظالم بھی ہے اور مرہم بھی۔ وقت گزر ہی جاتا ہے۔ آج ریاض صاحب کو اس دنیا سے گئے چودہ برس بیت گئے۔ مگر لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔ جب میں پہلی بار اپنی والدہ کے ساتھ خواتین



ہوئے کاغذات اور کتابیں۔ اس ماحول میں بھی زندگی محسوس ہوتی تھی، کیونکہ ان کے چاروں طرف سچے لفظ بکھرے ہوتے تھے اور وہ لفظ باتیں کرتے تھے۔ ریاض صاحب کی مثبت اور اصلاحی تنقید اور اچھی تحریروں پر حوصلہ افزائی نے مجھے ایک دہائی تک مسلسل خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن کا لکھاری بنائے رکھا۔ جس ماہ میں لکھ نہیں پاتی تھی، ریاض صاحب اصرار کر کے اگلے پرچے کے لیے زبردستی لکھواتے تھے۔

آج یہ ادارہ جس مقام پر ہے اس میں ریاض صاحب اور ان کے بیٹوں کی ان ٹھک محنت کا رنگ شامل ہے۔ آج ڈائجسٹ راسٹرزٹی۔ وی چینلز پر چھائی ہوئی ہیں اس کا سارا کریڈٹ اس ادارے کو ہی جاتا ہے، جس کی بنیادوں میں ریاض صاحب اور ان کے بیٹوں کی محنتوں کا پسینہ شامل ہے۔

ریاض صاحب کی مضبوط قد آور اور رعب دار شخصیت میں اس وقت دراڑ آگئی، جب انہوں نے دو جوان بیٹوں کا دکھ سہا۔ باپ کے کندھوں پر اس سے بڑا بوجھ کوئی اور نہیں ہو سکتا اور کوئی اور بڑا دکھ نہیں ہو سکتا کہ اس کے جوان بیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائیں۔ جوان اولاد کی دائمی جدائی کا روگ انہیں اندر سے ختم کر گیا۔ اور پھر وہ خود بھی ان سے جا ملے۔ اپنوں سے جدائی کا دکھ، دائمی جدائی کا دکھ کیا ہوتا ہے اسے میں اب اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کیونکہ ابھی پچھلے برس ہی تو میں نے اور میرے بچوں نے اپنا سب سے قیمتی رشتہ ہمیشہ کے لیے کھودیا ہے۔ اور برسی کے چند دنوں کے بعد ہی میں ریاض صاحب کے لیے یہ تعزیتی مضمون لکھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے کہ وہ وقت پھر زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے آکر ٹھہر گیا ہے۔ وہ ظالم وقت جو ہم سے ہمارے اپنے کتنی بے دردی سے چھین کر لے جاتا ہے۔ مگر یہ قانون قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم کہ جسے آنا ہے اسے جانا بھی ہے۔ اور جانے والوں کو کوئی

روک نہیں سکتا اور نہ ہی جانے والوں کے ساتھ جایا جاسکتا ہے۔ بس پھر اپنے آپ کو صبر کے حوالے کرنا پڑتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔

اک اور در بند ہو گیا
اک اور سا بہان کھو گیا
پھر کہاں صورت نصیب ان کی
عدم کے راستے پر اک بار جو گیا
عداوت کی جسے عادت نہ تھی
ستم پہ ستم وہ شخص ہو گیا
اپنے پیاروں کی جدائی میں

ہنس کر آخر وہ بھی رو گیا
نیند سے خالی آنکھیں تھیں
پھر بھی تھک ہار کر سو گیا
جگر گوشوں کو روانہ کیا
پھر ان کے پیچھے خود بھی ہو لیا



زندگی کی صورت

سعدیہ عزیز آفریدی

وہ ایسے ہی تھے نرم خو، حلیم طبع اور سیاحت میڈ، سیاحت میڈ لوگ زندگی کا حسن ہوتے ہیں، انہوں نے جب خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا تو دھیرے دھیرے وہ ایک سفر کی بنیاد رکھ رہے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا یہ سفر کتنا طویل، کتنا خوش گوار رہے گا، مگر وہ چل پڑے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے فرد سے فرد ملتا گیا اور قافلہ بنتا گیا، ڈائجسٹ گھر کا فرد بنتا گیا۔ شعرو شاعری، خطوط، محبت کی باتیں، بیوی، بکس، اور دین کی بنیادیں کھڑی ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ ایک عمارت بنتی گئی پھر ”شعلع“ عمران، کرن کے ذریعے ان سے مضبوط رشتہ بنتا گیا، اتنا مضبوط کہ آج بھی لوگ انہیں یاد کرتے ہیں۔ ان کے اس سفر کو نئے سرے سے پڑھنا چاہتے ہیں اور میرا قلم ہے کہ آج بھی ان کو مرحوم لکھتے ہوئے کئی بار لڑکھڑا جاتا ہے اور ایک ہی سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ ریاض صاحب جیسے لوگ مر سکتے ہیں؟ اور کوئی چپکے سے کہتا ہے، ”نہیں ایسے لوگ جن کے جانے کے بعد بھی انہیں یاد رکھیں، ان کی مہربانیوں کو دہرائیں، ان کے کاموں کو سراہیں، ان کی جدائی پر پہلے دن کی طرح تڑپ اٹھیں، ان کی باتوں کو مشعل راہ بنائیں، ان کی محبت کے انداز کو محبت سے تھامے رکھیں، وہ انسان مرا نہیں کرتے، وہ لوگ زندہ رہتے ہیں، لفظوں میں، دلوں میں، زندگی میں، ایسے لوگوں کا سفر رکنا نہیں ہے، ان کا سفر جاری رہتا ہے اور جو سفر جاری رہے وہ روح کے لیے صدقہ جاریہ بن جاتا ہے اور روح نا ابد زندہ ہے، ریاض صاحب اب بھی زندہ ہیں، زندہ رہیں گے، کیونکہ وہ دل تھے، روح تھے، محبت تھے۔ اور محبت کبھی نہیں مرتی۔



کچھ لوگ سبز موسموں کی دعا ہوتے ہیں
جیون میں سکھ کی ردا ہوتے ہیں
زندہ رہتے ہیں کچھ اس طرح سے
زندگی کی صورت دلربا ہوتے ہیں

ریاض صاحب بھی زندگی کی صورت دلربا ہی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی کے سفر میں راستہ نہیں تو نہ صرف خود اس پر چلتے ہیں بلکہ پیچھے آنے والوں کو بھی آسانیاں دینے کی سعی کرتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں اگر کسی سفر میں کوئی گرتا ہے تو وہ اپنے آگے چلنے والوں پر صرف تنقید کرتا ہے۔ ان لفظوں سے کہ انہوں نے راستے کے پتھر نہیں ہٹائے جو اس کو گرانے کا سبب بنے۔



حرفِ سادہ کو دیگا عجزِ کارنگ

امتِ الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے
تھکنے نہیں دیا۔

گردشِ ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلہ شوق رکنے نہیں پایا،
وہ شوق وہ جستجو وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو
ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہدِ حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے
ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے
لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ
خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتے
ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جانتا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

- 1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر
میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟
- 2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا
رائے ہے۔
- 3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ
پسند ہے؟
- 4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریروں شوق سے پڑھتی ہیں؟
- 5 اپنی پسند کا کوئی شعریا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔
آئیے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

نمرہ بخاری

آپ کا بھیجا ہوا سوال نامہ بہت دنوں سے میری فائل میں موجود ہے۔ سوال بہت اچھے ہیں۔ مگر عمر
رفتہ کو آواز دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں لمبی لمبی
کہانیاں تو لکھ لیتی ہوں لیکن کسی کو خط لکھنا، بچوں کے
لے تقریر یا مضمون لکھنا اور اسی طرح سوالوں کے

ابن انشاء کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا تحریر کردہ مقالہ

ابن انشاء

احوال و آثار

شائع ہوگئی ہے



قیمت: -/ 1200 روپے

ڈاک خرچ: -/ 50 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

جواب لکھنا میرے لیے بے حد مشکل کام ہے۔
بہر حال آج کاغذ لکھنے کے کر بیٹھ گئی ہوں۔
اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں۔
(1) آپ کا پہلا سوال کیا کیا یا دو لارہا ہے مجھے۔
وہ سارے لوگ جو علم کے حصول میں سرگرداں
رہے۔ جنہوں نے کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ وہ کون
تھے؟ وہ میرے اپنے تھے۔
مجھے لکھنے کی صلاحیت وراثت میں ملی ہے۔ میری
دادی اماں۔ میری دو پھوپھو، بہت اچھا لکھنے والوں میں
تھیں۔

میری بڑی پھوپھو جو میرے والد کی بڑی بہن تھیں،
لاہور میں باقاعدہ مشاعرے اٹینڈ کیا کرتی تھیں۔ یہ
میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔

جب ہم نے ہوش سنبھالا، شاعری کی کتابیں اچھی
لکھنے لگیں تو اس کے ساتھ ہی شعرا کی ذات میں بھی
دلچسپی پیدا ہوئی۔ ہم ان سے پوچھا کرتے تھے احمد فراز
کے بارے میں پروین شاکر اور دوسرے بہت سے شعرا
کے بارے میں۔

شادی کے بعد انہیں لاہور چھوڑنا پڑا، ان کے شوہر
گورنمنٹ آفیسر تھے ایک شہر سے دوسرے شہر سفر
ہوتی رہتی تھی پھر گھریلو مصروفیات بھی تھیں۔ میری
پھوپھو کچھ عرصے کے لیے لکھنا بھول ہی گئی تھیں۔
لیکن پھر جب فراغت کا دور آیا تو انہوں نے دوبارہ بھی
لکھا۔ میری چھوٹی پھوپھو جو منشی چلی گئی تھیں اور وہاں
ادبی حلقوں میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔

میری ذات کا جہاں تک تعلق ہے۔ میں نے لکھنے
کا آغاز تو تب کیا جب میٹرک کے امتحانات کے بعد میں
فارغ تھی، لیکن کہانیاں بنانا میں نے بہت پہلے شروع کر
دیا تھا۔ خاندان میں افسانہ نگار تو کم ہیں۔ میری علاوہ

میری بہن عظمیٰ بخاری نے لکھا مگر پھر گھریلو مصروفیات
آڑے آئیں اور یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ
سکی۔

میرا پھوپھو بھی زاو بھائی یا سر جو ادب سے بہت متوجہ ہیں اور
ادبی حلقوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔

(2) اب آتے ہیں آپ کے دوسرے سوال کی

طرف۔

جی نہیں، میری کہانیاں میرے گھر والے نہیں پڑھتے۔ صرف عظمیٰ بخاری میری بہن ہے جو پڑھتی ہے اور سراہتی بھی ہے۔

اس کے علاوہ تو کوئی میری کہانیوں کو پڑھتا ہے نہ میرا لکھا ڈرامہ دیکھتا ہے اور نہ ہی میرا تعارف کسی اجنبی سے کرواتے ہوئے یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری یہ عزیز چھوٹی موٹی رائٹر بھی ہے۔

میرے میاں صاحب نے شاید ہی میری کوئی تحریر پڑھی ہوگی۔

گھر والوں کے ایسے سلوک کی وجہ سے اگر کہیں کبھی کوئی فین نکلا جائے اور کہہ دے کہ ہم آپ کو شوق سے پڑھتے ہیں تو میں بے یقین اور شرمندہ دکھائی دیتی ہوں۔

(3) سوال نمبر 3 کا جواب دینا میرے لیے ذرا مشکل ہے۔ میں نے تقریباً ساڑھے چار سو کے قریب افسانے لکھے ہیں اور انہیں تین مختلف رنگوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک رنگ وہ ہے جو مکمل وہی زندگی کی عکاسی کرتا ہے، میں نے دیہات کی زندگی خصوصاً دیہات کی عورت کی زندگی پر کافی زیادہ لکھا ہے۔ دوسرے نمبر پر ہلکی پھلکی کامیڈی ہے اور مجھے حیرت ہے، لوگ مجھے میرے اسی رنگ سے پہچانتے ہیں۔

تیسرا رنگ ہماری عام معاشرتی زندگی کا ہے۔

دیہاتی کلچر، لکھی گئی تحریروں میں سے کسی ایک کا انتخاب مشکل ہے۔ اپنی کتاب ”دل دادیں“ میں میں نے کچھ کہانیاں انکشی کی ہیں اور یہ سب ہی مجھے پسند ہیں۔

عام معاشرتی کہانیوں میں ”لاؤ اپنے حسن کی ناؤ“ ”تتلی اور دریچہ“ اور بھی بہت سی کہانیاں جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہے اور اگر کامیڈی کی بات

کی جائے۔ جب سے ”ہم سے ہے زمانہ“ لکھنا شروع کیا ہے، میری باقی کہانیاں بچے رہ گئی ہیں۔ ان دو کریکٹر کو لے کر لکھنا مجھے خود بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ لوگ تعریف کرتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

مجھے اپنی ہر کہانی لکھنے کے بعد اطمینان ہی محسوس ہوا کرتا تھا۔ وجہ یہ بھی کہ ہر ماہ ڈیرامتل کا خط موصول ہوتا تھا جس میں وہ لکھتی تھیں، جلدی سے ناولٹ یا مکمل ناول لکھ بیجو، میں نے ڈائجسٹ میں تمہارے لیے صفحات رکھے ہیں۔ اور میں ہڑبڑا کر لکھنے بیٹھ جاتی تھی اور جب مکمل کر لیتی تھی اطمینان کی سانس لیتی تھی۔

(4) آپ نے پوچھا ہے اپنے علاوہ کن مصنفات کی تحریروں شوق سے پڑھتی ہیں۔ اب تو کچھ عرصے سے میں باقاعدہ ڈائجسٹ پڑھ نہیں پا رہی۔

جب پڑھتی تھی، ان دنوں کی لمبی لسٹ ہے۔ مگر اس میں سب سے اوپر فائزہ افتخار کا نام آتا ہے۔ فائزہ نے ہر موضوع کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے اور کبھی بھی اس کی تحریروں میں یہ تاثر نہیں ملا کہ رائٹر یہ بتانا چاہتا ہے، میرے پاس معلومات کے خزانے ہیں۔ میں فلسفے کے بیان میں ماہر ہوں اور یا میری انگریزی انگریزوں سے بھی برتر ہے۔

رخسانہ نگار بہت ذہین رائٹر ہیں۔

فاخرہ جہیں کو میں بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ نگہت سیما بہت معتبر نام ہے۔

آسیہ رزاقی کا اپنا انداز ہے اور یہ انداز بہت خوب صورت ہے۔

اور اس رائٹر کا ذکر کرنا میں کیسے بھول سکتی ہوں جن کی تحریروں کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا۔ میں ساجدہ حبیب کا ذکر کر رہی ہوں، ان کا انداز سب سے

جدا ہوا کرتا تھا اور دل کو چھو لیتا تھا۔

آج بھی رائٹر یقیناً ”اچھا لکھ رہی ہوں گی مگر ہر دوسری کہانی کے آخر میں باقی آئندہ لکھا دیکھ کر میں

30 مئی 2015

ڈائجسٹ رکھ دیتی ہوں۔ برامت ماننے کا اصل میں میں ڈائجسٹ خود کو ریلیکس کرنے کے لیے اٹھاتی ہوں، باقی آئندہ کا مطلب ہے ایک نئی کوفت جو میں سہنا نہیں چاہتی، بس اسی لیے آج کی نامور رائٹرز بہنوں کی تحریریں نہیں پڑھ سکی۔ اس کے لیے معذرت۔

آمنہ ذریعے

(1) پہلے سوال کا جواب دینے کی خواہش نے باقی جوابات کا بھی پابند کیا ہے۔ کیونکہ میں خود کو مصطفین کی فہرست میں شامل نہیں کرتی۔ ہر لکھنے والا مصنف نہیں کہلاتا اور نہ ہی ہر مصنف کہانی کار ہوتا ہے۔ بہر حال۔۔۔ اپنے والد سے ورثے میں ملنے والی صلاحیت کا اعتراف کرنے کا یہ بہترین موقع ہے جسے میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ (حالانکہ میں مواقع ضائع کرنے کی عادی ہوں)

صلاحیت جو خدا داد کہلاتی ہے، اس کا ذریعہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ وہ چیز جسے ارتقا کہتے ہیں، وہ نسل در نسل کا مرحلہ ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہو گا کہ آسودگی اور نا آسودگی، فہم اور حصول فہم کی آرزو، خوبی اور خوبی کا ادراک۔۔۔ اسے آگے بڑھانا ہے یا پیچھے کی طرف لوٹنا ہے!

بڑھنا، لکھنے سے پہلے کا مرحلہ ہے جسے طے کر کے ہی لکھنے کا عمل ممکن ہوتا ہے اور یوں بھی ”پڑھنے“ کو آفاقی درجہ حاصل ہے۔ (اقرا)

میرے ابو کو مطالعے سے بہت شغف تھا۔ رات کی خاموشی میں، نظر کا چشمہ لگائے، گہرے انہماک سے پڑھتے، عکس۔۔۔ ذہن میں لہراتے ہیں! مجھے پڑھنے کا شوق بالکل نہیں تھا لیکن پھر وہ کیا چیز تھی جو مجھ تک منتقل ہوئی؟

سنجیدگی، احساس، مشاہدہ اور پرکھ کی صلاحیت۔۔۔!

والدین کا لفظ، ماں باپ کی شراکت کو ظاہر کرتا ہے۔ موردِ نیت صرف والد سے ہی مشروط نہیں رہتی۔ جس بطن میں پرورش پا کر انسان مشرف بہ زندگی

قرار پاتا ہے۔ خونوں اور خامیوں کا ایک لامتناہی، ان دیکھا سلسلہ اس سے منسلک ہے۔ دکھائی دینے والا ہر انسان اپنے ماں باپ سے ملنے والی مثبت اور منفی تحریک کا نمائندہ ہے۔

انسان کا شمار ناشکری مخلوق میں ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود شکر کی کوشش ترک نہیں کی جاتی۔۔۔ ان سطور کے ذریعے، اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے (فائدہ اٹھاتے ہوئے) ادارے کی شکر گزار ہوں، جس کی وساطت میرے لیے اس موقع کا ذریعہ بنی۔ کہ میرے پاس اگر کچھ ہے تو وہ میرے ماں باپ کی وجہ سے ہے۔ ان سے منسلک ہونا ہی میرے کسی بھی وصف کے اظہار کی وجہ ہے۔

قناعت اور دیانت کو خمیر میں شامل کرنا بھی مشکل ہے اور الگ کرنا بھی اتنا ہی دشوار، سوانِ خوبیوں کے دور رس اثرات کے فیض کا علم ہو یا نہ ہو، سرچشمہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ زمانے کے بہتے دھارے اور معاشرے کے عام چلن سے الگ چلنا۔۔۔ آسان نہیں اور یہ مشکل پسندی تقدیر نے ہم پر واجب کر رکھی ہے! گو کہ کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اس منفرد راستے پر امی، ابو کے نقش قدم کا شکریہ!

میں ڈائری لکھا کرتی تھی۔ ابو نے اخبار، رسالے مقرر کر رکھے تھے اور نو سال میں ایک دفعہ حکیم سعید صاحب نے بچوں کو ڈائری لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ (راغب ہونے کی صلاحیت بھی قدرتی ہوتی ہے) میں نے اپنی اور پھر سال گزرتے گئے۔ ڈائری عادت بن گئی۔۔۔ جہاں میں وہاں ڈائری۔۔۔ میں اور ڈائری ساتھ ساتھ۔۔۔ بہت عرصہ رہے۔!

شعاع میں لکھنے کا موقع ایک خط نے فراہم کیا اور تب میں نے جانا کہ کچھ بھی ایک دم سے کبھی نہیں ہوا کرتا۔!

پھر میں نے پڑھنا شروع کیا۔۔۔ امتل کے کہنے پر

”سیر دو جہاں“ پر روانہ ہوئی اور اس سفر میں جس صلاحیت کی بدولت میں نے لطف اٹھایا۔۔۔ وہی مجھے ورثے میں منتقل ہوئی ہے!

کون

ماہنامہ
مئی 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

❖ "بیاد محمود ریاض"

❖ "ماں ناراض ہو جائے تو" شاہین رشید کا "ماں" کے

حوالے سے خصوصی سرورے

❖ اداکارہ "عاصمہ جہانگیر" سے شاہین رشید کی ملاقات

❖ اداکارہ "ماورا" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"

❖ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "لینا شاہ"

❖ اس ماہ "ستارہ آمین کوئل" کے "مقابل ہے آئینہ"

❖ "اک ساگر ہے زندگی" نقیبہ سعید کا ناول اپنے

اختتام کی طرف

❖ "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے دار ناول

❖ "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابرار بچہ کا مکمل ناول

❖ "شام مسکرانے لگی" مریم عزیز کا مکمل ناول

❖ اس ماہ کی خصوصی پیش کش ہے فائزہ افتخار کا ناولٹ "شاید"

❖ "خالا، سالہ اور اوپر والا" فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر

❖ صدق آصف، راشدہ رفعت، عرزہ خالد، آستادہ کنول، نظیر

فاطمہ اور طوبی حسن کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان شمارے کے ساتھ کون کتاب

اجارہ چٹیاں، سلاوا اور رائے کی تراکیب پر مشتمل کرن کتاب

"چٹخارے"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ ملحد سے ملت پیش خدمت ہے

گھر میں پڑھنے والوں کا مطالعہ میری نسبت بہت زیادہ ہے۔ لکھنا البتہ میرے حصے میں آگیا۔

(2) میں چونکہ کہانیاں نہیں لکھتی۔ اس لیے پڑھنے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ گھر میں امی، بھائی، بہن خوش ہوتے ہیں۔ رائے نہیں دیتے! اور کچھ عزیز تعلق 'خوشی' کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی خوشی کا باعث خود کو سمجھ کر خوشی ہوتی ہے۔

(3) لکھنے سے پہلے 'پڑھنے' کے مرحلے سے گزرتے وقت کا لطف 'اس' سلسلے کی بدولت ہے۔ چونکہ مجھے اس پر لکھنا ہوتا ہے 'اس' لیے 'اس' کو سرسری نگاہ سے پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (سرسری مطالعے سے مطلوبہ نتائج نہیں مل سکتے نا) سو مجھے سب ہی کتابیں جن پر میں نے تبصرہ لکھا بے پناہ پسند ہیں۔

(4) خواتین میں 'ایک دفعہ میرا خط منتخب خطوط میں شائع ہوا تھا۔ (لکھنے کے سال بھر بعد) اس میں 'میں' نے تفصیل سے اپنی پسندیدہ لکھاریوں کے نام اور اوصاف گنوائے تھے۔ ان میں سے تاحال صرف تنزیلہ ریاض ہیں جو لکھ رہی ہیں۔ باقی سب نی وی اور مصروفیت کو پیاری ہو چکی ہیں۔

تازہ ترین 'خوش گوار اضافہ' سادگی و پُرکاری کی مثال 'سارہ رضا' ہیں جن کی تحریر میں فطری روانی لطف دیتی ہے!

(5) کیونکہ یہ محبت نہیں ہے جو صحرا کی طرح ساکت ہو اور نہ وہ محبت ہے جو ہوا کی طرح دنیا بھر میں گھومتی پھرے۔ محبت وہ بھی نہیں جو ہر چیز کا دور سے مشاہدہ کرے، جیسا کہ تم کر رہے ہو۔ محبت ایک ایسی طاقت ہے جو تبدیل کرتی اور دنیا کی روح کو برہماتی ہے۔ جب میں پہلی بار اس تک پہنچا تو سوچا کہ دنیا کی روح بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں 'میں' نے دیکھا کہ یہ بھی دوسری تخلیقات جیسی ہے اور اپنے جذبات رکھتی ہے۔ یہ ہم ہیں جو دنیا کی روح کو خوراک فراہم کرتے

ہیں۔ اور وہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ یا تو بہتر ہوگی یا بدتر! اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم خود اچھے یا برے نہیں اور یہ وہی چیز ہے جس سے محبت کی قوت

پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم جب محبت کرتے ہیں تو ہمیشہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے بہتر بنیں جیسے کہ ہیں۔“

(الکیمسٹ سپاؤلو کو نیلو)

عفت سحر طاہر

بہت عرصے بعد امتل نے پھر سے مصنفین کو بھی دوستوں کے ہی ہجوم بیکراں میں لا کھڑا کیا۔ سوالات دیکھ کر بہت پرانی بات یاد کر کے ہنسی آئی۔ یونہی ایک ڈائجسٹ کی طرف سے قارئین کے خطوط مجھے بھیجے گئے (انٹرویو کے لیے) میرے چھوٹے بھائی نے سوالات پڑھے۔ کھانے میں کیا پسند ہے، رنگ، خوشبو کون سی پسند ہے؟

”ہنہ۔۔۔ بڑی آئی ریما، میرا۔“ یہ بھائی کا طنز تھا۔

اب آئیں جوابات کی طرف

(1) گھر کا ماحول سخت بے ادب۔ کسی کو بھی ادب سے لگاؤ نہیں۔ بس ایسے ہی بے ادب ماحول سے ایک ”بادب“ پودا پروان چڑھا جسے آپ عفت سحر طاہر کے نام سے جانتی ہیں۔ لکھنے کا شوق تھا۔ وراثت میں صرف زبان تلی (شاید) باقی سب اللہ کی دین ہے۔ جو چار سیدھی لائیں لکھ لیتی ہوں۔

(2) جی بالکل۔ میری بہنیں اور اب بھانجھیاں بہت شوق سے میری تحریریں پڑھتی ہیں۔ خاص طور پر شہزہ اور فریضہ۔ اور شہزہ کو تو عادت ہے فون پر لمبے لمبے تبصرے کرنے کی۔ میری نند اور جیٹھانی بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں، مگر انہوں نے کبھی تبصرہ نہیں کیا (کیوں بھی؟) خاندان۔۔۔؟ ابو اکلوتے تھے اور امی بھی اپنے والدین کی اکیلی اولاد۔ البتہ فرینڈز اور ان کی فیملی کی خواتین میرے رائٹر ہونے کے حوالے سے بہت محبت اور جوش سے ملتی ہیں۔ بہت تعریف کرتی ہیں۔ (جس کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے) مگر خوشی

اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اس قابل بنایا کہ کوئی تعریف کرے ہماری۔

(3) جی۔۔۔ جب ”دل دریا سمندروں ڈونگھے“ لکھا۔

یا پھر کشمیر کے موضوع پہ ”زنجیر بہاراں“ لکھا۔ تب تب سکون تو کیا ملتا، ہاں رونا بہت آیا۔ اسی طرح خواتین میں ”دست بے طلب میں۔“ از میسٹ سیریز سب قارئین کے ساتھ میرا بھی فیورٹ ہے۔

پھول ”لکھا۔ تو اچھا رسپانس ملا مجھے اپنا ناول

”محبت دل پہ دستک“ بہت سی وجوہات کی بنا پر پسند ہے۔

اور یہ میرے دل کے بہت قریب بھی ہے۔ میرا پہلا طویل ترین قسط وار ناول، جس میں زندگی کی گہرائی تھی، سنجیدگی تھی رو مینس اور بھرپور مزاح تھا۔

(4) میں پانچویں کلاس میں تھی تب سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ تب ہما کو کب بخاری، عنیزہ سید، رفعت سراج، رفعت ناہید سجاد، خالدہ اسد (مرحومہ) اقبال بانو، غزالہ نگار اور کرنی وغیرہ کا طوطی بولتا تھا۔

(جگہ کم پڑ جائے اگر سب پیاری مصنفین کے نام لکھنے پہ آؤں) ان سب کی تحریروں سے محبت تھی اور آج بھی ہے۔ فارحہ ارشد لمبے عرصے کے بعد اب فیس بک پر دکھائی دیں۔ سائہ رضا کے افسانے، سمیرا حمید کی ہر تحریر اور عمیرہ کے لکھے ہوئے (پہلے والے) ناولز پسند ہیں۔ سحر ساجد کی غریق رحمت نے دل کو چھوا۔ عنیزہ جی کو میں آج بھی بہت غور و فکر کے ساتھ پڑھتی ہوں۔

(5) اقتباس تو ڈیڑھروں ڈھیر ہیں جو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتی رہتی تھی (جی ہاں۔۔۔ جب آتش جوان تھا) ”آدی کو اپنے دل کو مارنا ضرور آنا چاہیے۔“ تائبندہ نے یاسیت بھرے افسوس سے کہا۔ ”دل کی خواہشات درحقیقت نفس کا طمع ہوتی ہیں۔ اگر اس وقت میں اپنے دل کو مار لیتی تو آج مجھے اپنی عزت نفس کو نہ مارنا پڑتا۔“ (سبز رتوں کی جھلمل میں عفت سحر طاہر)

باقی بڑے لوگوں اور مصنفین نے تو اتنا کچھ کہا ہے کہ لکھتے لکھتے صفحات بھر جائیں۔ سویار زندہ صحبت باقی۔

آپ سب کی محبتوں کا بہت شکریہ۔ اور تعریف کے لائق صرف اللہ کی ذات۔



عمیرہ احمد

کچھ حقائق

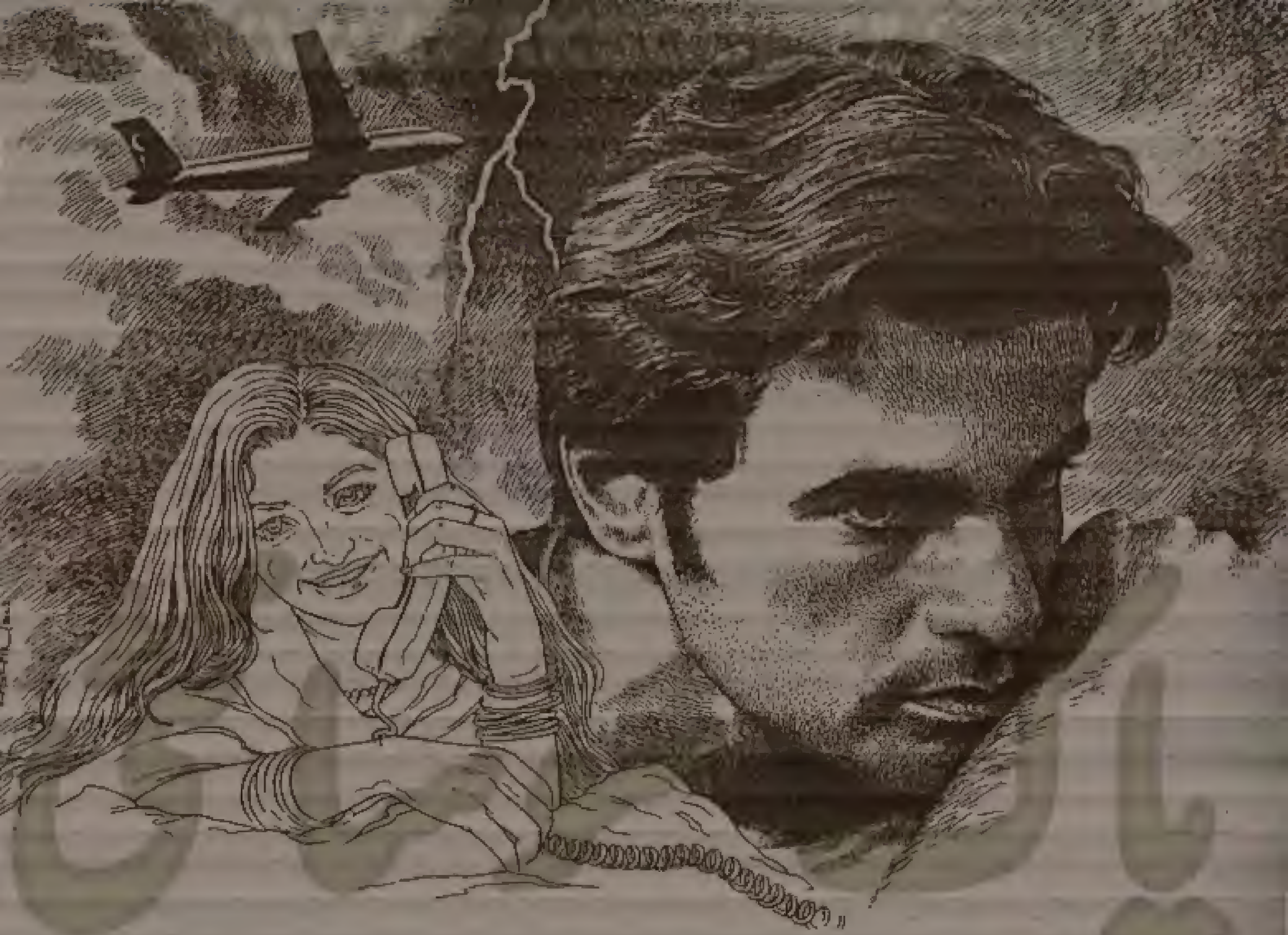
آپ حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے ایمہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیز کو ارنز کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرائل جاتا ہے۔

PAKSOCIETY.COM

پڑھو خواتین ڈائجسٹ 36 مئی 2015



آ۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون اور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ۔ ہنسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست بچے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد ”مطمئن اور ذہین“ بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بد دینا نئی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی اس کا پرتاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ

ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی قیلمی اور اسعفی میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔
8۔ ریڈیٹنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے بخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور محبت تھی۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایر پورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جمیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گہری جمیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے ایئر ٹنٹ کے بیڈروم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکونٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نوچ کر وہ منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکونٹ ہال میں داخل ہو گا۔ وہ ایک

رو فیشنل شوئر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہار کیا گیا ہے۔
3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجوی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے۔ نجوی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدمی حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا رو کھا رویہ محسوس کرتا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے ہی نوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بتا دی تھی۔ سالار امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً روتے ہوئے وہی بتاتی ہے جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو کبھی شکایت ہو کسی اور سے نہ کرنا ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جینز کا سامان لے کر آتا ہے جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھنٹیا رومانوی ٹاویل دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تکف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلو کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کر دیتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایر پورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ مگر بچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

سکندر عثمان سالار کی اسلام آباد آمد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو اس گھر میں آکر شدید ڈپریشن ہوتا ہے۔ وہ نو سال بعد سالار کے گھر سے اپنے گھر کو دیکھتی ہے۔ دو دن رہ کر وہ واپس آ جاتے ہیں۔ امامہ کہتی ہے کہ وہ اسلام آباد میں رہنا چاہتی ہے۔ سالار کی جانب یہاں ہے تو وہ مہینہ میں ایک دفعہ آ جایا کرے۔ اس کی اس بات سے سالار کو دکھ ہوتا ہے پھر جب وہ کہتا ہے کہ اسے امریکہ چلے جانا ہے تو امامہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ یہ تجویز سالار کے لیے شاکنگ ہوئی ہے۔ وہ امامہ سے اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

سالار امامہ کو کراچی لے کر جاتا ہے تو وہ اغیٹا کے گھر جاتی ہے۔ وہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ بھی ایسا شاندار گھر چاہتی ہے جس میں سبزیوں کا فارم، فٹس فارم ہو اور وہ کم از کم ایک ایکٹر کا ہونا چاہیے۔ سالار حیران رہ گیا تھا۔ عید کے موقع پر اس کو میکے کی کچی کا احساس ہوتا ہے۔ سالار کے ساتھ ایک پارٹی میں شراب کی موجودگی پر اس کے دل میں سالار کے لیے

بدگمانی آ جاتی ہے۔ جس کو سالار دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اب ان چیزوں سے بہت دور جا چکا ہے۔ سالار بینک میں کام کرتا ہے۔ امامہ اس سے سود کے مسئلہ پر بھیج کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے سود حرام ہے۔

امامہ سالار کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی سالار کے دل میں قدر تھی، لیکن وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ سالار البتہ جلال کے لیے اس کے دل میں جو نرم گوشہ ہے اس سے ہری طرح ہرٹ ہوتا ہے۔

سالار اپنا پلاسٹک بیج کر تقریباً "ڈیڑھ کروڑ کی انگوٹھی خرید کر دیتا ہے۔ سکندر عثمان کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں۔ "کہاں سے لی یہ رنگ؟"

سالار بتاتا ہے کہ اس نے قیمتی ترین شاپ سے خاص طور پر یہ انگوٹھی ڈیزائن کروائی ہے۔ اور تھوڑی رقم بھی تھی جو اس نے خیراتی اداروں کو دے دی ہے۔ امامہ کو اس انگوٹھی کی قیمت کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔ سالار بھی اسے اصل قیمت نہیں بتاتا۔

امامہ کی ملاقات اتفاقاً "جلال" سے ہوتی ہے۔

جلال اسے لنگ کے لیے لے جاتا ہے۔ وہ یہ جان کر بہت مرعوب ہوتا ہے کہ وہ سالار سکندر کی بیوی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سالار جس عہدے پر ہے۔ وہاں اس نے خوب کمایا ہو گا۔ ریسٹورنٹ میں اچانک فاروق صاحب آ جاتے ہیں۔ جلال کے امامہ کے تعارف کرانے پر وہ چونک جاتے ہیں۔ جلال سے مل کر امامہ بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ اس سے گاڑی بھی نہیں چلائی جاتی۔ وہ سالار کو فون کرتی ہے۔ فون آف ہوتا ہے۔ اس کی جوتی کا اسٹریپ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ تب وہ اس کے آفس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ سالار کو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا کریڈٹ کارڈ بھی شاپنگ سینٹر میں بھول آئی ہے۔ وہ سالار کے آفس کے ہاتھ روم میں جا کر فریش ہوتی ہے اور اپنی قیمتی انگوٹھی وہاں بھول آتی ہے۔ اسے بعد میں بھی وہ انگوٹھی یاد نہیں آتی۔

دو دن بعد ایک ڈنر پر فاروق صاحب سالار سے ملتے ہیں جب وہ اپنی بیوی کا تعارف کرانا چاہتا ہے تو وہ کہتے ہیں ڈاکٹر جلال انصر کے ساتھ لنگ کے دوران امامہ سے مل چکے ہیں۔

سالار یہ جان کر امامہ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ ناراضی میں اسے سعیدہ اماں کے ہاں بھجوا دیتا ہے۔

ڈاکٹر سبط علی سالار کو بلاتے ہیں۔ وہ نہیں جاتا تو وہ امامہ سے تعلق ختم کرنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ تب سالار ان کے پاس جاتا ہے اور امامہ سے معافی مانگ کر اسے اپنے گھر لے آتا ہے۔

ایک ہفتہ بعد سالار اسے یاد دلاتا ہے کہ امامہ انگوٹھی کہاں بھول گئی تھی۔ سالار امامہ سے ایک معاہدہ پر دستخط کراتا ہے جس میں اسے سالار سے علیحدگی کی صورت میں بہت سے حقوق حاصل ہوں گے۔

ڈاکٹر سبط علی کا سلوک سالار کے ساتھ بہت روکھا ہو جاتا ہے۔ امامہ کو برا لگتا ہے وہ ان سے کہتی ہے تب ڈاکٹر سبط علی اس کو نصیحت کرتے ہیں عورت کو اپنا گھر کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

امامہ سالار کے ساتھ کھانا کھانے ریستورنٹ میں جاتی ہے۔ ایک ویٹر سالار کو ایک چٹ لاکر دیتا ہے ”آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔“ سالار جانے لگتا ہے، لیکن تب ہی امامہ کے باپ اور بھائی وہاں آ جاتے ہیں۔ وہ سالار پر حملہ کرتے ہیں۔

ساتویں قسط

سالار نے اپنا دفاع کرتے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے ہاشم مبین کو ذرا سا پیچھے دھکیلا۔ ان کے لیے یہ دھکا کافی ثابت ہوا۔ وہ پیر چھپکنے پر بے اختیار نیچے گرے۔ ریسپشن تب تک باہر موجود سیکورٹی کو انفارم کر چکا تھا۔ ہال میں دو سری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کچھ متوحش انداز میں یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جبکہ میزوں پر سرود کرتے ہوئے ویٹرز بے حد برق رفتاری سے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دھکے نے عظیم کو بھی یک دم مشتعل کر دیا۔ وہ بھی بلند آواز میں اسے گالیاں دیتے ہوئے جوش میں آگے آیا اور بے حد غیر متوقع انداز میں اس نے سالار کے جڑے پر گھونسا دے مارا۔ چند لمحوں کے لیے سالار کی آنکھوں کے سامنے واقعی اندھیرا چھا گیا، وہ اس گھونسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ذرا سا ایک طرف جھکا اور عظیم اس کے پیچھے کھڑی امامہ تک جا پہنچا۔ اس نے کانپتے ہوئے سالار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی، لیکن عظیم نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے نہ صرف سالار سے الگ کرنے کی کوشش کی، بلکہ اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کیا۔ سالار تب تک سنبھل کر سیدھا ہوتے ہوئے اسے چھڑانے کے لیے پلٹا تھا۔ جب اس کے بائیں کندھے کی پشت پر درد کی تیز لہر اٹھی۔ اس نے ہونٹ بھیج کر اپنی چیخ رو کی۔ وہ ہاشم مبین تھے جنہوں نے نیبل پر بڑا چاقو اس کی پشت میں مارنے کی کوشش کی، لیکن آخری لمحے میں ہٹنے کی وجہ سے وہ اس کے بائیں کندھے میں جا لگا تھا۔

سیکورٹی اور دو سرے ویٹرز تب تک قریب پہنچ چکے تھے۔ سالار نے اپنے کندھے کی پشت سے وہ چاقو نکال لیا۔ سیکورٹی والے اب ان تینوں کو پکڑ چکے تھے۔ وہ چاقو نوک دار ہوتا تو زخم بے حد خطرناک ہوتا، لیکن اب بھی اس چاقو کا اگلا سرا اس کے کندھے کے گوشت میں دھنسا ہوا تھا۔ امامہ نے نہ تو ہاشم مبین کو سالار کو وہ چاقو مارتے دیکھا تھا، نہ ہی اس نے سالار کو وہ چاقو نکالتے دیکھا۔ سیکورٹی والوں نے سالار کو عظیم سے چھڑاتے ہوئے، عظیم کو اپنی گرفت میں لے لیا، تب تک سالار اپنی جینز کی جیب سے سیل نکال کر سکندر کو فون پر وہاں آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، لیکن وہ اس کے باوجود اپنے لہجے کو حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے سکندر سے بات کر رہا تھا۔ وہ دو سرے ہاتھ سے اپنی پشت کے اس زخم کو دپائے ہوئے تھا۔ اس کے دبانے اور محسوس کرنے کے باوجود اس کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے کندھے سے کمر تک خون کی نمی محسوس کر رہا تھا، لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خون کتنی مقدار میں نکل رہا تھا۔

سیکورٹی والے اس گفتگو کے دوران ہاشم مبین، وسیم اور عظیم کو وہاں سے لے جا چکے تھے۔ ریستورنٹ کے پورے ہال میں بے حد سراپیسنگی کا عالم تھا۔ کچھ لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تھے اور جوابی وہاں موجود تھے، وہ ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

”آپ کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہوگی، آپ آجائیں۔“ منیجر نے اس کی پشت پر بننے والے خون کو دیکھتے ہوئے کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا۔ اس نے یقیناً ”یہ سوچا ہو گا کہ ہال کا ماحول ان کی موجودگی میں نارمل نہیں ہو سکتا تھا۔“

امامہ نے فیجر کی اس بات پر کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا وہ اب فون پر بات ختم کر رہا تھا۔ امامہ نے اس کے اس ہاتھ کو پہلی بار نوٹس کیا جو وہ کندھے کے اوپر سے پیچھے کیے ہوئے تھا۔
 ”کیا ہوا ہے؟“ امامہ نے قدرے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ سالار نے اپنا بازو سیدھا کیا۔ امامہ نے اس کی خون آلود انگلیاں دیکھیں۔ اس نے سمجھا کہ شاید اس کا ہاتھ زخمی تھا۔

”اے کیا ہوا؟“ اس نے کچھ حواس باختہ ہو کر پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے ایک قریبی ٹیبل سے نمھکن اٹھا کر اپنا ہاتھ صاف کرتے ہوئے امامہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ فیجر اور سکیورٹی کے چند لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ فیجر کے کمرے میں آ گئے۔ وہ پولیس کو کال کر چکا تھا اور اب وہ پولیس کے آنے تک انہیں وہاں روکنا چاہتا تھا لیکن سالار زخمی تھا اور اسے فرسٹ ایڈ دینا ضروری تھی۔
 فیجر کے کمرے میں پہنچ کر ہی امامہ نے پہلی بار سالار کی خون آلود پشت دیکھی اور وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ ایک قریبی کلینک سے پہنچنے والی امبولینس کے آنے تک انہوں نے اس کی شرٹ اتار کر اس کا خون روکنے کی کوشش کی مگر زخم ختم نہ ہوا اور ٹانگوں کے بغیر ٹھیک ہونا مشکل تھا۔
 وہ اس قدر شاکد تھی کہ وہ ریٹورنٹ کے عملے کے افراد کی فرسٹ ایڈ اور سالار کو گم صم دیکھتی رہی۔ وہ کیا کچھ کر سکتی تھی یا اسے کیا کرنا چاہیے تھا اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

اگلے پانچ سات منٹ میں پولیس امبولینس اور سکندر آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔
 سکندر کے آتے ہی سالار نے امامہ کو گھر کے بجائے فوری طور پر کہیں اور بھیجنے کے لیے کہا۔ سکندر خود سالار کو ہاسپٹل لے کر جا رہے تھے۔ چاہنے کے باوجود وہ سالار سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔
 سکندر نے اسے فوری طور پر اپنے بڑے بھائی شاہنواز کے گھر ڈرائیور اور پولیس کی سکیورٹی میں بھجوا دیا تھا۔ شاہنواز کی فیملی گھر پر نہیں تھی۔ غلٹ میں انہوں نے نوکروں کو امامہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور سکندر کی طرف چلے گئے۔

وہ بت کی طرح آکریسٹ روم میں بیٹھ گئی۔ اسے سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ سالار کو کسی نے چاقو سے زخمی کیا تھا یہ اس نے سن لیا تھا مگر یہ اس کے باپ نے کیا تھا یا بھائیوں میں سے کسی نے۔ یہ وہ نہیں جان سکی تھی۔ ریٹورنٹ کی سکیورٹی نے ہاشم، وسیم اور عظیم کو پولیس کے آنے تک ایک کمرے میں بند کر دیا تھا اور اس کے بعد اب آگے کیا ہونے والا تھا اسے سوچتے ہوئے بھی اسے اپنا وجود مفلوج ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے ابھی آئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ سالار کی کال آئی۔

”تم پہنچ گئی ہو؟“ اس نے امامہ کی آواز سنتے ہی کہا۔

”ہاں۔ تم کہاں ہو؟“

”ابھی کلینک پر ہوں۔“ سالار نے اسے کہا۔

”اور ابو۔؟“

”پاپا ساتھ ہیں میرے۔“ سالار نے اس کے لفظوں پر غور نہیں کیا تھا۔

”میں اپنے ابو کا پوچھ رہی ہوں؟“ امامہ نے بے ساختہ کہا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکا۔

اسے ناچاہتے ہوئے بھی اس وقت امامہ کی ہاشم کے بارے میں تشویش برپا ہو گئی۔

”وہ تینوں پولیس کسٹڈی میں ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر اب ہم وہیں جائیں گے۔“ امامہ کا دل ڈوبا۔
باپ اور بھائیوں کے حوالات میں ہونے کے تصور نے چند لمحوں کے لیے اسے سالار کے زخمی ہونے کے بارے میں بالکل لا پرواہ کر دیا۔

”سالار! پلیز! تمہیں معاف کر دو اور ریلیز کر دو۔“

سکندر اس وقت اس کے پاس تھے۔ وہ امامہ سے کچھ کہہ نہیں سکا لیکن وہ خفا ہوا تھا۔ وہ اس سے زیادہ اپنی فیملی کے لیے پریشان تھی۔ وہ زخمی تھا لیکن اس نے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اب کیسا ہے اور اس کی بینڈیج ہو گئی یا زخم گہرا تو نہیں تھا؟
”میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔“ اس نے کچھ کہنے کے بجائے فون بند کر دیا تھا۔

کلینک میں اس کے چیک اپ اور بینڈیج میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ خوش قسمتی سے اس کی کسی رگ یا شریان کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

کلینک میں ہی سکندر کی فیملی کے افراد نے پہنچنا شروع کر دیا اور سالار کو سکندر کے اشتعال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ بہت سنجیدہ نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ خود بے حد ناراض ہونے کے باوجود اس معاملے کو ختم کرنے کا خواہش مند تھا لیکن سکندر نہیں۔

شاہنواز کی بیوی اور دونوں بہنیں آدھے گھنٹے کے بعد گھر آئی تھیں اور تب تک طیبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ سکندر نے فی الحال اپنے گھر میں نہ رہنا بہتر سمجھا تھا۔

شاہنواز کی بیوی اور بہنوں نے اگرچہ امامہ سے اس ایشیو پر زیادہ بات نہیں کی تھی، لیکن وہ لاؤنچ میں طیبہ اور ان لوگوں کی بلند آواز میں ہونے والی باتیں سنتی رہی۔ طیبہ بری طرح براہم تھیں۔ وہ شاہنواز کے گھر آنے کے باوجود امامہ کے پاس نہیں آئیں۔ وہ خود بھی اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ باہر نکل کر ان کا سامنا کرتی۔ وہ بے حد غصے میں ہاشم مبین اور اس کے بھائیوں کو برا بھلا کہتی رہیں اور وہ گیسٹ روم میں بیٹھی ہچکیوں سے روتے ہوئے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ یہ طیبہ کے کڑوے کسیلے جملے یا خاندان کے سامنے ہونے والی سبکی نہیں تھی یہ احساس تھا کہ ہاشم اور اس کے بھائی اس وقت حوالات میں بند تھے اور نجانے ان کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی فیملی بے حد بار سونخ تھی اور حوالات میں کوئی ان کے ساتھ عام مجرم کی طرح کاروبار نہیں رکھ سکتا تھا مگر وہ جانتی تھی اس کی فیملی کا حوالات میں رہنا ہی بے حد بے عزتی کا باعث ہے۔

اس نے دوبار سالار سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلی بار اس کی کال نہیں لی اور دوسری بار اس کا سیل بند تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس نے اسی کی کال سے بچنے کے لیے فون بند کیا ہو گا۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے اپنا سیل فون اس کی وجہ سے آف کیا ہوا تھا۔

”کیوں persue (پیروی) نہ کروں اس کیس کو۔؟ انہیں چھوڑ دوں ماکہ اگلی بار وہ تمہیں شوٹ کر دیں۔“
اس نے ہسپتال سے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے گاڑی میں سکندر سے کہا تھا۔ ”میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔“

”بات بڑھ چکی ہے اور اس سب کی ابتدا بھی انہوں نے کی ہے۔“ سکندر بے حد مشتعل تھے۔

”یاما! وہ امامہ کی فیملی ہے۔“ اس نے بالا خر کہا۔

”تمہیں وہ امامہ کی فیملی تھی؟ انہیں اگر امامہ کی پروا ہوتی تو وہ اس کے شوہر پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتے اور اگر انہیں امامہ کی پروا نہیں ہے تو امامہ کو بھی ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“

انہوں نے بین السطور کیا کہا تھا، سالار کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔
 ”یہ ایک حد تھی جو میں سمجھ نہیں چاہتا تھا کہ وہ پار کریں، لیکن انہوں نے یہ حد پار کر لی ہے۔ میری فیملی میں
 سے کسی کو تکلیف پہنچے گی تو میں ہاشم فیملی کو کسی سیف ہیون میں نہیں رہنے دوں گا۔
 I'll pay them in the same coin .

(میں انہیں ان بھلائی زبان میں جواب دوں گا)
 یہ بات تم اپنی بیوی کو بتا بھی دو اور سمجھا بھی دو۔“
 ”پاپا! پلیز اس ایٹو کو حل ہونا چاہیے۔“ سالار نے باپ سے کہا۔
 سکندر کا۔۔۔ مشتعل رویہ اسے خائف کرنے لگا تھا۔ وہ بے حد متحمل مزاج تھے لیکن اس وقت سالار ان کا
 ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔

”یہ خواہش ان کو کرنی چاہیے۔ صرف تب یہ مسئلہ حل ہوگا۔

How dare he touch my son
 (اے میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی ہمت بھی کیسے ہوئی) اس کا خیال ہے میں برواشت کروں گا یہ غنڈہ گردی۔۔۔
 اب وہ مجھے پولیس اسٹیشن سے نکل کر دکھائے۔“
 انہیں ٹھنڈا کرنے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ معاملہ کس حد تک بڑھ جائے گا اس کا اندازہ سالار
 کو نہیں تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں جہاں اس کی فیملی پولیس اسٹیشن میں آگئی تھی وہاں ہاشم مبین کی بھی پوری فیملی
 وہاں موجود تھی۔

یہ صرف دو بار سوخ فہلیز کا مسئلہ نہیں رہا تھا، یہ کیونٹھیز کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اسلام آباد پولیس کے تمام اعلیٰ
 افسران اس معاملے کو حل کرانے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہاشم مبین کو سب سے بڑی مشکل اس ریسٹورنٹ کی
 انتظامیہ کی وجہ سے ہو رہی تھی جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ یہ سب کہیں اور ہوتا تو وہ بھی جواباً ”سالار اور اس کی
 فیملی کے خلاف دس بارہ ایف آئی آر رجسٹر کروا چکے ہوتے، لیکن ہال میں لگے سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ ہاشم
 مبین کو ایک لمبے عرصے کے لیے جیل میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔

ابتدائی غصے اور اشتعال کے دورے کے بعد بالا آخر ہاشم فیملی نے واقعے کی سنگینی کو محسوس کرنا شروع کر دیا، مگر
 مسئلہ یہ ہو رہا تھا کہ سکندر فیملی کسی قسم کی چلک دکھانے پر تیار نہیں تھی۔
 فجر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا اور وہ بالا آخر گھر واپس آ گئے۔

وہ واپسی پر سارے راستے سکندر کو کیس واپس لینے پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اس میں ناکام رہا تھا۔
 سکندر اب اس معاملے میں اپنے بھائیوں کو شامل کرنے کے بعد سب کچھ اتنے آرام سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں
 تھے۔

وہ شاہنواز کے گھر آنے سے پہلے اپنے گھر سے اپنے اور امامہ کے کچھ کپڑے لے آیا تھا۔ شاہنواز کے گھر
 گیسٹ روم میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے پوچھا تھا۔

”ابو اور بھائی ریلیز ہو گئے؟“ اس کا دماغ گھوم گیا تھا تو واحد چیز جس کی اسے پروا تھی وہ صرف اتنی تھی کہ اس
 کے باپ اور بھائی رہا ہو جائیں۔ اس کا زخم کیسا تھا؟ اس کی طبیعت ٹھیک تھی؟ اسے ان میں سے جیسے کسی بات
 میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔

”نہیں۔ اور ہوں گے بھی نہیں۔“ وہ بے حد خفگی سے کہتے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں

گیا تھا۔ چن کر لینے کے باوجود اس وقت تک جا کے رہنے کی وجہ سے اس کی حالت واقعی خراب تھی اور رہی
سہی کسر امامہ کی عدم توجہی نے پوری کر دی تھی۔

”وہ پولیس اسٹیشن میں ہیں؟“ اس کے دانش روم سے نکلتے ہی اس نے سرخ سوچی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس
سے پوچھا تھا۔ وہ جواب دے بغیر بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔
وہ اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”کیس واپس لے لو سالار۔ انہیں معاف کرو۔“ اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ملتی جلتی انداز میں
اس سے کہا۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔

”امامہ! میں اس وقت سونا چاہتا ہوں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”میرے ابو کی کتنی عزت ہے شہر میں وہ وہاں کیسے ہوں گے اور کیسے برداشت کر رہے ہوں گے یہ سب کچھ
۔۔۔ وہ رونے لگی تھی۔“

”عزت صرف تمہارے ابو کی ہے؟ میری، میرے باپ، میری فیملی کی کوئی عزت نہیں ہے؟“

وہ بے ساختہ کہہ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے ہونٹ کاٹتے ہوئے روتی رہی۔

”یہ سب میرا قصور ہے، میری وجہ سے ہوا ہے یہ سب کچھ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“
”تمہارے پاس ہر چیز کی وجہ صرف شادی ہے۔ تم مجھ سے شادی کر کے جہنم میں آگئی ہو، شادی نہ ہوئی ہوتی تو
جنت میں ہوتیں تم؟ ہے نا۔“ وہ بری طرح برہم ہوا تھا۔

”میں تمہیں تو الزام نہیں دے رہی میں تو۔۔۔“ اس نے خائف ہوتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”Show me some loyalty Imama“

(کچھ میرے ساتھ بھی وفاداری کا مظاہرہ کرو)۔ ویسی وفاداری جیسی تم اپنے باپ اور بھائیوں کے لیے دکھا رہی
ہو۔“ وہ بول نہیں سکی تھی۔ اس نے جیسے اسے جو تا کھینچ مارا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ
اسے کبھی اتنی ہرٹ کرنے والی بات کہہ سکتا تھا لیکن وہ اسے کہہ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ کے بغیر اس کے بستر سے اٹھ
گئی۔ سالار نے اس کو روکنے کے بجائے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

دوبارہ اس کی آنکھ دوپہر ساڑھے بارہ بجے کندھے میں ہونے والی تکلیف کی وجہ سے کھلی تھی۔ اسے ٹیسر پچر بھی
ہو رہا تھا۔ کندھے کو حرکت دینا مشکل ہو رہا تھا اور بستر سے اٹھتے ہی اس کی نظر امامہ پر پڑی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی
ہوئی تھی۔ وہ ر کے بغیر اٹھ کر دانش روم میں چلا گیا۔

نہا کرتا رہنے کے بعد وہ باہر نکلا اور امامہ سے کوئی بات کیے بغیر وہ بیڈ روم سے چلا گیا۔ اسے اپنا آپ وہاں
اجنبی لگنے لگا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس کی سپورٹ تھا اور وہ بھی اس سے برگشتہ ہو رہا تھا۔
”میں کیس واپس لے رہا ہوں۔“ سچ ٹیبل پر بیٹھے اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ پورے ٹیبل پر
ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہاں سکندر کے ساتھ ساتھ شاہنواز اور ان کی فیملی بھی تھی۔

”میں نے اس پورے معاملے کے بارے میں سوچا ہے اور۔۔۔“

طیبہ نے بے حد تلخی سے اس کی بات کالی تھی۔

”تم سوچنا کب کا چھوڑ چکے ہو، یہ تمہاری بیوی کی پڑھائی ہوئی پٹی ہوگی۔“

”ممی! امامہ کو اس پوری equation میں سے نکال دیں۔“

”اچھا۔ تو پھر تم اسے طلاق دے دو، یہ سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے گا۔“

ماں کا چہرہ بھرا ہوا تھا اس نے ہاتھ میں پکڑا کاٹنا رکھ دیا۔

یہ میں نہیں کر سکتا اور یہ میں بھی نہیں کروں گا۔

تو پھر ہم بھی وہ نہیں کریں گے جو تم چاہتے ہو۔ امامہ کا باپ اور بھائی جیل میں ہی رہیں گے۔ طیبہ نے بھی کے انداز میں کہا۔

تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ سارا معاملہ کتنا بڑھ چکا ہے۔ کیس واپس لینے کا مطلب ان کو شہ رستا ہے۔ تم فیملی کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ شاہنواز نے مداخلت کی۔

رہے تو کیس چلنے کی صورت میں بھی ہوگا، بلکہ زیادہ ہوگا۔ یہ کیس تو مسئلہ حل نہیں کرے گا۔

وہ جانتا تھا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس سے پوری فیملی کی کتنی لعنت طامت اسے ملنے والی تھی۔ وہ سب کچھ اس لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ امامہ کو خوش کر سکتا تھا یا اپنی فیملی کو اور اپنی فیملی کو ناخوش کرنا اس کے لیے بہتر تھا۔

وہ اندر کمرے میں بیٹھی باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی لیکن اب وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے وہ سمجھ رہا ہی نہیں تھا۔ ملازم بالا حرا سے کھانے کے لیے پوچھنے آیا اور وہ شدید بھوک کے باوجود نہیں گئی۔ وہ بیچ فیمیل پر

نے کی اس وقت صحت ہی نہیں رکھتی تھی اس سے بھوکا مرنا زیادہ بہتر تھا۔

وہ رات کے نو بجے تک اسی طرح کمرے میں بیٹھی رہی۔ سالار کا کوئی اتاپتا نہیں تھا۔ کوئی کال، کوئی مسیج۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھکن کے عالم میں کب سو گئی اسے اندازہ نہیں ہوا۔

رات گئے اس کی آنکھ سالار کے کندھا ہلانے پر کھلی تھی۔ وہ ہڑبکا گئی تھی۔

”اٹھ جاؤ، ہمیں جانا ہے۔“ وہ کمرے سے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی اپنی آنکھیں رگڑتی رہی۔

”کیس واپس لے لیا ہے میں نے تمہاری فیملی ریلیز ہو گئی ہے۔“ وہ جھکی تھی۔

وہ بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔ کسی نے جیسے امامہ کے کندھوں سے منوں بوجھ ہٹایا تھا۔ اس کے چہرے پر آنے والا طمینان وہ بھی نوٹس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

اس کے پیچھے باہر لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے ماحول میں موجود تناؤ اور کشیدگی محسوس کی تھی۔ شاہنواز اور سکندر دونوں بے حد سنجیدہ تھے اور طیبہ کے ہاتھ پر شکنیں تھیں۔ وہ ندس ہوئی تھی۔ وہاں سے رخصت ہوتے

تے اس نے صرف اپنے لیے نہیں شاہنواز کے رویے میں سالار کے لیے بھی سرد مہری محسوس کی تھی۔ وہ سالار کے ساتھ جس گاڑی میں تھی اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ سکندر اور طیبہ دوسری گاڑی میں تھے۔ سالار

راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھنے کے باوجود اسے مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی سب کی خاموشی اور سرد مہری ویسی ہی تھی۔ سالار، سکندر اور طیبہ کے ساتھ لاؤنج میں گیا اور وہ کمرے میں چلی آئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد ملازم اسے کھانے پر بلانے آیا تھا۔

”تم مجھے یہیں پر کھانا دے دو۔“ بھوک اس قدر شدید تھی کہ اس بار وہ کھانے سے انکار نہیں کر سکی۔ ملازم کی

یادداشت بعد ہی ہو گئی تھی۔

”سالار صاحب کہہ رہے ہیں آپ باہر سب کے ساتھ آکر کھانا کھائیں۔“

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی یہ بلاوا کچھ غیر متوقع تھا۔ فیمیل پر سکندر، طیبہ اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بیٹھ کر

کھانا کھانا اس وقت بہت مشکل تھا۔ وہ کھانا اندر لانے کے لیے نہ کہہ چکی ہوتی تو اس وقت بھوک نہ ہونے کا بہانا کر دیتی لیکن اب یہ مشکل تھا۔

ہمت کرتے ہوئے جب وہ بالا خرواٹنگ روم میں آئی تو سب ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کامران کی بیوی زوبا طیبہ سے کچھ بات کر رہی تھی اس کی آمد پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا۔ صرف سالار اپنی پلیٹ میں کچھ ڈالے بغیر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے پر اسی نے اس سے پوچھتے ہوئے چاول کی ڈش اس کی طرف برعکاس کی تھی اور پھر کھانے کے دوران وہ بغیر پوچھے کچھ نہ کچھ اس کی طرف برعکاس کیا۔ وہ ٹیبل پر ہونے والی بات چیت خاموشی سے سنتی رہی اور شکر ادا کرتی رہی کہ وہ اس سے متعلقہ نہیں تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا ثواب اس لیے زیر بحث نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے ہی اس حوالے سے ان سب کی لعنت و ملامت سمیٹ چکا تھا۔

ماحول آہستہ آہستہ نارمل ہو رہا تھا۔ طوفان گزرنے کے بعد اب اس کے اثرات بھی معدوم ہونے لگے تھے۔ وہ کھانے کے بعد بیڈ روم میں سالار کے ساتھ ہی آئی۔ وہ ایک بار پھر بات چیت کے بغیر بیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ اندھیرے میں کچھ دیر بستر پر بیٹھی رہی پھر اس نے جیسے مصالحت کی پہلی کوشش کی۔

”سالار! آنکھیں بند کیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا جواب دے یا نہ دے۔“

”سالار!“

”بولو۔“ بالاسخر اس نے کہا۔

”زخم گہرا تو نہیں تھا؟“ نرم آواز سے اس نے پوچھا۔

”کون سا والا؟“ ٹھنڈے کبجے میں کیا ہوا سوال اسے لا جواب کر گیا تھا۔

”تمہیں درد تو نہیں ہو رہا؟“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوال بدلا تھا۔

”اگر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا زخم ہے۔ میرا درد ہے۔“

اب جواب نے اسے لا جواب کیا تھا۔

”بخار ہو رہا ہے تمہیں کیا؟“ اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹ کر پیشانی پر گیا تھا۔ بات بدلنے کے لیے وہ اور کیا

کرتی۔ اس کا ہاتھ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے سالار نے اسی ہاتھ سے سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔

”امامہ! تم وہ کیوں نہیں پوچھتیں جو پوچھنا چاہتی ہو۔“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے کہا تھا۔ وہ

چند لمحوں کے لیے اسے کچھ بے بسی سے دیکھتی رہی پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”ابو سے کیا بات ہوئی تمہاری؟“

”وہ بتاؤں جو میں نے ان سے کہا یا وہ جو انہوں نے مجھ سے؟“ انداز اب بھی ٹیکھا تھا۔

”انہوں نے کیا کہا تم سے؟“ اس نے جواب میں ہاشم مبین کی گالیوں کو بے حد ہلٹ انداز میں انگلیں میں

ٹرانسلیٹ کیا تھا۔ امامہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں گالیوں کا نہیں پوچھ رہی انہوں نے ویسے کیا کہا تھا تم سے؟“

اس نے کچھ خفگی اور سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”اوہ! سوری ان کی گفتگو میں ستر فیصد گالیاں تھیں اگر میں بہت مختصر بھی کروں تو بھی کتنا ایڈٹ کر سکتا ہوں۔“

بہر حال باقی باتوں میں انہوں نے مجھے کہا کہ میں سو رہوں لیکن کتے کی موت مروں گا اور جو کچھ میں نے ان کی بیٹی

کے ساتھ کیا ہے وہ میری بیٹی اور بہن کے ساتھ ہو۔ اس کے لیے وہ خصوصی طور پر دعایا بددعا فرمائیں گے۔

تمہارے لیے بھی ان کے کچھ پیغام ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں کہ میں تمہیں دوں۔ یہ بھی ان کی گفتگو۔“

وہ نم آنکھوں کے ساتھ گنگ بیھی اس کا چہرہ دھلتی رہی۔
 وہ اپ سیٹ تھا اس کا اندازہ لگانا آسان تھا لیکن وہ کتنا ہرٹ ہوا تھا یہ بتانا مشکل تھا۔
 ”انہوں نے تم سے ایک سکمز نہیں کی؟“ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا تھا۔
 ”کی تھی انہوں نے؟“ نہیں بڑا افسوس تھا کہ ان کے پاس اس وقت کوئی ہینڈل کیوں نہیں تھا یا کوئی اچھا والا چاقو،
 کیونکہ وہ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر بے حد ناخوش تھے۔ ”اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔“

”پھر تم نے کیس کیوں ختم کیا؟“
 ”تمہارے لیے کیا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی تھی۔
 ”میں تم سے اور تمہاری فیملی سے کتنی شرمندہ ہوں، میں نہیں بتا سکتی تمہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ مجھے
 مار دیتے۔“

”میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ”نہیں، لیکن تم مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہے کوئی بھی نہیں کر رہا۔“
 ”میں کل رات سے خوار ہو رہا ہوں، پریشان تھا۔ مجھے تو تم رہنے دو، مجھے تم سے اس حوالے سے کوئی شکایت
 نہیں ہے، لیکن جہاں تک میری فیملی کا تعلق ہے تو تھوڑا بہت توری ایکٹ کریں گے۔“

وہ That's but natural۔۔۔ (یہ فطری بات ہے) کا چار ہفتے گزریں گے، سب ٹھیک ہو جائیں گے۔“
 اس نے رسائی سے کہا تھا۔

امامہ نے بھگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
 ”میری کوئی عزت نہیں کرتا۔“

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ کسی نے تم سے کچھ کہا؟ پاپا نے؟ می نے یا کسی اور
 نے؟“

”کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن۔“

سالار نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں تم سے، جس دن کوئی تم سے کچھ کہے، تم
 تب کہنا کہ تمہاری کوئی عزت نہیں کرتا۔“ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔
 ”میں تمہیں ابھی اپنے باپ کے گھر میں بھی لے کر نہ آتا اگر مجھے یہ خدشہ ہو تا کہ یہاں تمہیں عزت نہیں
 ملے گی۔ تم سے شادی جیسے بھی ہوئی ہے، ہم میری بیوی ہو اور ہمارے سرکل میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے یہ پتا نہیں
 ہے۔ اب یہ روٹا دھوتا بند کرو۔“

اس نے قدرے جھڑکنے والے انداز میں اس سے کہا۔

”ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ ہے۔ سو جاؤ اب۔“ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے ڈیڑھ دن میں جان لیا تھا کہ وہ دنیا میں کتنی محفوظ
 اور غیر محفوظ تھی۔ اس کے پاؤں کے نیچے زمین اس کے وجود کی وجہ سے تھی۔ اس کے سر پر سایہ دینے والا آسمان
 بھی اسی کی وجہ سے تھا۔ اس کا نام اس کے نام سے ہٹ جاتا تو دنیا میں کوئی اور اس کے لیے کھڑا ہونے والا نہیں
 تھا۔

زندگی میں اس سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود، وہ ہمیشہ اس کی مدد اور سہارے کے لیے محتاج رہی تھی اور
 اس تعلق کے بعد یہ محتاجی بہت بڑھ گئی تھی۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی تھی یہ پرواہ کیے

48 مئی 2015ء

بغیر کہ اس کے سر رکھنے سے اس کے کندھے میں تکلیف ہو سکتی ہے۔ وہ جانتی تھی وہ اسے کبھی نہیں ہٹائے گا اور سالار نے اسے نہیں ہٹایا تھا۔ بازو اس کے گرد جامل کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے لائٹ آف کر دی۔

”ممی ٹھیک کہتی ہیں۔“ اس کے سینے پر سر رکھے اس نے سالار کو بڑبڑاتے سنا۔

”کیا؟“ وہ چونکی تھی۔

”تم نے مجھ پر جادو کیا ہوا ہے۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔



اس واقعے کے بعد اگلے چند ہفتے وہ لاہور میں بھی کچھ محتاط رہے، لیکن آہستہ آہستہ جیسے ہرڈر خوف ختم ہونے لگا۔ امامہ کی فیملی کی طرف سے اس بار اس طرح کی دھمکیاں بھی نہیں ملی تھیں، جیسی امامہ کے گھر سے چلے جانے پر سکندر کی فیملی کو ملتی رہی تھیں۔ فوری اشتعال میں آکر ہاشم اور ان کے بیٹے ان پر حملہ کرنے کی غلطی تو کر بیٹھے تھے، لیکن بہت جلد ہی انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ امامہ کو زبردستی واپس لے جانا اب ان کے مسائل کو برہا سکتا تھا، کم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جھوٹ جو امامہ کے حوالے سے انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں بول رکھے تھے، ان کے کھل جانے کا مطلب رسوائی اور جگ ہنسائی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ ایک پروہ پڑا ہوا تھا، اسے پڑا رہنے دینا زیادہ سمجھ داری تھی۔ ان کا واسطہ سکندر جیسی فیملی سے نہ پڑتا تو وہ اس معاملے پر اپنی انا کو اتنا نیچے نہ لاتے، لیکن یہاں اب مجبوری تھی۔

پولیس اسٹیشن میں تصفیہ کے دوران سکندر نے ہاشم مبین کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ سالار اور امامہ کو کسی بھی طرح پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری وہ ہاشم کے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے پر نہیں ڈالیں گے۔ عام حالات میں ہاشم اس بات پر مشتعل ہوتے لیکن ایک رات حوالات سے نکلنے کے لیے ہر طرح کے اثر و رسوخ استعمال کر کے ناکام ہونے کے بعد ان کا جوش ہوش میں تبدیل ہونے لگا تھا۔

جہاں تک سالار اور امامہ کا تعلق تھا، ان کے لیے یہ سب کچھ blessing in disguise تھا۔ (شر میں سے خیر کوہ خدشات جن کا شکار وہ اسلام آباد میں قیام کے دوران ہوتے تھے وہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے تھے اور یہ خاص طور پر امامہ کے لیے معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اتنی آزادی کے ساتھ رہ سکے گی۔

سالار نے ٹھیک کہا تھا۔ چند ہفتوں میں اس کی فیملی کا رویہ پھر پہلے جیسا ہی ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ طیبہ کی تلخی بھی ختم ہو گئی تھی اور اس میں زیادہ ہاتھ امامہ کا ہی تھا۔ وہ فطریاًًً صلح جو اور فرمانبردار بھی رہی سہی کسر اس کے حالات نے پوری کر دی تھی۔ پیچھے میکہ ہوتا تو شاید کوئی بات بری لگنے پر وہ بھی اسی طرح موڈ آف کرتی جس طرح سکندر کی دوسری بہو میں کبھی گتھار کرتی تھیں، مگر پیچھے پیچھے کے سوا کچھ نہیں تھا اور احسان مند ہونے کے لیے اتنا بھی بہت تھا کہ وہ اس شخص کی فیملی تھی جو اسے سر پر اٹھائے پھرتا تھا۔



”کوئی دسیم ہاشم صاحب ملنا چاہ رہے ہیں آپ سے؟“ اپنے آفس کی کرسی میں جھولتا سالار کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

”کہاں سے آئے ہیں؟“ اس نے ایک لمحہ میں اپنے کانٹیکٹس کی لسٹ کھنگالی تھی اور وہاں صرف ایک وسیم ہاشم تھا۔

”اسلام آباد سے۔ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے دوست ہیں۔“ ریسپشنسٹ نے مزید بتایا۔
 ”بھیج دو۔“ اس نے انٹرکام رکھ دیا اور خود سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آج کے دن وہ ایسے کسی وزٹ کے لیے تیار نہیں تھا۔ وسیم کے وہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو چند ہفتے گزر چکے تھے۔

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تب ہی وسیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں ساکت ہوئے تھے پھر سالار نے ہاتھ پر بھایا۔ وسیم نے بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان دونوں کے درمیان ہونے والی وہ پہلی ملاقات تھی۔
 ”کیا لوگ؟ چائے کافی؟“ سالار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔ میں صرف چند منٹ کے لیے آیا ہوں۔“ وسیم نے جواباً کہا۔ وہ دونوں کسی زمانے میں بہت گہرے دوست تھے لیکن اس وقت ان کو اپنے درمیان موجود تکلف کی دیوار کو ختم کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔
 سالار نے دوبارہ کچھ پوچھنے کے بجائے انٹرکام اٹھا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔
 ”امامہ کیسی ہے؟“ اس کے ریسپورر کہتے ہی وسیم نے پوچھا۔

”شئی از فائن۔“ سالار نے نارمل انداز میں جواب دیا۔
 ”میں اس سے ملنا چاہتا تھا ایڈریس تھا میرے پاس تمہارے گھر کا لیکن میں نے سوچا پہلے تم سے پوچھ لوں۔“ وسیم نے بے حد حثا نے والے انداز میں کہا۔

”ظاہر ہے تمہیں یہ پتا چل سکتا ہے کہ میں کہاں کام کر رہا ہوں تو ہوم ایڈریس جاننا زیادہ مشکل تو نہیں ہے۔“ سالار نے بے حد معمول کے لہجے میں اس سے کہا۔
 ”میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔“ وسیم نے کہا۔

”مناسب تو شاید نہ لگے لیکن پھر بھی پوچھوں گا تم سے۔ کس لیے۔“ سالار نے جواباً بڑے فرینک انداز میں کہا۔

”کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس۔“ وسیم نے جواباً کہا۔ ”اس دن ریسٹورنٹ میں جو چیٹ۔“
 ”وہ تم نے بھیجی تھی میں جاننا ہوں۔“ سالار نے اس کی بات کاٹی تھی وسیم ایک لمحہ کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے کہا۔

”تم نے اور امامہ نے جو کچھ کیا وہ بہت غلط کیا۔“ وسیم چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولنے لگا تھا۔ سالار نے اس کی گفتگو میں مداخلت نہیں کی تھی۔

”لیکن اسے جو بھی ہوا وہ ہو چکا۔ میں امامہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”تمہاری قبیلی کو بتا ہے؟“ سالار نے پوچھا۔

”نہیں، نہیں بتا چلے گا تو وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔“ سالار اس کا چہرہ دکھتا رہا۔ وہ اس کا بچ اور جھوٹ نہیں جانچ سکتا تھا۔ اس کی نیت کیا تھی۔ وہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اور امامہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات وسیم نے اسے امامہ کے ساتھ دیکھ کر اسے باپ

بھائی کے دیکھے جانے سے پہلے متنبہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سالار کے لیے پھر بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اسے امامہ سے ملنے کی اجازت دے دیتا۔ اس میل جول کا پتا چلنے پر امامہ کی فیملی کے لیے اسے نقصان پہنچانا بہت آسان ہو جاتا۔ وہ اگر اس کے ابارٹمنٹ تک پہنچ سکتے تھے تو وہاں سے امامہ کو کہیں اور لے جانا بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ وسیم کسی غلط ارادے سے اس کے پاس نہیں آیا تھا لیکن وہ پھر بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

”وسیم! میں نہیں سمجھتا کہ اب اس کا کوئی فائدہ ہے۔“ اس نے بالآخر بہت صاف الفاظ میں اس سے کہا۔ ”امامہ میرے ساتھ خوش ہے۔ اپنی زندگی میں سہمٹا ہے۔ میں نہیں چاہتا وہ اپ سیٹ ہو یا اسے کوئی نقصان پہنچے۔“

”میں نہ تو اس کو اپ سیٹ کرنا چاہتا ہوں نہ ہی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں بس کبھی کبھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وسیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کچھ بے تابی سے کہا۔

”میں اس پر سوچوں گا وسیم! لیکن یہ بڑا مشکل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں استعمال کر کے کوئی۔ وسیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں بھی نہیں چاہتا کہ اس کو کوئی نقصان پہنچے۔ ایسی کوئی خواہش ہوتی تو اتنے سالوں میں تم سے پہلے رابطہ کرتا۔ میں جانتا تھا وہ تم سے شادی کر کے گھر سے گئی ہے۔ تم انوالوڈ تھے پورے معاملے میں لیکن میں نے اپنی فیملی کو کبھی یہ نہیں بتایا۔“

سالار ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے کہا۔ ”وہ اتنے عرصے سے میرے ساتھ نہیں تھی۔“

”نہیں ہوگی۔ لیکن وہ تم سے شادی کر کے گئی تھی۔ یہ میں جانتا تھا۔“ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ان کے دوستوں کا سرکل تقریباً ایک ہی تھا اور اس میں اگر کسی نے امامہ اور اس کی شادی کے حوالے سے کچھ حقیقی اطلاعات وسیم کو دے دی تھیں تو یہ کوئی اتنی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

”میں سوچوں گا وسیم!“ سالار نے بحث کرنے کے بجائے پھر وہی جملہ دہرایا وسیم ہا یوس ہوا تھا۔

”میں دو دن کے لیے ہوں لاہور میں۔ اور یہ میرا کارڈ ہے۔ میں اس سے واقعی ملنا چاہتا ہوں۔“ وسیم نے مزید کچھ کہے بغیر جیب سے ایک کارڈ نکال کر ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس رات وہ خلاف معمول کچھ زیادہ خاموش تھا۔ یہ امامہ نے نوٹس کیا تھا لیکن اسے وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح آفس میں کام کے پریشور کو ذمہ دار گردانا تھا۔

وہ کھانے کے بعد کام کرنے کے لیے معمول کے مطابق اسٹڈی میں جانے کے بجائے اس کے پاس لاؤنج کے صوفہ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا پھر وہ بھی ٹی وی دیکھنے لگا۔

پانچ دس منٹ کی خاموشی کے بعد امامہ نے بالآخر ایک گہرا سانس لے کر اسے کہتے سنا۔

”امامہ! اگر تم وعدہ کرو کہ تم خاموشی سے تحمل سے میری بات سنو گی۔ آنسو بہائے بغیر۔ تو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”کیا کہنا ہے؟“ وہ کچھ حیران تھی۔

”وسیم تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ اس نے بلا تمہید کہا۔ وہ مل نہیں سکی۔

”وسیم۔ میرا بھائی؟“ امامہ نے بالآخر کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ سالار نے سر ہلایا پھر وہ اسے اپنی

اور اس کی آج کی ملاقات کی تفصیلات بتانے لگا تھا۔ اور ان تفصیلات کے دوران ”برسات“ شروع ہو چکی تھی۔

سالار نے بے حد تحمل کا مظاہرہ کیا۔ تحمل کے علاوہ وہ اور کس چیز کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔
 ”تم نے کیوں اسے یہاں آنے نہیں دیا؟ تم اسے ساتھ لے کر آتے۔“ اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتے ہوئے گفتگو کے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹی۔
 ”مجھے پتا تھا، وسیم مجھے معاف کر دے گا۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی مس کرتا ہو گا جتنا میں اسے کرتی ہوں۔ میں تم سے کہتی تھی نا کہ وہ۔“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”جذبائی ہونے کی ضرورت نہیں ہے امامہ! میں نہیں جانتا، وہ کیوں ملنا چاہتا ہے تم سے۔ لیکن اس کے تمہارے ساتھ ملنے کے بڑے نقصان وہ نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔“ سالار اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا تھا۔ وہ وسیم کے حوالے سے واقعی کچھ خدشات کا شکار تھا۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے پتا ہے، کچھ نہیں ہو گا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ تم اسے فون کر کے ابھی بلا لو۔“
 ”میں کل اسے بلاؤں گا لیکن وہ اگر کبھی اکیلے یہاں آنا چاہے یا تمہیں کہیں بلائے تو تم نہیں جاؤ گی۔“ سالار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اور میں ایک بار پھر دہرا رہا ہوں۔ نہ وہ یہاں اکیلا آئے گا نہ تم اس کے فون کرنے پر کہیں جاؤ گی۔“ سالار نے بڑی سختی سے اسے تاکید کی تھی۔

”میں اس کے بلائے پر کہیں نہیں جاؤں گی لیکن اس کے یہاں آنے پر کیوں اعتراض ہے تمہیں؟“ اس نے احتجاج کیا۔

”وہ میرے گھر پر ہوتے ہوئے آئے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن وہ اکیلا یہاں نہ آئے۔ وہ تو خیر میں نیچے سیکورٹی والوں کو بھی بتا دوں گا۔“

”وہ میرا بھائی ہے سالار!“ امامہ کو بے عزتی محسوس ہوئی۔
 ”جانتا ہوں، اسی لیے تم سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے حوالے سے اس پر یا کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔“
 ”لیکن۔“

”تم مجھے صرف یہ بتاؤ تمہیں اس سے ملنا ہے یا نہیں۔ اگر تمہیں بحث کرنی ہے اس ایشوپر۔ تو بہتر ہے وسیم آئے ہی نہ۔“ سالار نے اسے جملہ کھل نہیں کرنے دیا۔
 ”ٹھیک ہے۔ میں اسے اکیلے نہیں بلاؤں گی یہاں۔“ اس نے آنکھیں رگڑے ہوئے فوراً ”سے پشتر گھٹنے ٹیکے تھے۔“

”مجھے اس سے فون پر بات کرنی ہے۔“ سالار نے کچھ کہنے کے بجائے وسیم کا وزٹنگ کارڈ لا کر اسے دے دیا۔
 وہ خود اسٹڈی میں چلا گیا تھا۔

چند پارنیل ہونے پر وسیم نے فون اٹھایا تھا اور اس کی آواز سننے پر امامہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔
 ”ہیلو۔ میں امامہ ہوں۔“

وسیم دوسری طرف کچھ دیر بول نہیں سکا تھا اور پھر جب بولنے کے قابل ہوا تب تک اس کی آواز بھی بھرانے لگی تھی۔ وہ دو گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے رہے تھے، بے ہنگم، بے ربط۔ بے مقصد۔ خاموشی کے لمبے وقفوں والی گفتگو۔ لیکن اس گفتگو میں کوئی گلے شکوے نہیں ہوئے تھے، کوئی ملامت، مذمت نہیں ہوئی تھی۔ وقت اب اتنا آگے آگیا تھا کہ یہ سب کہنا بے کار تھا۔ وسیم شادی کر چکا تھا اور اس کے تین بچے تھے۔ فیملی میں اور بھی بہت سے افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ بڑے آنسوؤں کے ساتھ اضافے کی تفصیلات سنتی رہی۔

سالار دو گھنٹے کے بعد اسٹڈی سے نکلا تھا اور وہ اس وقت بھی لاؤنج میں فون کان سے لگائے سرخ آنکھوں اور ٹاک کے ساتھ فون پر وسیم سے گفتگو میں مصروف تھی۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر بیڈ روم میں گیا تھا اور اسے یقین تھا امامہ نے اسے ایک بار بھی سراٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹنے کے بعد بھی بہت دیر تک اس نئی ڈیولپمنٹ (development) کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ ٹھیک ہو رہا تھا یا غلط۔ وہ امامہ کا کوئی دو سرا بھائی ہوتا تو وہ کبھی امامہ سے اس کا رابطہ نہ کرواتا لیکن وسیم کے حوالے سے وہ تحفظات رکھنے کے باوجود کسی حد تک کچھ نرم گوشہ رکھنے پر مجبور تھا۔ اگر اس کی فیملی کا ایک فرد بھی اس کے ساتھ کچھ رابطہ رکھتا تو وہ جانتا تھا کہ امامہ ذہنی طور پر بہت بستر محسوس کرے گی۔ اپنے پیچھے اپنی فیملی کی عدم موجودگی کا جو احساس کمتری وہ لیے ہوئے تھی وہ اتنے مہینوں کے بعد کم از کم سالار سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ فجر کی نماز کے لیے جب وہ مسجد جانے کے لیے اٹھا تو وہ اس وقت بھی بستر میں نہیں تھی۔ لاؤنج میں آتے ہی وہ کچھ دیر کے لیے مل نہیں سکا تھا۔ وہاں کا انٹیریر راتوں رات بدل گیا تھا۔ فرنیچر کے بہت سے چھوٹے موٹے آئینوں کی سیٹنگ تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ دیواروں پر کچھ نئی آرٹسٹک اشیا بھی آگئی تھیں۔ صوفہ اور فلور کشنز کے کور بدلے جاتے تھے اور کارپٹ پر چند نئے رگز (Rugs) بھی نظر آ رہے تھے اور وہ اس وقت کچن ایریا کے کاؤنٹر کے پار ایک اسٹول پر چڑھی کچن کیبنٹ کو اسفنج کے ساتھ رگڑنے میں مصروف تھی۔

”تم ساری رات یہ کرتی رہی ہو؟“ سالار پانی پینے کے لیے کچن میں گیا تھا تو اس نے کچن کے فرش کو کیبنٹ سے نکالی گئی چیزوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کا دل غمگین ہو کر رہ گیا تھا۔

”کیا؟“ وہ اسی اطمینان سے کام میں مصروف ہوئی تھی۔

”تمہیں پتا ہے کیا کرتی رہی ہو تم؟“ سالار نے پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے کاؤنٹر پر رکھا اور باہر نکل گیا۔

”یہ بھائی دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت واپس آیا تھا۔

”امامہ! آج سنڈے ہے اور میں ابھی مسجد سے آکر سوؤں گا۔ خبردار تم نے بیڈ روم کی صفائی اس وقت شروع کی۔“

”پھر میں کس وقت صفائی کروں گی۔ بیڈ روم کی۔ میں نے وسیم کو لنچ پر بلوایا ہے۔“ امامہ نے پلٹ کر کہا۔

سالار کی چھٹی حس نے بروقت کام کیا تھا۔

”بیڈ روم کی صفائی کا وسیم کے کچ سے کیا تعلق ہے؟“ وہ حیران ہوا تھا۔ ”تم نے اسے بیڈ روم میں بٹھانا ہے؟“

”نہیں لیکن۔“ وہ انکی تھی۔

”امامہ! بیڈ روم میں کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے سونا ہے آکر ابھی۔“ اس نے امامہ کو ایک بار پھر یاد دہانی کرائی تھی۔

”یہ سامان لاؤنجانے مجھے سونے سے پہلے کھانے کی تیاری کرنی ہے مجھے۔“ امامہ نے کاؤنٹر پر پڑی ایک لسٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”میں فجر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں اور یہ سامان تمہیں سو کر اٹھنے کے بعد لا کر دوں گا۔“ وہ لسٹ کو ہاتھ لگائے بغیر چلا گیا تھا۔

تمام خدشات کے باوجود اپسی پر اس نے اپنے بیڈ روم کو اسی حالت میں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ اس نے دس بجے اس کی مطلوبہ اشیا لا کر دی تھیں۔ کچن تب تک کسی ہوٹل کے کچن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ وہ پتا نہیں کون کون سی ڈشز بنانے میں مصروف تھی۔ وہ کم از کم 25 افراد کا کھانا تھا جو وہ اپنے بھائی کے لیے

تیار کر رہی تھی۔ اور سالار کو یقین تھا کہ آدمے سے زیادہ کھانا انہیں بلڈنگ کے مختلف پارٹمنٹس میں بھیجا دے گا۔ لیکن امامہ اتنے جوش اور لگن سے ملازمہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھی کہ سالار نے اسے کوئی نصیحت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا انگلش لیگ کا کوئی میچ دیکھتا رہا۔

وسیم دبے آہٹا اور دبے تک امامہ کو گھر میں کسی ”مرد“ کی موجودگی کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ کھانا تیار کرتے ہوئے اس سے اپنی فیملی کی باتوں میں مصروف تھی اس تازہ ترین اپ ڈیٹ کے ساتھ جو اسے رات کو وسیم سے ملی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے ملازمہ کے ساتھ اتنے جوش و جذبہ سے بات کرتے ہوئے سنا تھا اور وہ حیران تھا۔ حیرانگی اس کیفیت کو اتنے موثر طریقے سے بیان نہیں کر پائی۔

وسیم کا استقبال اس نے سالار سے بھی پہلے دروازے پر کیا تھا۔ بسن اور بھائی کے درمیان ایک جذباتی سین ہوا تھا۔ بسن میں سالار نے دونوں سے تسلی کے چند الفاظ کہہ کر کچھ کر دار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد ساڑھے چھ بجے وسیم کی موجودگی تک وہ ایک خاموش تماشائی کا رول ادا کرتا رہا تھا۔ وہ کھانے کی ٹیبل پر موجود ضرور تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وہاں ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ امامہ کو بھائی کے علاوہ کوئی اور نظر آ رہا تھا نہ کسی اور کا ہوش تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ٹیبل پر موجود ہر ڈش اپنے ہاتھوں سے وسیم کو کھلائے۔ اتنے مہینوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ امامہ نے کھانے کی ٹیبل پر اسے کچھ سرو نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا بچپن کا دوست تھا لیکن یہ بھی پہلا موقع تھا کہ وہاں اس کے ہوتے ہوئے بھی وسیم اور اس کے درمیان صرف چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر وہ امامہ آپس میں گفتگو کرتے رہے تھے۔

سالار نے اس دوپہر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے زندگی میں پہلی بار کسی مہمان کی موجودگی میں ٹی وی پر کھانا کھاتے ہوئے انگلش لیگ دیکھی۔ اور ٹیبل پر موجود دوسرے دونوں افراد اپنی باتوں میں مصروف رہے۔

ساڑھے چھ بجے اس کے جانے کے بعد سالار کی توقع کے مطابق بچا ہوا تقریباً ”سارا کھانا ملازمہ“ فرقان اور چند دوسرے گھروں میں بھیجا گیا۔

وہ عشا کی نماز پڑھ کر آیا تو وہ اس کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا کر خود بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ وہ ایک اینڈر رات کا کھانا ہمیشہ باہر کھاتے تھے اور نہ بھی کھاتے تب بھی باہر ضرور جاتے تھے۔

اس نے پہلی بار امامہ کی گھر پر موجودگی کے باوجود اکیلے ڈنر کیا اور وہ بری طرح ہچھکتا تھا وسیم کو امامہ سے ملنے کی اجازت دے کر۔



”امامہ! یہ وسیم نامہ بند ہو سکتا ہے اب۔“ وہ تیسرا دن تھا جب ڈنر پر بالآخر سالار کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ تین دنوں سے مسلسل ناشتے ڈنر اور رات سونے سے پہلے صرف وسیم کی باتیں بار بار سن رہا تھا۔ امامہ بری طرح وسیم پر مذاق کرتی یہ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ وسیم سے ملنے کے بعد خوش ہوئی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی خوشی اس انتہا کو پہنچے گی کہ خود اسے مسئلہ ہونا شروع ہو جائے گا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”مطلب یہ کہ دنیا میں وسیم کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جن کی تمہیں پروا نہ کرنی چاہیے۔“ سالار نے اسے ان ڈائریکٹ انداز میں کہا۔

”مثلاً کون؟“ اس نے جواباً ”اتنی سنجیدگی سے پوچھا تھا کہ وہ کچھ بول نہیں سکا۔“

”اور کون ہے جس کی مجھے پروا کرنی چاہیے؟“ وہ اب بڑبڑاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تم گھر پر توجہ دو اب!“

وہ اب اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ ”مجھ“ پر توجہ دو۔

”گھر کو کیا ہوا؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔ وہ اس بار مزید کوئی تاویل نہیں دے سکا تھا۔ گھر کو واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔

”تمہیں میرا وسیم کے بارے میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا؟“ اس نے یک دم جیسے کوئی اندازہ لگایا اور اس کے لہجہ میں ایسی بے یقینی تھی کہ وہ ”ہاں“ نہیں کہہ سکا۔

”میں نے کب کہا کہ مجھے برا لگتا ہے۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں تمہیں۔“ وہ بے ساختہ بات بدل گیا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہی تھی تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو وہ تمہارا ہیسٹ فرینڈ ہے۔“ وہ یک دم مطمئن ہوئی۔

سالار اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ اس کا ہیسٹ فرینڈ ہے نہیں کبھی تھا۔

”تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا وہ۔“

سالار گھانا کھاتے کھاتے رکا۔ ”میرے بارے میں کیا۔؟“

”سب کچھ۔“ وہ اسی روانی سے بولی۔

سالار کے پیٹ میں گرہیں سی پڑیں ”سب کچھ کیا؟“

”مطلب جو بھی تم کرتے تھے۔“

سالار کی بھوک اڑی تھی۔

”مثلاً۔؟“ وہ پتا نہیں اپنے کن خدشات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑی۔

”جیسے تم جن سے ڈر کر لیتے تھے ان کے بارے میں۔ اور جب تم لاہور میں اپنے کچھ دو سرے دوستوں کے

ساتھ ریڈ لائٹ اریا گئے تھے تو تب بھی۔“

وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ پانی پیتے ہوئے سالار کو اچھونکا تھا۔

”تمہیں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں۔“ سالار خود بھی اپنا سوال پورا نہیں دہرا سکا۔

”جب بھی جاتے تھے تو بتاتا تھا۔“

سالار کے منہ سے بے اختیار وسیم کے لیے زیر لب گالی نکلی تھی اور امامہ نے اس کے ہونٹوں کی حرکت کو پڑھا

تھا۔ وہ بری طرح اپ سیٹ ہوئی۔

”تم نے اسے گالی دی ہے؟“ اس نے جیسے شاکد ہو کر سالار سے کہا۔

”ہاں وہ سامنے ہوتا تو میں اس کی دو چار ہڈیاں بھی تو ڈرتا۔ وہ اپنی بہن سے یہ باتیں جا کر کرتا تھا۔ اور میری

باتیں۔“

I can't imagine (میں تصور بھی نہیں کر سکتا) وہ واقعی بری طرح برہم ہوا تھا۔ ”سب کچھ“ کی دو جھلکیوں

نے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ امامہ اس کے بارے میں کیا کچھ جانتی تھی اس کا صحیح اندازہ اسے

آج ہوا تھا کیونکہ وسیم اس کے بے حد بے تکلف اور قریبی دوستوں میں سے تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ

اپنے دوستوں کے کرتوت اپنی چھوٹی بہن کو جا کر بتا سکتا تھا۔

”تم میرے بھائی کو دوبارہ گالی مست دینا۔“

امامہ کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔ سالار جواباً ”کچھ کہنے کے بجائے بے حد خفگی

سے کھانے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔

یہ اس کی زندگی کے کچھ بے حد پریشان کن لمحوں میں سے ایک تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ امامہ کو اس

کی کسی بات پر یقین کرنا یا اسے اچھا سمجھنا کیوں اتنا مشکل تھا۔ وہ اس کی کیس، ہسٹری کو اتنا تفصیلی اور اتنا قریب

سے نہ جانتی ہوتی تو اسے اپنی شادی شدہ زندگی میں ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہوتا جن کا سامنا وہ اب کر رہا تھا۔

وہ تقریباً دو گھنٹے کے بعد بیڈ روم میں سونے کے لیے آئی تھی۔ وہ اس وقت معمول کے مطابق اپنی ای میلز چیک کرنے میں مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈ پر آکر کبیل خود پر کھینچتے ہوئے لیٹ گئی تھی۔ سالار نے ای میل چیک کرتے گردن موڑ کر اسے دیکھا اسے اسی رد عمل کی توقع تھی۔ وہ روز سونے سے پہلے کوئی ناول پڑھتی تھی اور کتاب پڑھنے کے دوران اس سے باتیں بھی کرتی تھی۔ یہ خاموشی اس دن ہوتی تھی جس دن وہ اس سے خفا ہوتی تھی۔ اس نے اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ بھی آف کر لیا تھا۔

”میں نے وسیم کو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم اس طرح ناراض ہو کر بیٹھو۔“

سالار نے مفاہمت کی کوششوں کا آغاز کیا۔ وہ اسی طرح کروٹ دوسری طرف لیے بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

”امامہ! تم سے بات کر رہا ہوں میں۔“ سالار نے کبیل کھینچا تھا۔

”تم اپنے چھوٹے بھائی عمار کو وہی گالی دے کر دکھاؤ۔“ اس کے تیسری بار کبیل کھینچنے پر وہ بے حد خفگی سے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔

سالار نے بلا توقف وہی گالی عمار کو دی۔ چند لمحوں کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔ اگر دنیا میں ڈھٹائی کی کوئی معراج تھی تو وہ وہ تھا۔

”میں بابا کو بتاؤں گی۔“ امامہ نے بالآخر سرخ چہرے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم نے کہا تھا عمار کو گالی دینے کو۔“ وہ ویسے ہی اطمینان سے بولا تھا۔ ”ویسے تمہارے بھائی کو اس سے زیادہ خراب گالیاں میں اس کے منہ پر دے چکا ہوں اور اس نے کبھی ماسٹڈ نہیں کیا اور اگر تم چاہو تو اگلی بار جب وہ یہاں آئے گا تو میں تمہیں دکھا دوں گا۔“

وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔

”تم وسیم کو یہاں میرے سامنے گالیاں دو گے؟“ اسے بے حد رنج ہوا تھا۔

”جو کچھ اس نے کیا ہے، میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسے گالیاں ہی دیتا اور اس سے زیادہ بری۔“ سالار نے لگی لپٹی کے بغیر کہا۔

”لیکن چلو آئی ایم سوری۔“ وہ اس بار پھر اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔

سکندر عثمان ٹھیک کہتے تھے۔ ان کی وہ اولاد سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔

”لیکن بابا! وہ میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں ٹالتا۔“

اس نے ایک بار سکندر کے پوچھنے پر کہ وہ اس کا خیال رکھتا تھا کہ جواب میں سالار کی تعریف کی تھی۔

”امامہ! یہ جو تمہارا شوہر ہے، یہ دنیا میں اللہ نے صرف ایک پیس پیدا کیا تھا۔ تیس سال میں نے باپ کے طور پر جس طرح اس کے ساتھ گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اب باقی کی زندگی تمہیں گزارنی ہے اس کے ساتھ، یہ تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے اور تمہیں کبھی بتا نہیں چل سکتا۔ اس نے جو کرنا ہوتا ہے، وہ کرنا ہوتا ہے۔ چاہے ساری دنیا ختم ہو جائے اسے سمجھا سمجھا کر اور کبھی اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ یہ تمہاری بات مان کر اپنی مرضی نہیں کرے گا۔“

سالار سر جھکائے مسکراتا باپ کی باتیں سنتا رہا تھا اور وہ کچھ ابھی نظروں سے باری باری اسے اور سکندر کو دیکھتی رہی تھی۔

”آہستہ آہستہ پتا چل جائے گا تمہیں کہ سالار چیز کیا ہے۔ یہ پانی میں آگ لگانے والی گفتگو کا ماہر ہے۔“

سالار نے کسی ایک بات کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا تھا، سکندر کے پاس سے واپسی کے بعد امامہ نے سالار سے کہا۔

”تمہارا امپریشن بہت خراب ہے پاپا پر۔ تمہیں کوئی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔“

”کیسی وضاحت؟ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ تمہیں ان کی باتیں غور سے سننا چاہیے تھیں۔“

وہ تب بھی اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اور وہ اب بھی اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ پھر کہہ رہا تھا۔

”تم شرمندہ تو نہیں ہو۔“ اس نے اسے شرمندہ کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔

”ہاں وہ تو میں نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ تمہیں میرا سوری کہنا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے آئی ایم سوری۔“

اس نے تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ امامہ نے جواب دینے کے بجائے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا پانی کا پورا گلاس پیا اور دوبارہ کبیل کھینچ کر لیٹ گئی۔

”پانی اور لاؤں؟“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ امامہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔



وہ نیند میں سیل فون کی آواز پر ہڑپٹائی تھی۔ وہ سالار کا سیل فون تھا۔

”ہیلو!“ سالار نے نیند میں کروٹ لیتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر کال ریسیو کی۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”ہاں بات کر رہا ہوں۔“ اس نے سالار کو کہتے سنا پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ یک دم بستر سے نکل گیا تھا۔ امامہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے نیم تارکی میں اسے دیکھنے کی کوشش کی، وہ لائٹ آن کیے بغیر اندھیرے میں ہی کمرے سے نکل کر لاؤنج میں چلا گیا تھا۔

وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ وہ کس کا فون ہو سکتا تھا۔ جس کے لیے وہ رات کے اس پہرے اٹھ کر کمرے سے گیا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ کچھ دیر اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی، لیکن جب وہ کافی دیر تک نہیں آیا تو وہ کچھ بے چین سی اٹھ کر کمرے سے لاؤنج میں آئی تھی۔ وہ لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ فون پر بات کرتے کرتے رکا۔

”ایک جینز اور شرٹ پیک کر دو میری۔ مجھے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے ابھی۔“

”کیوں؟ خیریت تو ہے؟“ وہ پریشان ہوئی تھی۔

”اسکول میں آگ لگ گئی ہے۔“

اس کی نیند پلک جھپکتے میں غائب ہوئی تھی۔

سالار اب دوبارہ فون پر بات کر رہا تھا۔ بے حد تشویش کے عالم میں کمرے میں واپس آکر اس نے اس کا بیک تیار کیا وہ تب تک کمرے میں واپس آچکا تھا۔

”آگ کیسے لگی؟“

”یہ تو وہاں جا کر ہوتا چلے گا۔“ وہ بے حد عجلت میں اپنے لیے نکالے ہوئے کپڑے لیتا واش روم میں چلا گیا۔ وہ بیٹھی رہی۔ وہ اس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتی تھی۔

شادی کے شروع کے چند مہینے چھوڑ کر اب اوپر نیچے کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انہیں بری طرح تکلیف پہنچا رہا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دس منٹ میں وہ تیار ہو کر نکل گیا، لیکن وہ دوبارہ بستر میں نہیں جاسکی تھی۔ اس نے باقی کی ساری رات اسی پریشانی میں دعائیں کرتے ہوئے کاٹی تھی۔

سالار سے اس کی ایک دوبار چند منٹ کے لیے بات ہوئی، لیکن وہ فون پر مسلسل مصروف تھا امامہ نے اسے ڈسٹرب کرنے سے گریز کیا۔

اس کے گاؤں پہنچنے کے بعد بھی آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ وجہ بروقت فائر بریگیڈ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔ اور آگ کا اتنے گھنٹوں بعد بھی نہ بجھ پانے کا مطلب کیا تھا وہ امامہ اچھی طرح سے سمجھ سکتی تھی۔

وہ پورا دن جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھر میں پھرتی رہی تھی۔ سالار نے بالآخر اسے آگ پر قابو پانے کی اطلاع دے دی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ اسے رات کو کال کرے گا اور وہ اس رات اسلام آباد ہی میں رہنے والا تھا۔

اس دن وہ سارا دن کچھ کھا نہیں سکی تھی۔ عمارت کو کتنا نقصان پہنچا تھا۔ یہ اسے نہیں پتا تھا لیکن کئی گھنٹے لگی رہنے والی آگ کیا کر سکتی تھی۔ اس کا احساس اسے تھا۔

سالار سے بالآخر آدھی رات کے قریب اس کی بات ہوئی تھی۔ وہ آواز سے اسے اتنا تھاکا ہوا لگ رہا تھا کہ امامہ نے اس سے زیادہ دیر بات کرنے کے بجائے سونے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ لیکن وہ خود ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ آگ عمارت میں لگائی گئی تھی۔ وہاں پولیس کو ابتدائی طور پر ایسے شواہد ملے تھے اور یہ معمولی سی بات امامہ کی نیند اور حواس کو باطل کرنے کے لیے کافی تھی۔

وہ صرف سالار کا اسکول نہیں تھا۔ وہ پورا پروجیکٹ اب ایک ٹرسٹ کے تحت چل رہا تھا جس کی مین ٹرشی سالار کی فیملی تھی۔

اور اس پروجیکٹ کو یکدم اس طرح کا نقصان کون پہنچا سکتا تھا؟

یہی وہ سوال تھا جو اسے ہول رہا تھا۔

سب کچھ پھر جیسے چند ہفتے پہلے والی اسٹیج پر آگیا تھا۔

وہ اگلے دن رات کو گھر پہنچا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے علاوہ دوسرا کوئی تاثر نہیں تھا، وہ اگر کچھ اور دیکھنا

چاہتی تھی تو مایوس ہوئی تھی وہ نارمل تھا اسے جیسے حوصلہ ہوا تھا۔

”بلڈنگ کے اسٹرکچر کو نقصان پہنچا ہے جس کمپنی نے بلڈنگ بنائی ہے۔ وہ کچھ انجینئر کر رہے ہیں۔ اب

دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ شاید بلڈنگ گرا کر دوبارہ بنائی پڑے۔“

کھانے کی ٹیبل پر اس کے پوچھنے پر اس نے امامہ کو بتایا تھا۔

”بہت نقصان ہوا ہو گا؟“ یہ احمقانہ سوال تھا، لیکن امامہ حواس باختہ تھی۔

”ہاں!“ جواب مختصر تھا۔

”اسکول بند ہو گیا؟“ ایک اور احمقانہ سوال۔

”نہیں۔ گاؤں کے چند گھر فوری طور پر خالی کروائے ہیں اور کرائے پر لے کر اسکول کے مختلف بلاکس کو شفٹ

کیا ہے وہاں پر۔ Luckily ابھی کچھ دنوں میں سربریک آجائے گی تو بچوں کا زیادہ نقصان نہیں ہو گا۔“ وہ کھانا

کھاتے ہوئے بتا رہا۔

”اور پولیس نے کیا کہا؟“ ادھر ادھر کے سوال کے بعد امامہ نے بالآخر وہ سوال کیا جو اسے پریشان کیے ہوئے

تھا۔

”ابھی تو انویسٹی گیشن اشارت ہوئی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

سالار نے گول مول بات کی تھی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ دو دن اسلام آباد میں وہ اپنی فیملی کے ہر فرد سے اس کیس کے Suspects (مشتبہ افراد) میں امامہ کی فیملی کو شامل کرنے کے لیے دباؤ کا سامنا کرتا رہا تھا۔ وہ بہت مشکل صورت حال تھی۔ اس پروجیکٹ کو چلانے میں بہت سے لوگوں کے عطیات استعمال ہو رہے تھے اور اس نقصان کے متاثرین بہت سے تھے۔

کئی سال سے آرام سے چلنے والے اس اسکول کا کوئی دشمن پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اب۔۔۔ امامہ سے زیادہ وہ خود یہ دعا کر رہا تھا کہ یہ آگ اتفاقی حادثہ ہو۔۔۔ مگر چند گھنٹوں میں ہی آگ کے اسکیل اور صورت حال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پلان شدہ آتش زدگی تھی اور اگلے چند گھنٹوں میں کچھ اور شواہد بھی مل گئے تھے۔ امامہ سے یہ سب شیر کرنا حماقت تھی۔ وہ پچھلے تجربے کے بعد اس طرح کی کسی دوسری پریشانی میں کم از کم اسے نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

”اب کیا ہو گا؟“ تیسرا احتمالہ سوال۔

”سب کچھ دوبارہ بنانا پڑے گا اور بس۔“ جواب اتنا ہی سادہ تھا۔

”اور فنڈ؟ وہ کہاں سے آئیں گے؟“ یہ پہلا سمجھ دارانہ سوال تھا۔

”endowment fund ہے اسکول کا۔۔۔ اس کو استعمال کریں گے۔ کچھ انویسمنٹ کی ہے میں نے“

وہاں سے رقم نکلاؤں گا۔ وہ اسلام آباد کا پلاٹ بیچ دوں گا۔ فوری طور پر تو تھوڑا بہت کر ہی لوں گا۔ اتنا کہ اسکول کی بلڈنگ دوبارہ کھڑی ہو جائے۔“

”پلاٹس کیوں؟“ وہ بری طرح بدکی تھی۔ امامہ نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ پلاٹس نہیں پلاٹ کر رہا تھا۔

”اس سے فوری طور پر رقم مل جائے گی مجھے۔ بعد میں لے لوں گا“ ابھی تو فوری طور پر اس میس سے نکلنا ہے مجھے۔“

”تم وہ حق مہر کی رقم لے لو“ آٹھ دس لاکھ کے قریب ویڈنگ پر ملنے والی گفت کی رقم بھی ہوگی اور اتنے ہی میرے اکاؤنٹ میں پہلے سے بھی ہوں گے۔ پچاس ساٹھ لاکھ تو یہ ہو جائے گا اور۔۔۔“ سالار نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”یہ میں کبھی نہیں کروں گا۔“

”قرض لے لو مجھ سے۔ بعد میں دے دینا۔“

”تو۔۔۔ اس کا انداز حتمی تھا۔“

”میرے پاس بے کار پڑے ہیں سالار! تمہارے کام آئیں گے تو۔۔۔“ اس نے پھر امامہ کی بات کاٹ دی۔

”I said no (میں نے کہنا نہیں)“ اس نے اس بار کچھ ترشی سے کہا تھا۔

”میرے پیسے اور تمہارے پیسے میں کوئی فرق ہے؟“

”ہاں ہے۔“ اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

”وہ حق مہر اور شادی پر گفت میں ملنے والی رقم ہے۔ میں کیسے لے لوں تم سے۔؟ میں بے شرم ہو سکتا ہوں۔۔۔ بے غیرت نہیں ہو سکتا۔“

”اب تم خواجہ خواجہ جذباتی ہو رہے ہو اور۔۔۔“

سالار نے اس کی بات کاٹی ”کون جذباتی ہو رہا ہے؟ کم از کم میں تو نہیں ہو رہا۔“

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی ”میں تمہیں قرض دے رہی ہوں سالار۔“

”Thank you very much but I don't need“ (بہت شکریہ مگر مجھے اس کی ضرورت

یہ خواتین ڈائجسٹ 60 مئی 2015

نہیں ہے) مجھے قرض لینا ہو گا تو بڑے دوست ہیں میرے پاس۔“
 ”دوستوں سے قرض لو گے بیوی سے نہیں؟“
 ”نہیں۔“

”میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں سالار۔“

”ایموشنلی کرو فنانسلی نہیں۔“

وہ اسے دیکھتی رہ گئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کس طرح قائل کرے۔

”اور اگر میں یہ رقم ڈونیٹ کرنا چاہوں تو۔“ اسے بالآخر ایک خیال آیا۔

”ضرور کرو اس ملک میں بہت سی charities (خیراتی ادارے) ہیں۔ تمہارا پیسہ ہے، چاہے آگ لگا دو۔ لیکن

میں یا میرا ادارہ نہیں لے گا۔“ اس نے صاف لفظوں اور حتمی انداز میں کہا۔

”تم کبھی مجھے کچھ ڈونیٹ کرنے نہیں دو گے؟“

”ضرور کرنا۔ لیکن فی الحال مجھے ضرورت نہیں ہے۔“

وہ نیبل سے اٹھ گیا تھا۔

وہ بے حد اپ سیٹ اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ اس کے لیے وہ دو پلاٹ اس کے گھر کی پہلی دو اینٹیں تھیں اور وہ

پہلی دو اینٹیں اس طرح جانے والی تھیں۔ یہ چیز اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ تکلیف کا باعث وہ احساس جرم

بھی تھا جو وہ اس سارے معاملے میں اپنی فیملی کے انوالو ہونے کی وجہ سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں

اس رقم سے جیسے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی جو اس کی فیملی نے کیا تھا۔ اسے یہ اندازہ

نہیں تھا کہ سالار نے اس کی اس سوچ کو اس سے پہلے بڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آنے والے دنوں میں بھی وہ سالار کو وہ رقم لینے پر مجبور کرتی رہی، لیکن وہ ایک بار بھی یہ جرات نہیں کر سکی تھی

کہ پولیس کی انویسٹی گیشن کے حوالے سے سالار سے کچھ پوچھتی۔ وہ دنوں جانتے بوجھتے اس حساس ایڈیٹر

کونسلور سے اجتناب کر رہے تھے اور یہ امامہ کے لیے ایک نعمت متبرقہ سے کم نہیں تھا۔



”جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں نہ ہی کوئی انوالو منٹ ہے؟“

اس کے سامنے بیٹھا وسیم بڑی سنجیدگی سے اسے لیٹین دلانے کی کوشش کر رہا تھا ”اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا

کہ یہ سب ابو کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی ایسا کچھ نہ کیا ہو میں نے گھر میں ایسا کچھ نہیں سنا۔“

وسیم نے ہاشم مبین کا بھی دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔ وہ سالار کے سامنے اپنی فیملی

کا دفاع کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ وسیم کے سامنے نہیں۔ اسے لیٹین تھا یہ جو بھی کچھ ہوا تھا۔ اس میں اس

کے اپنے باپ کا ہی ہاتھ تھا۔

”ابو سے کہنا یہ سب کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ سالار کو کیا نقصان ہو گا یا مجھے کیا نقصان ہو گا۔ ایک

اسکول ہی جلا ہے پھر بن جائے گا۔ ان سے کہنا وہ کچھ بھی کر لیں ہمیں فرق نہیں پڑتا۔“

وسیم اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے امامہ سے مدھم آواز میں کہا۔

”میں ابو سے یہ سب نہیں کہہ سکتا۔ میں بہت بزدل ہوں تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں۔“

چند لمحوں کے لیے وہ دنوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے جب سے وہ دوبارہ ملنا شروع ہوئے تھے آج پہلی بار

وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سراہ رہا تھا یا اعتراف کر رہا تھا۔

”تمہارے جانے کے بعد اتنے سالوں میں بہت دفعہ کمزور رہا میں بہت دلچسپی کا بھی شکار ہوا اور شک و شبہ کا بھی۔ بہت دلچسپی چاہتا تھا۔ زندگی کے اس غبار کو میں بھی ختم کرنے کی کوشش کروں جس نے میری بیٹائی دھندلائی ہوئی ہے لیکن میں بہت بزدل ہوں۔ تمہاری طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔“

”اب آجاؤ۔“ امامہ کو خود احساس نہیں ہوا اس نے یہ بات اس سے کیوں کہہ دی اور کہنی چاہیے تھی کہ

”اب اور بھی زیادہ مشکل ہے جب اکیلا تھا تو اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو بیوی اور بچے ہیں۔“

”ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ میں اور سالار۔ کچھ بھی نہیں ہو گا تمہیں۔ تمہاری فیملی کو ہم ایک بار کوشش تو کرو۔“

امامہ بھول گئی تھی اس نے وسیم کو کیا ڈسکس کرنے کے لیے بلایا تھا اور وہ کیا ڈسکس کرنے بیٹھ گئی تھی۔

”انسان بہت خود غرض اور بے شرم ہوتا ہے امامہ۔ اسے جو ضرورت ہوتی ہے یہ صحیح اور غلط کی سب تمیز ختم کر دیتی ہے کاش میں زندگی میں مذہب کو پہلی Priority (ترجیح) بنا سکتا۔ مگر مذہب پہلی Priority (ترجیح) نہیں ہے میری۔“

”وسیم نے گہرا سانس لیا تھا جیسے کوئی رنج تھا جس نے بکواس بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

”میں تمہاری طرح فیملی نہیں چھوڑ سکتا مذہب کے لیے۔ تمہاری قربانی بہت بڑی ہے۔“

”تم جانتے ہو جتنے جہنم کا انتخاب کر رہے ہو صرف دنیا کے لیے؟ اپنے بیوی بچوں کو بھی اسی راستے پر لے جاؤ گے کیونکہ تم میں صرف جرات نہیں ہے سچ کوچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہہ دینے کی۔“

وہ اب بھائی کو چیلنج کر رہی تھی۔ وہ یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا یوں جیسے بے قرار تھا۔

”تم مجھے بہت بڑی آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہو؟“

”آزمائش سے بچانا چاہتی ہوں۔ آزمائش تو وہ ہے جس میں تم نے خود کو ڈال رکھا ہے۔“

اس نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھالی۔ ”میں صرف اسی لیے تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔“

وہ کہتے ہوئے اس کے روکنے کے باوجود اپارٹمنٹ سے نکل گیا تھا امامہ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وسیم کو پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھ کر اسے جیسے پھپھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ وسیم سے تعلق توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور وہ اسے اس اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مارتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔



”وسیم میرا فون نہیں اٹھا رہا۔“ امامہ نے اس رات کھانے پر سالار سے کہا تھا۔ سالار کو وہ بہت پریشان لگی تھی۔

”ہو سکتا ہے مصروف ہو۔“ سالار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں وہ ناراض ہے۔“

اس بار سالار چونکا تھا۔ ”ناراض کیوں ہو گا؟“

امامہ نے اسے اپنی اوریو وسیم کی گفتگو سنا دی۔ سالار گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔

”تمہیں ضرورت کیا تھی اس سے اس طرح کی گفتگو کرنے کی۔ بالغ آدمی ہے وہ۔ بزنس کر رہا ہے۔ بیوی بچوں والا ہے۔ اسے اچھی طرح پتا ہے اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے اور اس کے لیے کیا صحیح ہے۔ تم لوگ

آپس میں ملتے رہنا چاہتے ہو تو یہ سب کو ڈسکس کیے بغیر ملو۔ "سالار نے اسے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سمجھایا۔
 "بات اس نے شروع کی تھی وہ نہ کرتا تو میں بھی نہ کرتی۔" امامہ نے جیسے اپنا دفاع کیا۔
 "اور خود بات شروع کرنے کے بعد اب وہ تمہاری فون کال نہیں لے رہا تو بہتر ہے اب تم انتظار کرو سکون سے۔
 جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو کر لے گا وہ تمہیں کال۔"
 سالار کہہ کر دوبارہ کھانا کھانے لگا۔ امامہ اسی طرح بیٹھی رہی۔
 "اب کیا ہوا؟" سالار نے سلاڈ کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے اس کی خاموشی نوٹس کی۔
 "میری خواہش ہے وہ بھی مسلمان ہو جائے اس گمراہی کی دلدل سے نکل آئے۔"
 سالار نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا پھر بڑی سنجیدگی سے اسے کہا۔
 "تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی زندگی ہے اس کا فیصلہ ہے۔ تم اپنی خواہش اس پر
 impose (لاگو) نہیں کر سکتیں۔"

"impose تو کر بھی نہیں رہی میں۔" وہ پلیٹ میں چمچ بے مقصد ہلاتے ہوئے دل گرفتہ ہوئی تھی۔
 "کبھی کبھی دل چاہتا ہے انسان کا وہ چیزوں کو جادو کی طرح ٹھیک کرنے کی کوشش کرے۔" سالار نے اس کی
 دل گرفتگی محسوس کی پھر جیسے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ "زندگی میں جادو نہیں چلتا۔ عقل چلتی ہے یا
 قسمت اس کی عقل کام کرے گی اور قسمت میں لکھا ہو گا تو وہ اپنے لیے کوئی اسٹینڈ لے گا ورنہ میں یا تم کوئی اس
 کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھاتا جا رہا تھا۔
 "اور تم دوبارہ کبھی اس سے اس مسئلے پر خود بات نہیں کرو گی نہ ہی اسکول کے حوالے سے کسی نکلے شکوے
 کے لیے اسے بلاؤ گی۔ میں اپنے مسئلوں کو ہینڈل کر سکتا ہوں اور وہ سیم کچھ نہیں کر سکتا۔"
 وہ کہہ کر کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گیا۔ امامہ اسی طرح خالی پلیٹ لیے بیٹھی رہی تھی۔ ہمتا نہیں زندگی میں اچانک
 اتنی بے سکونی کہاں سے آگئی تھی۔ وہ fairytale (پریوں کی کہانی) جو چند ماہ پہلے سالار کے ساتھ شروع ہوئی
 تھی اور جو اس کے پیروں کو زمین پر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ اب وہ پریوں کی کہانی کیوں نہیں رہی تھی۔ اس میں
 پریشانیوں کا جنگل کیسے اگ آیا تھا۔ یا شاید یہ اس کے ستارے تھے جو ایک بار پھر گردش میں آئے ہوئے تھے۔



اسکول کی بلڈنگ کے اسٹریکچر کو واقعی نقصان پہنچا تھا سب کچھ جیسے square one پر آگیا تھا۔ یہ سالار
 کے لیے حالیہ زندگی کا پہلا بڑا ذاتی مالیاتی نقصان تھا چند گھنٹوں میں سب کچھ راکھ ہو جانے کا مطلب اسے زندگی
 میں پہلی بار سمجھ میں آیا تھا اور اس پر سب سے بدترین بات یہ تھی کہ اس سارے ایشیو میں اس کے سرال کے
 ملوث ہونے پر کم از کم اس کی فیملی میں سے کسی کو شبہ نہیں تھا لیکن اسے ثابت کرنا مشکل نہیں تقریباً ناممکن تھا
 گاؤں کا کوئی فرد ملوث ہوتا تو پولیس ابتدائی تحقیق کے بعد کسی نہ کسی کو ضرور پکڑ لیتی مگر اس آتش زوں میں وہاں
 کے کسی شخص کی انوالومنٹ ظاہر نہیں ہوئی تھی اور جتنے رو فیٹیل طریقے سے ایک ہی وقت میں مختلف کیمیکلز کے
 استعمال سے عمارت کے مختلف حصوں میں وہ آگ لگائی گئی تھی وہ کسی عام چور اچکے کا کام نہیں تھا۔ اگر مقصد
 اسے نقصان پہنچانا تھا تو اسے بے حد نقصان ہوا تھا اگر مقصد اسے چوٹ پہنچانا تھا تو یہ پیٹ پر ضرب لگانے جیسا تھا۔
 وہ ہر اہوا تھا منہ کے بل نہیں گرا تھا۔

"اسے چھوڑ دو سالار!" وہ سرے دیکر اینڈ پر پھر اسلام آباد میں تھا اور طیبہ اس بار جیسے گڑگڑا رہی تھیں۔ وہ
 اس سب سے اس بار مزید خائف ہو گئی تھیں۔

"تمہیں شادی کا شوق تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب چھوڑو اسے۔"

”آپ کو اندازہ ہے کہ آپ مجھے کتنی تکلیف پہنچاتی ہیں جب آپ مجھ سے اس طرح کی بات کرتی ہیں۔“
 سالار نے ان کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔
 ”تم نے دیکھا نہیں انہوں نے کیا کیا ہے؟“
 ”بھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔“ اس نے پھر وہی بات کالی تھی۔
 ”تم عقل کے اندھے ہو سکتے ہو ہم نہیں۔ اور کون ہے دشمن تمہارا امامہ کی فیملی کے سوا؟“ طیبہ برہم ہو گئی تھیں۔

”اس سب میں امامہ کا کیا قصور ہے؟“

”یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی یہ بات؟“
 ”نہیں آتی۔ اور نہیں آئے گی۔ میں نے کل بھی آپ سے کہا تھا آج بھی کہہ رہا ہوں اور آئندہ بھی یہی کہوں گا۔ میں امامہ کو ڈی ورس نہیں کروں گا۔ کم از کم اس وجہ سے تو نہیں کہ اس کی فیملی مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ آپ کو کوئی اور بات کرنی ہے تو میں بیٹھتا ہوں۔ اس البٹو پر مجھے نہ آج نہ ہی دوبارہ بات کرنی ہے۔“
 طیبہ کچھ بول نہیں سکی تھیں۔ وہ وہی کچھ کہہ رہا تھا جو سکندر کی زبانی وہ پہلے سن چکی تھیں، لیکن انہیں ذرا سی خوش فہمی تھی کہ وہ شاید اس بار کسی نہ کسی طرح اس کو اس بات پر تیار کر سکیں جس کے بارے میں سکندر کو کوئی امید نہیں تھی۔ سکندر اس وقت وہاں نہیں تھے۔ وہ آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھنے کے بعد واپس بیڈ روم میں آیا تو امامہ کی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے گاؤں لے کر نہیں گیا تھا، لیکن اسلام آباد میں ویک اینڈ کے بعد اگلے دو دن ہونے والی کانفرنس کی وجہ سے ساتھ ہی لے آیا تھا۔

وہ اپنا لپ ٹاپ نکال کر کچھ کام کرنے لگا تھا کہ اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ جس چینل پر تھی وہاں مسلسل اشتہار چل رہے تھے اور وہ صوفہ پر بیٹھی انہیں بے حد یکسوئی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ عام طور پر مسلسل چینل سرفنگ میں مصروف رہتی تھی۔ اشتہارات کو دیکھنا بے حد حیران کن تھا۔ سالار نے وقتاً فوقتاً دو تین بار اسے اور پی وی کو دیکھا تھا اس نے دس منٹ کے دوران اسے ایک بار بھی ہائے کامک اٹھاتے نہیں دیکھا تھا جو اس کے سامنے ٹیبل پر پڑا تھا اور جس میں سے اب بھاپ اٹھنا بند ہو گئی تھی۔
 اس نے لپ ٹاپ بند کیا اور بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس صوفہ پر آکر بیٹھ گیا۔ امامہ نے مسکرانے کی کوشش

کی۔ سالار نے اس کے ساتھ سے ریموٹ پکڑ کر پی وی آف کر دیا۔

”تم نے میری اور ممی کی باتیں سنی ہیں کیا؟“ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ جن یا جادوگر نہیں تھا، شیطان تھا اور اگر شیطان نہیں تھا تو شیطان کا سینئر منسٹر ضرور تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا بے کار تھا۔ اس نے گردن سیدھی کر لی۔

”ہاں۔ چائے بنانے گئی تھی میں اور تم دونوں ملاؤ بیچ میں بات کر رہے تھے میں نے کچن میں مناسب کچھ۔“
 اس نے سر جھکائے کہا وہ اسے یہ نہیں بتا سکی تھی کہ طیبہ کے مطالبے نے چند لمحوں کے لیے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ آخری چیز جو وہ تصور کر سکتی تھی وہ وہی تھی کہ کوئی سالار سے اسے چھوڑنے کے لیے کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی اتنے صاف الفاظ میں اتنے ہتک آمیز انداز میں۔

”تم جب یہاں آتے ہو تو یہ کہتی ہیں تم سے؟“

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے سالار سے پوچھا جو اسے تسلی دینے کے لیے کچھ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔
 ”نہیں۔ ہر بار نہیں کہتیں۔ کبھی کبھی وہ اور ری ایکٹ کر جاتی ہیں۔“ اس نے ہموار لہجے میں کہا۔
 ”میں اب اسلام آباد کبھی نہیں آؤں گی۔“ اس نے یکدم کہا۔

”لیکن میں تو آؤں گا اور میں آؤں گا تو تمہیں بھی آنا پڑے گا۔“ الفاظ سیدھے تھے لہجہ نہیں۔ اس نے سالار کا چہرہ بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

”تم اپنی ممی کی سائیڈ لے رہے ہو؟“

”ہاں۔ جیسے میں نے ان کے سامنے تمہاری سائیڈ لی۔“

وہ اس کے جواب پر چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

خاموشی کا ایک اور لمبا وقفہ آیا تھا پھر سالار نے کہا۔

”زندگی میں اگر کبھی میرے اور تمہارے درمیان علیحدگی جیسی کوئی چیز ہوئی تو اس کی وجہ میرے پیرٹس یا میری فیملی نہیں بنے گی، کم از کم یہ ضمانت میں تمہیں دیتا ہوں۔“

وہ پھر بھی خاموش رہی تھی۔

”کچھ بولو۔“

”کیا بولوں؟“

”جب تم خاموش ہوتی ہو تو بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔“

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”مجھے لگتا ہے تم پتا نہیں اس بات کو کیسے استعمال کرو گی میرے خلاف۔“

”کبھی“ اس نے جملہ مکمل کرنے کے بعد کچھ توقف سے ایک آخری لفظ کا اضافہ کیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔

لیکن خاموش رہی۔ سالار نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

”تم میری بیوی ہو امامہ۔ وہ میری ماں ہیں۔ میں تمہیں شٹ اپ کہہ سکتا ہوں، انہیں نہیں کہہ سکتا۔ وہ

ایک ماں کی طرح سوچ رہی ہیں اور ماں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں، جب تم ماں بنو گی تو تم بھی اسی طرح ری

ایکٹ کرنے لگو گی۔ انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا، مجھ سے کہا۔ میں نے انکوڑ کر دیا۔ جس چیز کو میں نے انکوڑ کر دیا۔

اسے تم سیرسلی لو گی تو یہ حماقت ہو گی۔“

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ سن رہی تھی جب وہ خاموش ہوا تو اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”میرے لیے سب کچھ کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارے

لیے ایک کے بعد ایک مسئلہ آ جاتا ہے۔ مجھ سے شادی اچھی نہیں ثابت ہوئی تمہارے لیے ابھی سے اتنے

مسئلے ہو رہے ہیں تو پھر بعد میں پتا نہیں۔“

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”شادی ایک دوسرے کی قسمت سے نہیں کی جاتی۔ ایک دوسرے کے وجود سے کی جاتی ہے، اچھے دنوں کے

ساتھ کے لیے لوگ فرینڈ شپ کرتے ہیں شادی نہیں۔“

ہم دونوں کا Present Past Future (حال، ماضی، مستقبل) جو بھی ہے جیسا بھی ہے ایک ساتھ

ہی ہے اب۔ اگر تم کو یہ لگتا ہے کہ میں یہ expect (توقع) کر رہا تھا کہ تم سے شادی کے بعد پہلے میرا پرانز بانڈ

نکلے گا، پھر مجھے کوئی بونس ملے گا پھر میری پروموشن ہو گی۔ اور پھر میں لوگوں کے درمیان بیٹھ کر بڑی خوشی سے یہ

بتاؤں گا کہ میرا لائف میرے لیے بڑی لگی ہے۔ تو سوری مجھے ایسی کوئی expectations (توقعات) نہیں

تھیں جو کچھ ہو رہا ہے وہ untimely (بے وقت) ہو سکتا ہے میرے لیے unexpected (غیر متوقع)

نہیں ہے میں تمہارے لیے کس حد تک جاسکتا ہوں، کتنا سینئر ہوں۔ وہ وقت بتا سکتا ہے اس لیے تم خاموشی سے

وقت کو گزرنے دو۔ یہ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ جاؤ دوبارہ چائے بنا لاؤ۔ پیتے ہیں۔“

65

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کوئی چیز اس کی آنکھوں میں اٹھنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ انسان کو زندگی میں کہاں کہاں سے تحفظ دیتا ہے۔ کہاں کہاں سے دیواریں لا کر کھڑی کر دیتا ہے انسان کے گرد۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کے سائے میں رہتی تھی تو اسے یقین تھا اس سے زیادہ عزت، زیادہ تحفظ کوئی اسے دے ہی نہیں سکتا، کم از کم شادی جیسے رشتے سے وہ ذمہ داری کے علاوہ کسی چیز کی توقع نہیں رکھے ہوئے تھی۔ اب اگر وہ اس شخص کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی تو وہ تحفظ کے نئے مفہوم سے آگاہ ہو رہی تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے امامہ!“ سالار نے اس کے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے اس سے نرمی سے کہا۔ وہ سر ہلاتے اور اپنی ناک رگڑتے ہوئے اٹھ گئی اس کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔



سالار نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا تھا۔ یہ امامہ نہیں جانتی تھی۔ اسکول کی تعمیر دوبارہ کیسے شروع ہوئی تھی اسے یہ بھی نہیں پتا تھا، لیکن اسکول دوبارہ بن رہا تھا، سالار پہلے سے زیادہ مصروف تھا اور اس کی زندگی میں آنے والا ایک اور طوفان کسی تباہی کے بغیر گزر گیا تھا۔



”مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ سالار نے دو ٹوک انکار کرتے ہوئے کہا۔
”لیکن مجھے ہے“ امامہ اصرار کر رہی تھی۔

”یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔“ سالار نے اسے بچوں کی طرح بہلایا۔
”کوئی بات نہیں، ایک بار دکھانے سے کیا ہو گا؟“ اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔
”تم کیا جانتا چاہتی ہو اپنے مستقبل کے بارے میں؟“ مجھ سے پوچھ لو۔“

سالار اسے اس پامسٹ کے پاس لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا جو اس فاسیو اشار ہوٹل کی لابی میں تھا، جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے آئے تھے اور کھانے کے بعد امامہ کو پتا نہیں وہ پامسٹ کہاں سے یاد آگیا تھا۔
”ویری فنی“ اس نے مذاق اڑایا تھا۔ ”اپنے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں میرے کا کیسے ہو گا؟“
”کیوں تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں ہے کیا؟“ سالار نے مسکرا کر اسے بتایا تھا۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں پامسٹ کے پاس چلتے ہیں اس سے پوچھتے ہیں۔“ امامہ کا اصرار بڑھاتا تھا۔
”دیکھو ہمارا“ آج“ ٹھیک ہے کافی ہے۔ تمہیں ”کل“ کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے؟“ وہ اب بھی رضامند نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے ہے کل کا مسئلہ۔“ وہ کچھ جھلا کر بولی تھی اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی فرمائش پر اس طرح کے رد عمل کا اظہار کرے گا۔

”کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو۔ تمہیں پتا ہے میری کونسلرز کو اس نے ان کے فیوچر کے بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا، بھانجھی کی بھی کتنی کنز آئی تھیں اس کے پاس۔“ امامہ اب اسے قائل کرنے کے لیے مثالیں دے رہی تھی۔

”بھابھی آئی تھیں اس کے پاس؟“ سالار نے جواباً ”پوچھا تھا۔“
”نہیں۔“ وہ انکی۔

”تو؟“

”تو یہ کہ ان کو انٹرنسٹ نہیں ہو گا۔ مجھے تو ہے۔ اور تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ یک

دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔
”کس دن؟“ سالار نے جیسے ٹالا۔
”ابھی۔“

وہ بے اختیار ہنسا اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
”پاسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کرتا تھا،
لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ تم دکھا لو ہاتھ۔“
”تم نہیں دکھاؤ گے؟“ اس کے ساتھ لالی کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔
”نہیں۔“ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ میرے بارے میں
بتائے گا وہ پاسٹ۔ وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہو گا۔“ امامہ اب اسے چھیڑ رہی تھی۔
”مثلاً؟“ سالار نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
”مثلاً؟“ اچھی خوش گوار ازدواجی زندگی۔ اگر میری ہوگی تو تمہاری بھی تو ہوگی۔“
”ضروری نہیں ہے۔“ وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

”ہو سکتا ہے شوہر کے طور پر میری زندگی بڑی بری گزرے تمہارے ساتھ۔“
”تو مجھے کیا؟ میری تو اچھی گزر رہی ہوگی۔“ امامہ نے کندھے اچکا کر بے نیازی دکھائی۔
”تم عورتیں بڑی سیلفش (خود غرض) ہوتی ہو۔“ سالار نے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس کے رویے کی مذمت
کی۔

”تو نہ کیا کرو پھر ہم سے شادی۔ نہ کیا کرو ہم سے محبت۔ ہم کون سا مری جا رہی ہوتی ہیں تم مردوں کے
لیے؟“

امامہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔
”ہاں ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم عورتوں پر۔ عزت کی زندگی را اس نہیں آتی شاید اس لیے۔“ وہ چند
لمحوں بعد بڑبڑایا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے ہم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے؟“ امامہ ہمیشہ کی طرح فوراً برا مان گئی
تھی۔

”ہم شاید جزلاً نہ کر رہے تھے۔“ سالار اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑبڑایا۔

”نہیں۔ تم صرف اپنی بات کرو۔“

”تم اگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پاسٹ کے پاس نہیں جاتے۔“ سالار نے بے حد سہولت سے اسے
موضوع سے ہٹایا۔

”نہیں میں کب ناراض ہوں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ امامہ کا موڈ ایک لمحہ میں بدلا تھا۔

”ویسے تم پوچھو گی کیا پاسٹ سے؟“ سالار نے بات کو مزید گھمایا۔

”بڑی چیزیں ہیں۔“ امامہ نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر تب تک وہ پاسٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

کرسی ایک طرف رکھے اس پر بیٹھا وہ بغیر دلچسپی سے اپنی بیوی اور پاسٹ کی ابتدائی گفتگو سنتا رہا، لیکن اسے
امامہ کی دلچسپی اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

پاسٹ اب امامہ کا ہاتھ پکڑے عدسے کی مدد سے اس کی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے گمانا شروع کیا۔

”لکیروں کا علم نہ تو حتمی ہوتا ہے نہ ہی الہامی۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں، بہر حال مقدر رینا تا سنوارنا اور بگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔“

وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا، پھر اس نے جیسے حیرانی سے اس کے ہاتھ پر کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اس کے شوہر کو جو اس وقت اپنے بلیک بیری پر کچھ میسجوز دیکھنے میں مصروف تھا۔

”بڑی حیرانی کی بات ہے۔“ پاسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ امامہ نے کچھ بے تاب ہو کر پاسٹ سے پوچھا۔

”آپ کی یہ پہلی شادی ہے؟“ بلیک بیری پر اپنے میسج چیک کرتے کرتے سالار نے نظر اٹھا کر پاسٹ کو دیکھا، اس کا خیال تھا یہ سوال اس کے لیے تھا، لیکن پاسٹ کا مخاطب اس کی بیوی تھی۔

”ہاں!“ امامہ نے کچھ حیران ہو کر پہلے پاسٹ کو اور پھر اسے دیکھ کر کہا۔

”اوہ اچھا۔“ پاسٹ پھر کسی غور و خوض میں مصروف ہو گیا تھا۔

”آپ کے ہاتھ پر دوسری شادی کی لکیر ہے۔ ایک مضبوط لکیر۔ ایک خوش گوار کامیاب۔ دوسری شادی۔“

پاسٹ نے امامہ کا ہاتھ پکڑے اسے دیکھتے ہوئے جیسے حتمی انداز میں کہا۔ امامہ کا رنگ اڑ گیا تھا اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ برساکت تھا۔

”آپ کو یقین ہے؟“ امامہ کو لگا جیسے پاسٹ نے کچھ غلط پڑھا تھا اس کے ہاتھ پر۔

”جہاں تک میرا علم ہے اس کے مطابق تو آپ کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں اور دوسری لکیر پہلی لکیر کی نسبت زیادہ واضح ہے۔“

پاسٹ اب بھی اس کے ہاتھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سالار نے امامہ کے کسی اگلے سوال سے پہلے جیب سے والٹ اور والٹ سے ایک کرنسی نوٹ نکال کر پاسٹ کے سامنے میز پر رکھا پھر بڑی شائستگی سے کہتے ہوئے

اٹھ کھڑا ہوا۔

”تھینک یو۔ بس اتنی انفارمیشن کافی ہے۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں، ہمیں جانا ہے۔“

اسے اٹھ کر وہاں سے چلتے دیکھ کر امامہ نہ چاہنے کے باوجود اٹھ کر اس کے پیچھے آئی تھی۔

”مجھے ابھی اور بہت کچھ پوچھنا تھا اس سے۔“ اس نے خفگی سے سالار کے برابر میں آتے ہوئے کہا۔

”مثلاً؟“ سالار نے کچھ شکھے انداز میں کہا۔ وہ فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکی۔

”اس نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے۔“ امامہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا، لیکن جب وہ پارکنگ میں آگئے تو اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سالار سے کہا۔

”It was your choice“ (یہ تمہارا اپنا انتخاب تھا) سالار نے کچھ بے رخی سے کہا تھا۔ ”اس

نے تمہیں نہیں بلایا تھا تم خود گئی تھیں اس کے پاس اپنا مستقبل دیکھنے۔“

”سالار! تم مجھے چھوڑ دو گے کیا؟“ امامہ نے اس کی بات کے جواب میں یک دم کہا۔

”یہ نتیجہ اگر تم نے پاسٹ کی پیش گوئی کے بعد نکالا ہے تو مجھے تم پر افسوس ہے۔“ سالار کو غصہ آیا تھا اس پر امامہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

”ایسے ہی پوچھا ہے میں نے۔“

”تمہیں پہلے کم و نہم تھے میرے بارے میں کہ کسی پامسٹ کی مدد کی ضرورت پڑتی۔“ سالار کی خفگی کم نہیں ہوئی تھی۔

”دوسری شادی تو وہ تمہاری Predict (پیش گوئی) کر رہا ہے۔ ایک کامیاب خوش گوار ازدواجی زندگی اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم مجھے چھوڑ دو۔“ سالار نے اس بار چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ ان کی گاڑی اب مین روڈ پر آچکی تھی۔

”میں تو تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔“ امامہ نے سالار کو دیکھے بغیر بے ساختہ کہا۔

”پھر ہو سکتا ہے میں مرجاؤں اور اس کے بعد تمہاری دوسری شادی ہو۔“ سالار کو یک دم اسے چڑانے کی سوچھی۔

امامہ نے اس بار اسے خفگی سے دیکھا۔

”تم بے وقوفی کی بات مت کرو۔“

”ایسے تم کر لیتا شادی اگر میں مر گیا تو۔“ اکیلی مت رہتا۔“ امامہ نے کچھ اور برا مانا۔

”میں کچھ اور بات کر رہی ہوں تم کچھ اور بات کرنا شروع ہو جاتے ہو۔ اور تمہیں اتنی ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سالار کے مشورے نے اسے ڈسٹرب کیا تھا اور یہ اس کے جملے کی بے ربطی میں جھلکا تھا۔ سالار خاموش ہوا۔ امامہ بھی خاموش تھی۔

”تم اصل میں یہ چاہتے ہو کہ میں تم سے کہوں کہ اگر میں مرجاؤں تو تم دوسری شادی کر لیتا۔“ وہ کچھ لمحوں کے بعد یک دم بولی تھی۔ وہ اس کی ذہانت پر عیش عیش کراٹھا تھا۔

”تو کیا میں نہ کروں؟“ سالار نے جان بوجھ کر اسے بڑی سنجیدگی سے چھیڑا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے اسے بڑے پریشان انداز میں دیکھا۔

”مجھے پامسٹ کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ پچھتائی تھی۔

”تم مجھ سے سودے کے بارے میں سوال کرتی ہو اور خود یہ یقین رکھتی ہو کہ اللہ کے علاوہ کسی انسان کو کسی

دوسرے انسان کی قسمت کا حال پتا ہو سکتا ہے؟“ وہ صاف گو تھا اور ہمیشہ سے تھا، مگر اس کی صاف گوئی نے امامہ کو کبھی اس طرح شرمندہ نہیں کیا تھا جس طرح اب کیا تھا۔ گھڑوں پانی پڑنے کا مطلب اسے اب سمجھ آیا تھا۔

”انسان ہوں‘ فرشتہ تو نہیں ہوں میں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔

”جانتا ہوں اور تمہیں فرشتہ کبھی سمجھا بھی نہیں میں نے‘ مارجن آف error دیتا ہوں تمہیں‘ لیکن تم

مجھے نہیں دیتیں۔“

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور وہ بہت کم کوئی غلط بات کرتا تھا۔ امامہ کو یہ اعتراف تھا۔

”زندگی اور قسمت کا پتا اگر زاپچوں‘ پانسوں‘ اعداد‘ لکیوں اور ستاروں سے لگنے لگتا تو پھر اللہ انسان کو عقل نہ

دیتا جس صرف یہی چیزیں دے کر دنیا میں اتار دیتا۔“

وہ گاڑی چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ شرمندگی سے سن رہی تھی۔

”جب مستقبل بدل نہیں سکتے تو اسے جان کر کیا کریں گے۔ بہتر ہے غیب‘ غیب ہی رہے۔ اللہ سے اس کی خبر

کے بجائے اس کا رحم اور کرم مانگنا زیادہ بہتر ہے۔“

وہ بول ہی نہیں سکی تھی۔ سالار بعض دفعہ اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا‘ یہ یقین اور یہ اعتماد تو اس کا

اثاثہ تھا۔ یہ اس کے پاس کیسے چلا گیا تھا۔

اس رات امامہ کو پہلی بار یہ بے چینی ہوئی تھی۔ وہ ساتھی تھے۔ رقیب نہیں تھے، اسے چند لمحوں کے لیے سالار سے رقابت ہوئی تھی۔ وہ ایمان کے درجوں میں اس سے بہت پیچھے تھا۔ وہ اسے پیچھے کیسے چھوڑنے لگا تھا۔



وہ سالار کے ساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار اس کے دائیں جانب تھا وہ وہاں ان کی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے چند دن سے وہاں تھے اور انی شادی کے سات ماہ بعد وہاں عمرہ کے لیے آئے تھے۔ احرام میں ملبوس سالار کے برہنہ کندھے کو دیکھتے ہوئے امامہ کو ایک لمبے عرصے کے بعد وہ خواب یاد آیا تھا۔ سالار کے دائیں کندھے پر کوئی زخم نہیں تھا، لیکن اس کے بائیں کندھے کی پشت پر اب اس ڈرنٹائف کا نشان تھا جو ہاشم مبین نے اسے مارا تھا۔

”تم نے پہلے کبھی مجھے اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا۔“ وہ امامہ کے منہ سے اس خواب کا سن کر شکذہ گیا تھا۔ ”کب دیکھا تھا تم نے یہ خواب؟“

امامہ کو تاریخ مہینہ، دن، وقت، سب یاد تھا۔ کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ اس دن جلال سے ملی تھی۔ اتنے سالوں کے لا حاصل انتظار کے بعد۔

سالار گنگ تھا، وہ وہی رات تھی جب وہ یہاں امامہ کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ اس آس میں کہ اس کی دعا قبول ہو جائے۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی دعا قبول ہو رہی تھی۔

”اس دن میں یہاں تھا۔“ اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ کو بتایا تھا۔ اس بار وہ ساکت ہوئی۔ ”عمرہ کے لیے؟“

سالار نے سر ہلایا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہونٹ کاٹا رہا۔ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی، صرف اسے دیکھتی رہی۔ ”اس دن تم یہاں نہ ہوتے تو شاید۔“

ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے کچھ کہنا چاہا تھا، مگر بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ ”شاید؟“ سالار نے سراٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ یوں جیسے چاہتا تھا وہ بات مکمل کرتی۔ وہ کیسے کرتی۔ اس سے

کہتی یہ کہہ دیتی کہ وہ اس دن یہاں نہ ہوتا تو شاید جلال اس سے ایسی سرد مہری ایسی بے رخی نہ برتا۔ وہ سب کچھ نہ کہتا جو اس نے کہا تھا۔ وہ اس کے اور جلال کے بیچ میں اللہ کو لے آیا تھا اور اس کے لیے سالار کو یقیناً ”اللہ نے ہی چنا تھا۔“

ایک گہرا سانس لے کر اس نے سب کچھ جیسے سر سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی، لیکن سالار کی باتیں اس کی سماعتوں سے چپک گئی تھیں۔

”اتنے سالوں میں جب بھی یہاں آیا، تمہارے لیے بھی عمرہ کیا تھا میں نے۔“

وہ بڑے سادہ لہجے میں امامہ کو بتا رہا تھا۔ اسے رلا رہا تھا۔

”تمہاری طرف سے ہر سال عید پر قربانی بھی کرتا رہا ہوں میں۔“

”کیوں؟“ امامہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا تھا۔

”تم منکوحہ تھیں میری۔ دور تھیں، لیکن میری زندگی کا حصہ تھیں۔“

وہ روتی گئی تھی۔ اس کے لیے سب کچھ اسی شخص نے کرنا تھا کیا؟

اسے سالار کے حافظ قرآن ہونے کا بتا بھی اسی وقت چلا تھا، وہ جلال کی نعت سن کر مسحور ہو جاتی تھی اور اب

وہاں حرم میں سالار کی قرأت سن کر گنگ تھی۔

”ایسی قرأت کہاں سے سیکھی تم نے؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”جب قرآن پاک حفظ کیا تب۔ اب تو پرانی بات ہو گئی ہے۔“ اس نے بڑے سادہ لہجے میں کہا۔

امامہ کو چند لمحوں کے لیے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”تم نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے بھی نہیں بتایا۔“ وہ شاکد تھی۔

”تم نے بھی کبھی نہیں بتایا اتنے مہینوں میں۔“

”پتا نہیں کبھی خیال نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والے زیادہ تر لوگ حفاظ ہی ہیں۔ میرا حافظ قرآن

ہوتا ان کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو؟“

آنسوؤں کا ایک ریلہ آیا تھا امامہ کی آنکھوں میں۔ جلال کو پیڈ شل پر بٹھائے رکھنے کی ایک وجہ اس کا حافظ

قرآن ہونا بھی تھا۔ اور آج وہ جس کی بیوی تھی حافظ قرآن وہ بھی تھا۔ بہت سی نعمتیں پتا نہیں اللہ کس نیکی کے

عوض عطا کرتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ دلوں میں کیسے رہتا ہے۔ وہ سنتی آئی تھی وہ دلوں کو کیسے بوجھ لیتا ہے وہ

دیکھ رہی تھی۔ بس سب کچھ ”کن“ تھا اللہ کے لیے۔ بس ایسے۔ اتنا ہی سہل۔ آسان۔ پلک جھپکنے سے

پہلے۔ سانس آنے سے پہلے۔

اللہ سامنے ہوتا تو وہ اس کے قدموں میں گر کر روتی۔ بہت کچھ ”مالگا“ تھا یہ تو صرف ”چاہا“ تھا۔

وہ اتنا کچھ دے رہا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ ایک بار پھر بھاگ کر حرم میں چلی جائے جہاں سے کچھ دیر پہلے آئی

تھی۔

”رو کیوں رہی ہو؟“

وہ اس کے آنسوؤں کی وجہ نہیں جان پایا۔ وہ روتے روتے ہنسی۔

”بہت خوش ہوں اس لیے۔ تمہاری احسان مند ہوں اس لیے۔ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر پا رہی اس لیے۔“

وہ روتی ہنستی اور کہتی جا رہی تھی۔

”بے وقوف ہو اس لیے۔“ سالار نے جیسے خلاصہ کیا۔

”ہاں وہ بھی ہوں۔“ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے شاید پہلی بار سالار کی زبان سے اپنے لیے بے وقوف کا

لفظ سن کر خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے امامہ نے آنکھیں بند کیں پھر آنکھیں کھول کر حرم کے صحن میں خانہ کعبہ کے بالکل سامنے

برابر میں بیٹھے سالار کو دیکھا جو بہت خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔

قبای الاءر بکما تکذب۔

”اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟“

”تم جو کچھ کر رہی ہو امامہ۔ تم اس پر بہت پچھتاؤ گی تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔“

نوسال پہلے ہاشم مبین نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”ساری دنیا کی ذلت، رسوائی، بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔“ انہوں نے اس کے چہرے پر ایک

اور تھپڑ مارا تھا۔

”تمہارے جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔“

امامہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”ایک وقت آئے گا جب تم دوبارہ ہماری طرف لوٹو گی۔ منت ساجت کرو گی۔ گڑبڑاؤ گی۔ تب ہم تمہیں دھتکار دیں گے۔ تب تم چیخ چیخ کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی۔ کہو گی کہ میں غلط تھی۔“

امامہ اشک بار آنکھوں سے مسکرائی۔

”میری خواہش ہے بابا۔“ اس نے زیر لب کہا۔ ”کہ زندگی میں ایک بار میں آپ کے سامنے آؤں اور آپ کو بتا دوں کہ دیکھ لیجئے۔ میرے چہرے پر کوئی ذلت کوئی رسوائی نہیں ہے۔ میرے اللہ نے میری حفاظت کی۔ مجھے دنیا کے لیے تماشا نہیں بنایا۔ نہ دنیا میں بنایا ہے نہ ہی آخرت میں کسی رسوائی کا سامنا کروں گی۔ اور میں آج اگر یہاں موجود ہوں تو صرف اس لیے کیونکہ میں سیدھے راستے پر ہوں اور یہاں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد کوئی پیغمبر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ وہی پیر کامل ہیں میں اقرار کرتی ہوں کہ ان سے کامل ترین انسان کوئی دوسرا نہیں۔ ان کی نسل میں بھی کوئی ان کے برابر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے میری آنے والی زندگی میں بھی کبھی اپنے ساتھ شرک کروائے نہ ہی مجھے اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو لاکھڑا کرنے کی جرات ہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ زندگی بھر مجھے سیدھے راستے پر رکھے۔ بے شک میں اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلا سکتی۔“

سالار نے سورۃ رحمن کی تلاوت ختم کر لی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ رکا پھر سجدے میں چلا گیا۔ سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوتے رک گیا۔ امامہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا کر رہی تھی۔ وہ اس کی دعا ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ امامہ نے دعا ختم کی۔ سالار نے ایک بار پھر اٹھنا چاہا اور اٹھ نہیں پایا۔ امامہ نے بہت نرمی سے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ جو لوگ کہتے ہیں ناکہ جس سے محبت ہوئی وہ نہیں ملا۔ ایسا پتا ہے کیوں ہوتا ہے؟“ رات کے پچھلے پر نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بھگی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

”محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نو سال پہلے جب میں نے جلال سے محبت کی تو پورے صدق کے ساتھ کی۔ دعائیں وظیفے مفتیں۔ کیا تھا جو میں نے نہیں کیا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔“

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی نرم گرفت میں تھا اس کے گھٹنے پر دھرا تھا۔

”پتا ہے کیوں؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے تھے اور تمہاری محبت میں میری محبت سے زیادہ صدق تھا۔“

سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی سے ٹپکنے والے آنسو اب اس کے ہاتھ پر گر رہے تھے سالار نے دوبارہ امامہ کے چہرے کو دیکھا۔

”مجھے اب لگتا ہے کہ مجھے اللہ نے بڑے پیار سے بنایا ہے۔ وہ مجھے ایسے کسی شخص کو سونپنے پر تیار نہیں تھا جو میری قدر نہ کرتا ناقدری کرتا مجھے ضائع کرتا اور جلال وہ میرے ساتھ یہی سب کرتا۔ وہ میری قدر کبھی نہ کرتا۔ نو سال میں اللہ نے مجھے ہر حقیقت بتادی۔ ہر شخص کا اندر اور باہر دکھادیا اور پھر اس نے مجھے سالار سکندر کو سونپا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم وہ شخص ہو جس کی محبت میں صدق ہے۔ تمہارے علاوہ اور کون تھا جو مجھے یہاں لے آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم نے مجھ سے پاک محبت کی تھی۔“

وہ بے حس و حرکت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس اعتراف اس اظہار کے لیے کون سی جگہ چنی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو نرمی اور احترام سے چومتے ہوئے باری باری اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔

”مجھے تم سے کتنی محبت ہو گی۔ میں یہ نہیں جانتی۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں جتنی زندگی بھی تمہارے

ساتھ گزاروں گی۔ تمہاری وفادار اور فرماں بردار ہوں گی۔ یہ میرے اختیار میں ہے میں زندگی کے ہر مشکل مرحلے، ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں اچھے دنوں میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں۔ میں برے دنوں میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔“

اس نے جتنی نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اسی نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ اب سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے زمین پر اتاری جانے والی صالح اور بہترین عورتوں میں سے ایک دی گئی تھی۔ وہ عورت جس کے لیے سالار نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لیے نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی؟ اور اب جب وہ عورت اس کے ساتھ تھی۔ تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کیسی بھاری ذمہ داری اپنے لیے لے بیٹھا تھا اسے اس عورت کا کفیل بنادیا گیا تھا جو نیکی اور پارسائی میں اس سے کہیں آگے تھی۔

امامہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ اسے اس عورت کی حفاظت سونپ دی گئی تھی جس نے اپنے اختیار کی زندگی کو اس کی طرح کسی آلائش اور غلاظت میں نہیں ڈبوایا جس نے اپنی تمام جسمانی اور جذباتی کمزوریوں کے باوجود اپنی روح اور جسم کو اس کی طرح نفس کی بھیشت نہیں چڑھایا۔

اس کا ہاتھ تھامے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار پارسائی اور تقویٰ کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی کو جیسے فلم کی کسی اسکرین پر چلتا دیکھ رہا تھا اور اسے بے تحاشا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”سالار! تم سے ایک چیز مانگوں؟“

امامہ نے جیسے اس کی سوچ کے تسلسل کو روکا تھا۔ وہ اس وقت حرم کے صحن سے باہر نکلتے ہی والے تھے۔ سالار نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس سے کیا مانگنے والی تھی۔

”تم ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ پڑھو۔“ سالار کو اندازہ نہیں تھا وہ اس سے یہ مطالبہ کرنے والی تھی۔ وہ حیران ہوا تھا۔

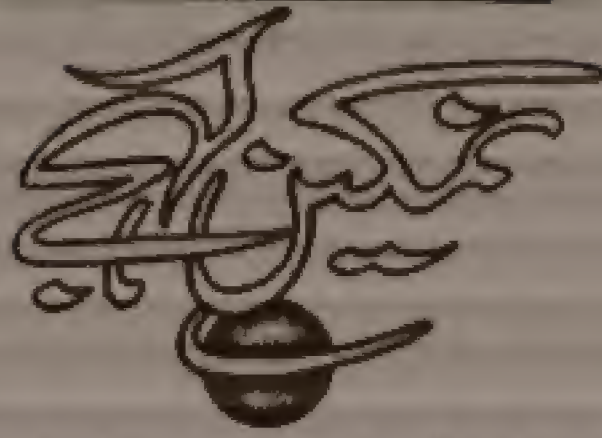
”آخری خطبہ؟ وہ بڑبڑایا۔“

”ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے جبل رحمت کے دامن میں دیا تھا اس پہاڑ پر جس پر چالیس سال بعد حضرت آدم علیہ السلام اور حوا پکھڑ کر ملے تھے اور بخشے گئے تھے۔“

امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ ایک جھماکے کے ساتھ سالار کو پتا چل گیا تھا وہ اسے آخری خطبہ کیوں پڑھوانا چاہتی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





”اٹھنا۔ اب بس بھی کرو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پہ سوار کر لیتی ہو۔ گھنٹوں جلتی کڑھتی رہتی ہو۔ خود بھی پریشان رہتی ہو اور مجھے بھی پریشان کرتی ہو۔“

جنید نے ادھر سے ادھر غصے سے جھک لگائی اور چیزوں کو پختی شانزے سے کہا اور اس کا نازک ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس صوفے پہ بیٹھا لیا۔ شانزے منہ بسورتی ہوئی جنید کے پاس صوفے پہ بیٹھ گئی۔ آج اتوار کا دن تھا۔ جنید بہت آرام اور پرسکون انداز میں بیوی لاؤنج کے صوفے پہ نیم دراز ٹانگ شودیکھنے میں مگن تھا۔ مگر شانزے کے خراب موڈ کا اندازہ اسے کل رات ہی ہو گیا تھا۔ کل رات عالیہ آپا کے گھر سے واپسی پر سے ہی وہ بہت چپ چپ تھی اور گھر آتے ہی وہ غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

”آئندہ میں اپنی کسی نند کے گھر نہیں جاؤں گی۔ آپ نے ملنا ہے تو سو بار ملیں اپنی بہنوں سے۔ مگر مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔“

شانزے نے غصے سے کہتے ہوئے ڈربنگ روم کا دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ جنید گہری سانس لے کر ست روی سے جوتوں کے لیمے کھولنے لگا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے ایسا ہی ہونے لگا تھا۔ خاندان میں ہونے والی کسی بھی دعوت سے واپسی پہ شانزے یہی اعلان کرتی تھی اور اس کا موڈ بھی کئی دن آف رہتا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ جنید نے اس وقت خاموشی ہی میں بستر پر سوجھی مگر صبح بھی شانزے کو اسی موڈ میں دیکھ کر چپ نہ رہ سکا اور اسے اپنے پاس بیٹھا کر آرام سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ جنید کی ہمدردی پا کر شانزے کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ایسی ہی تھی

بہت حساس اور جذباتی سی۔

”جنید! ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا رویہ آپ کی ساری فیملی کے ساتھ کتنا اچھا اور دوستانہ رہا ہے، مگر پھر بھی!“

شانزے نے نم لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میں جانتا ہوں یار! تم سب سے کتنا پیار کرتی ہو۔ سب کا خیال رکھتی ہو۔ میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہماری پرسکون زندگی میں یہ تلاطم کیوں آگیا ہے۔ پہلے تو سب تم سے اتنا پیار کرتے تھے۔ پھر اب۔“ جنید نے الجھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ روبینہ بھابھی ہم سے زیادہ امیر ہیں اور یہ کہ شاید میرے بچے نہیں ہیں تو آپ کے گھر والوں کا رویہ بدل گیا ہے۔“ شانزے نے لب کاٹتے ہوئے کہا تو جنید ”لا حول ولا“ کہہ کر رہ گیا۔

”نہیں شانزے۔ میں اپنے بہن بھائیوں کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ ایسی چھوٹی سوچ نہیں رکھتے ہیں۔ تم بلاوجہ کے فضول وہم مت پالو۔“

جنید نے سنجیدگی سے اس کی بات کی نفی کی تھی۔

”اور ویسے بھی ہماری رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں۔ خیر چھوڑو اور اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہاری امی سے ملنے چلتے ہیں، واپسی پہ ڈنر باہر ہی کریں گے۔“

جنید نے شانزے کا دھیان بٹانے کے لیے پروگرام ترتیب دیا تھا اور حسب توقع میکے جانے کا سن کر شانزے کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا اور وہ تیار ہونے چلی



گئی۔ جبکہ جنید سنجیدگی سے اس مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو ان کی خوش گوار زندگی میں اکثر تلخی گھولنے لگا تھا۔ شانزے کی نظر سے دیکھا جائے تو سب سچ ہی لگ رہا تھا، مگر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ”نظر“ جو دیکھتی ہو وہ سچ بھی ہو اور اگر سچ بھی ہو تو ہر نظر کے دیکھنے کا انداز اپنا ہوتا ہے۔ زاویہ الگ ہوتا ہے۔ اور سچ جو بعض اوقات بہت سی باتوں کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ جس تک صرف غیر جانب داری اور فہانت سے ہی پہنچا جاتا ہے اور جنید نے بھی غیر جانب داری سے حالات کا تجزیہ کرنے کی ٹھانی تھی۔



جنید، پانچ بسن، بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا تھا۔ فریدہ باجی سب سے بڑی تھیں۔ ان کے بعد رحمان بھائی، پھر عالیہ آپا اور ان سے چھوٹے اسد بھائی تھے۔ جنید کے مابین باپ کا بہت سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ سب بسن، بھائی اپنی اپنی شادی شدہ زندگی میں خوش اور مگن تھے۔ تین سال پہلے جنید کی شادی بھی بہت دھوم دھام اور ارمانوں سے شانزے سے ہوئی تھی۔

شانزے خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دوستانہ مزاج بھی رکھتی تھی۔ اسی لیے جلد ہی سب سے گھل مل بھی گئی تھی۔ مخلص اور حساس سی شانزے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہو جاتی تھی اور اس بھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے شانزے کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی دونوں نندوں کا رویہ اس کے ساتھ بدلنے لگا ہے۔ بڑی دونوں جھٹائیوں کے ساتھ بہت محبت اور پر جوش انداز سے ملنے والی شانزے سے بہت ریزہ ہو کر ملنے لگی تھیں۔

ابھی کل ہی کی بات ہے عالیہ آپا اور ان کے شوہر عمرہ کر کے واپس آئے تھے اور عمرے سے واپسی پہ انہوں نے بہت شان دار سی دعوت میں سارے خاندان والوں کو بلایا تھا۔ شانزے نے بہت جوش اور

خوشی سے ان کے کھر جانے کی تیاری کی تھی۔ ان کے لیے بہت خوب صورت کپڑے بھی لیے تھے۔ وہاں جانے تک سب کچھ ٹھیک ہی رہا۔ مگر جب فریدہ باجی اور عالیہ آپا نے ہر مہمان کے سامنے رحمان بھائی کی بیوی غزالہ یا اسد کی بیوی روبینہ کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں، تو شانزے کا منہ بن گیا۔ شانزے کے لائے گفتش کسی بھی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ مگر دونوں نندوں نے شانزے کا نام کم ہی لیا تھا۔ جبکہ غزالہ بھابھی اور روبینہ بھابھی کے لائے گفتش اور خلوص کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔

شانزے یہ سب پچھلے کافی عرصے سے نوٹ کر رہی تھی کہ جس طرح شروع کے پہلے سال میں دونوں بڑی نندیں اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔ پیار کرتیں تھیں۔ اب اس میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ جو شانزے سے برداشت نہیں ہو رہی تھی اور وہ منفی سوچوں میں گھری تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا اندازہ اسے بھی نہیں ہوتا تھا۔



”شانزے نے مجھے آنے سے پہلے فون کر دیا تھا۔ میں تو کھانے کی تیاری کرنا چاہ رہی تھی، مگر شانزے نے منع کر دیا کہ تم لوگوں کا آج باہر ڈنر کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر پھر بھی میں نے اپنی شانزے کی پسند کی کافی چیزیں تیار کر لی ہیں۔“ شانزے کی امی نے چائے کی ٹالی میں رکھے مختلف لوازمات پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”جنید! یہ گاجر کا حلوہ لو۔ خاص تمہارے لیے بنایا ہے۔ شانزے کو میٹھے سے زیادہ نمکین چیزیں پسند ہیں۔ ابھی بھی دیکھو وہی بھلوں پہ کتنا چاٹ مسالا ڈال کر کھا رہی ہے۔“

نرہت بیگم نے مسکرا کر سی سی کرتی شانزے کو دیکھا تھا۔ جنید اچھی طرح سے شانزے کی پسند کو جانتا تھا۔ چائے کی ٹالی میں زیادہ تر لوازمات نمکین ہی تھے۔

ایک بھر پور دن گزار کر دونوں واپس گھر آئے تو شانزے کا موڈ بہت اچھا ہو چکا تھا۔

جنید نے شکر ادا کیا اور شانزے کو اچھی سی چائے بنانے کا کہہ کر آفس سے لائی فائلز کھول کر بیٹھ گیا۔ شانزے گنگنائی ہوئی کچن میں چلی گئی تھی۔



”جنید! آپ دیکھ۔ لیجیے گا آج بھی وہاں غزالہ بھا بھی یا روینہ بھا بھی کی تعریفیں ہو رہی ہوں گی۔“

فریدہ باجی کے گھر کی طرف رواں دواں شانزے نے جنید سے کہا تھا۔ جو دھیان سے گاڑی چلاتا ہوا شانزے کی باتوں پہ ہوں ہاں ہی کر رہا تھا۔ فریدہ باجی کی بڑی بیٹی منال جو بیس سال کی تھی۔ اس کی منگنی اس کے تایا کے بیٹے سے ہو رہی تھی۔ منگنی کی تقریب گھر کے بڑے سے لان میں ہی ارنج کی گئی تھی۔ خاندان کے سب ہی قریبی لوگ مدعو تھے۔ منگنی کا فنکشن بہت خوش اسلوبی سے سرانجام پایا تھا۔ رات کافی ہو گئی تھی۔

جنید نے فریدہ باجی کے پاس جا کر گھر جانے کی اجازت لی۔ جہاں پہلے ہی غزالہ بھا بھی اور روینہ بھا بھی موجود تھیں اور انہیں مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ ہر کام میں مدد کی پیش کش بھی کر رہی تھیں۔ فریدہ باجی اتنی محبت اور میٹھے بول سن کر ہی سیراب ہو گئی تھیں۔

”شہو شانزے! میں نے تم لوگوں کے لیے کھانا پیک کروایا ہے۔ خاص کر پیٹھے کا حلوہ جنید بہت شوق سے کھاتا ہے۔“

فریدہ باجی نے جنید کے اجازت لینے پر جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

”رہنے دیں فریدہ باجی! میں میٹھا اتنے شوق سے نہیں کھاتی ہوں اور جنید بھی آج کل ڈائننگ کر رہے ہیں۔ وہ نہیں کھائیں گے۔ فضول میں ضائع جائے گا۔“

شانزے نے فوراً ”منع کرتے ہوئے کہا اور فریدہ

باجی کے پھلکے بڑتے چہرے کو دیکھے بغیر سب کو خدا حافظ کہتی مڑ گئی، مگر جنید نے یہ سب بہت غور سے دیکھا تھا۔

”فریدہ باجی جلدی سے میرے لیے پیک کیا ہوا حلوہ دیں۔ میں ڈائننگ کو کچھ دن چھوڑ بھی سکتا ہوں، اتنے مزے دار حلوے کے لیے۔“

جنید نے شانزے کی بات کا اثر ضائع کرنے کے لیے، ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو فریدہ باجی سرشار سے قدموں سے اندر کی طرف پیہہ گئی تھیں۔

جنید نے گہری سانس لی تھی اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکریہ ادا کرنے لگا تھا۔ جس نے اسے اپنی ”نگہ“ سے دیکھنے اور درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا کی تھی۔



”دیکھا آپ نے، آج بھی ہر طرف غزالہ بھا بھی اور روینہ بھا بھی کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔ مگر میں نے بھی اب پروا کرنی بھوڑ دی ہے۔“

شانزے لباس تبدیل کر کے کچن میں آئی تو جنید کو سبز چائے کا قہوہ پھینکتے ہوئے دیکھا۔ کافی عرصہ اکیلے رہنے کی وجہ سے جنید کو بہت سے گھریلو کام کرنے آگئے تھے اور کشمیری چائے تو وہ بہت اچھی بتاتا تھا۔ شانزے کو بہت پسند تھی۔ اس کے ہاتھ کی چائے، مگر جنید بہت موڈ میں ہو تو تب ہی بتاتا تھا۔ ورنہ صاف منع کر دیتا تھا اور آج اسے کچن میں مصروف دیکھ کر شانزے کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

سردرات کے اس پر کشمیری چائے کا بھی اپنا مزا تھا۔

کچھ دیر میں ہی گرم گرم، خوش گوار مہک اور رنگ والی چائے شانزے کے سامنے تھی۔ شانزے نے بے تالی سے گھونٹ بھرا۔ پھر ایک دم سے ناگوار منہ بنا کر رہ گئی تھی۔

”میری چائے میں لگتا ہے آپ چینی ڈالنا بھول

گئے ہیں۔ ”شانزے نے سامنے والی کرسی پر براجمان جنید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا کر شوگر پاٹ (چینی دان) اٹھانے لگی۔

”چینی نہیں، نمک ڈالا تو ہے تمہاری چائے میں، لگتا ہے کم ہے میں اور ڈال دیتا ہوں۔“ جنید نے کہتے ہوئے نمک والی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

”نہیں جنید! نمک، تھوڑا ہی بہت ہے۔ زیادہ ڈالیں گے تو یہ پینے کے قابل نہیں رہے گی۔“ شانزے نے جلدی سے اسے روکتے ہوئے کہا تھا۔

”مگر شانزے! تمہیں نمکین چیزیں زیادہ پسند ہیں نا۔ میٹھے کی نسبت، کشمیری چائے میں بھی تم چینی اور نمک دونوں ہی ڈالتی ہو۔“ جنید نے یاد دہانی کرواتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔ مگر نمک ایک حد تک ہی برداشت ہوتا ہے۔“ شانزے نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

”اور نمکین لہجے؟“ جنید نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ شانزے ٹھٹھک گئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ شانزے نے ابھٹھٹھ بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

”شانزے! شاید تم نے کبھی اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ تم سے محبت کرنے والے لوگ اب تمہیں دیکھ کر یا تم سے بات کرتے وقت محتاط کیوں رہتے ہیں؟ اس لیے کہ اپنے جذباتی پن اور نا سنجھی کی وجہ سے تم اکثر بہت سخت اور روکھے لہجے میں جواب دیتی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم سب کے ساتھ مخلص ہو۔ ان کے لیے ہر کام خوش دلی سے کرتی ہو۔ مگر تمہارے لہجے کا ٹیکھا پن، تمہارے لیے سب اچھے کاموں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ کیا سچ میں ایسا ہی نہیں ہے؟“

جنید نے کم صدمہ سی بیٹھی شانزے سے پوچھا تھا۔ تو وہ گہری سوچ سے باہر آتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ میں شروع سے ہی ایسی ہوں۔ ممانے مجھے بہت بار سرزنش بھی کی کہ لڑکیوں کو بہت سوچ سمجھ کر اور نرمی سے بات کرنی چاہیے۔ خاص کر

سسرالی رشتوں کی نزاکت کو سمجھنا چاہیے۔“ شانزے نے فراخ دلی سے اپنی خامی کو تسلیم کیا تھا۔ جس کی وجہ سے جنید کی نظروں میں وہ یک دم ہی بہت اوپر ہو گئی تھی۔ خالص اور سچے دل کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، جن کے دل کینہ اور بغض سے پاک ہوتے ہیں۔

”جنید! اسی وجہ سے سب مجھ سے کتراتے لگے ہیں نا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالہ بھابھی اور روبینہ بھابھی بہت سمجھ داری اور محل کے ساتھ معاملات کو ہینڈل کرتی ہیں۔ ناگوار بات کو بھی اپنے لہجے کی نرمی میں سمو کر پیش کرتی ہیں کہ اگلا بندہ سمجھ بھی جائے اور اسے برا بھی نہ لگے۔ مگر وہ مجھ سے عمر اور تجربے میں بڑی بھی تو ہیں۔ مجھے سیکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر اب میں ایسا کیا کروں کہ سب پہلے کی طرح مجھ سے پیار کرنے لگیں۔“ شانزے نے بے چارگی سے پوچھا تھا۔

”کچھ خاص نہیں! صرف اپنی چائے میں چینی ڈال کر دیکھو۔ دونوں کے مناسب تناسب سے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

جنید نے شانزے کی چائے میں چینی ڈالتے ہوئے

کہا۔ شانزے نے چائے کا گھونٹ لیا تو خوش گواریت کے احساس کے زیر اثر مسکراتے لگی۔ ”نمکین ڈالنے سے ہوں یا نمکین روپے، ایک حد سے زیادہ دونوں ہی برداشت نہیں ہوتے ہیں اور ان کی تلخی کو کم کرنے کے لیے رویوں کی مٹھاس بہت ضروری ہوتی ہے۔ مجھے سمجھ آگئی ہے؟“ شانزے نے مزے سے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”کیا سمجھ آئی ہے؟“ جنید نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”یہ ہی کہ رشتوں کی مٹھاس لینے کے لیے، لہجوں میں سے نمک کو کم کرنا پڑے گا۔ دونوں مناسب تناسب سے ہوں گے تو زندگی کا ذائقہ بہت خوش گواری ہو جائے گا۔“ شانزے نے مسکرا کر جواب دیا۔ تو جنید نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔



وہ مائل سی

دیکھئے! میں اتنے غصے میں ہوں کہ سلام کرنا بھول
دکا ہوں اور وہ بھی جان بوجھ کر آپ کے ڈائجسٹ میں
جتنی بھی مصتفین ہیں۔ خواتین مصتفین! جتنے ان سے
اتنی سخت اور انتہائی شدید قسم کی شکایت ہے کہ میں
ان کے خلاف ایف آئی آر کروا سکتا ہوں فونی عدالت
تک جا سکتا ہوں مقدمہ درج کروا سکتا ہوں یہ تو اب
اسے میری شرافت ہی مانے جو میں آپ کو مطلع کر رہا
ہوں اور آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرا خدا شائع
کیا جائے ورنہ ایف آئی آر۔ آگے آپ سمجھ دار
ہیں۔ (فون فال کرتے ہوئے بے حد سرخ چہرے اور
مزید سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ)
میرا دل چاہتا ہے کہ ان خواتین مصتفین کے قلم

ایک بیچارہ سا۔ عام سا نہ امیر نہ غریب۔ نہ
خوب صورت نہ بد صورت۔ نہ گورا نہ کالا۔ نہ
بہت لمبا نہ بہت چھوٹا۔ یعنی ہر لحاظ سے درمیانہ سالڑکا
مگر اس درمیانے سے لڑکے کو محبت جیسی عام بیماری
بڑے ہی عام انداز میں لاحق ہو گئی تھی۔ اور وہ سخت
ٹاللاں ہے۔۔۔ بھی بہت ہی ٹاللاں ہے محبت سے؟
ارے! نہیں۔۔۔ تو پھر کس سے؟
ان ہی سے جو۔ خیر چلے! آپ بھی سنئے اور فیض
یاب ہوئے۔ تو نعمان عابد کی کہانی۔

بے بے بے

نعمان عابد کا خط ایک مشہور ڈائجسٹ کی مدیرہ کے

نام۔



کاؤلیٹ



سیاہی کی قلت کا شکار ہو جائیں۔ معذرت کے ساتھ
مگر میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔

غضب خدا کا۔ خدا کی پناہ۔

کیا ان کو معلوم ہے؟ یہ اپنے قلم کے ذریعے کرتی کیا
ہیں؟

کیا وہ جانتی ہیں؟ کیا انہیں معلوم ہے؟ انہیں کیا خبر؟
انہیں کیا معلوم؟

وہ ظلم کے پہاڑ ہوتے ہیں جو مجھ جیسے مسکینوں پر
نوٹ پڑتے ہیں۔ دکھ کاٹھنوں انبار ہوتا ہے جس کے

نیچے ہم جیسے کئی پستے ہیں۔ کرب و الم کا ایک دریا ہوتا
ہے جس میں اپنے جیسے کئی بھائی تو ضرور ہی غرق
ہوتے ہوں گے۔

اور یہ لکھاری! ان کو بھی اپنے قلم کا سارا کمال۔
ذہن کی تمام تر صلاحیتیں اور الفاظ کی تمام گانٹھوں کی
گرہیں اسی وقت کھولنی یاد آتی ہیں جب یہ۔۔۔ یہ۔۔۔
ہیرو کو بیان کرتی ہیں۔

یہ صفحات۔۔۔ صفحات۔۔۔ مگر حلیہ ہے کہ مکمل
ہونے میں ہی نہیں آ رہا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں۔۔۔ مرد
حضرات بھی فدا ہو جائیں۔ اور اپنی انگلیوں کو چبا لینے
میں ذرا بھی تردد کا مظاہرہ نہ کریں۔

”خبردار۔ خط کو بند مت کریں۔ ردی کی ٹوکری کا
پیٹ پہلے ہی بہت بھرا ہوا ہے۔ پورا بڑھیا مدیرہ صاحبہ
! ورنہ ایف آئی آر۔ (آنکھیں نکالتے ہوئے دھمکی
اشاکل میں)

ہاں! تو یہ ہیرو نامی مخلوق۔ مجھے بتایا جائے کیا یہ
منج سے امپورٹ کیا جاتا ہے یا اس سلسلے میں چاند
والوں سے رابطہ کیا جاتا ہے؟

اف۔ اف۔ اف اور پھر ت۔ اف۔

کیا اسپانڈرٹن۔ سپرٹن۔ آئرن مین۔ بیٹ مین
اور کیا گیسٹن امریکا؟ اور نامعلوم کون کون سے مین۔
ماننا پڑے گا بھی یہ ان ہی مصنفین کا کمال ہے
سارے مینوں (Man کی اردو جمع ورژن) کو سمیت
ان کی خوبیوں کے۔ یہ صرف ایک ہیرو میں جمع ضرب

اور پھر تقسیم کر کے دکھاتی ہیں۔ رہا بائیس۔ نانانا۔
اس کا تو سوچنا بھی نہیں۔ مائیس، نفی یا پھر نیگٹو اس
کا ہیرو سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔
نہیں ہو سکتا اور پھر سے نہیں ہو سکتا۔ ”بندہ خدا!
انسانوں کی ہی مخلوق ہے نا وہ؟

اور رہی بات رستائیں کی۔ لیس جی۔ ادھر تو سمجھئے
اخیر ہو گئی انت ہو گئی۔ ایسی آفت شخصیت۔ جو آج
تک آنکھ نے دیکھی اور نہ ہی اس کو یہ شرف کبھی
حاصل ہو سکے گا۔

قد یہ چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ اور سات فٹ سے بچتا

ہوا۔ اتنا کہ عالم چٹا اپنی قبر میں کانپ کر رہ جائے۔
اس کا ریکارڈ جو ٹوٹے ٹوٹے بچا)

شکل و صورت ایسی کہ ٹام کروڈ بریڈیٹ کی رکھ کر
پٹائی کرنے کو دل چاہے۔ حمزہ علی عباسی کو تو دریا برد کروڈ
۔۔۔ اور فواد خان۔ اسے تو گولی سے اڑا دو۔

وہ ڈشنگ، سمشنگ (Smashing) اور پٹا
نہیں اور کون کون سے (انگ) وہ تو صرف ہیرو کے لیے
ہی بنے ہیں۔

اور اسی پر جتے ہیں۔

اور معلوم نہیں وہ کون سی دنیا ہے جو یہ ٹام کروڈ
شرود پر مرتی ہے (واضح رہے کہ شرود میں بریڈیٹ
حمزہ علی عباسی اور فواد خان شامل ہیں)

”ہے۔۔۔ ہے خبردار۔ ہو سیار۔ طوالت کا بہانہ
ہرگز ہرگز نہیں چلے گا۔ ورنہ ایف آئی آر (تھانے
دارانہ اشاکل) اب بات ہو جائے ذہانت و فطانت کی
وہ ذہانت اور ایسی فطانت۔ کہ شرلاک ہو مز شرما
جائے 007 جیمز بونڈ منہ چھپاتا پھرے ٹرانسپوٹر کا
فرینک بغلیں جھانکے اور عمران علی (عمران سیریز) کو تو
تھپڑ لگانے کو دل چاہے۔

کیا غضب کا ٹیلنٹ دماغ پایا ہے ہیرو صاحب نے
کہ نیوٹن کے دماغ کو میوزیم سے باہر پھٹکوانے کو دل
چاہے۔ آنکھوں سے بولتا ہوا۔ لفظوں سے جادو جگاتا
ہوا۔ حرکتوں سے پھیلاڑتا ہوا اور مسکراہٹ سے

لڑکیوں کی کثیر تعداد کو فنا کرتا ہوا۔

(آبشار) اور سمندر میں ہے)

یہ مجھے ہیرو کم کوئی جانور زیادہ لگتا ہے۔ جراسک پارک کا ڈانسو سارنہ ہو تو۔ کیسی فینٹسی۔۔۔ توبہ توبہ۔ (گال پیٹتے ہوئے خالص اماں رشیدن کے اسٹائل میں) اور پھر سے توبہ توبہ۔۔۔ وہ فینٹسی کہ بابل کی ساری سوویز کو آگ لگا دو۔ ایسی جادو نگری۔ کہ ہیری پورٹر فلمز کی سی ڈیاں (C.D کی اردو جمع ورژن) توڑ ڈالو۔

مجھے معلوم ہے کہ یہ سارے الفاظ آپ کو بے حد بُرے محسوس ہو رہے ہوں گے، مگر کاش کہ آپ میرا دل دیکھ پاتیں۔ کاش کہ آہ! میرا معصوم سا چھوٹا سا بے چارہ سادل (نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے) اور اور جب یہ محترم ہیرو صاحب (اچانک ہی جلالی غصہ عود کر آیا) رو مینس پہ آئے تو کیا رو میوٹو کیا جیک ڈاؤن (ٹائی ٹینک کا ہیرو) ان سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہمارے محترم ہیرو صاحب۔ آنکھیں پھٹ جائیں اور دل شق ہو جائیں۔ خواتین قارئین کے

اور کاش کہ دانت ڈریکولا جیسے ہو جائیں جو پینے کو خون نہیں۔ سیاہی مانگے وہ بھی ان خواتین لکھاریوں کے قلم کی (مجھ جیسے سارے بھائیوں کی مشترکہ خواہش) اور ابھی تو میں نے ان جگہوں کا ذکر خیر تو کیا ہی نہیں۔ جوان مصنفین کے ناؤز میں لکھی جاتی ہیں۔ وہ۔ وہ جگہیں کہ الامان اور الحفیظ۔ ایفل ٹاور۔ نیا گرافال اور وہ دریائے سین کا مشہور پل۔

بندہ پوچھے۔۔۔ یہ ایفل ٹاور کی جگہ یہ اپنا مینار پاکستان نہیں ہو سکتا تھا کیا؟ چلو مانا کہ ایفل ٹاور۔ مینار پاکستان سے ذرا سا ہی لمبا ہے۔ مگر یہ بھی کوئی بات ہے جس کی بنا پہ مینار پاکستان کو رومانٹک پلیس نہ مانا جائے۔ اور اس نیا گرافال کی جگہ کراچی کا سمندر بھی تو ہو سکتا ہے نا۔

اور یہ سطور پڑھتے ہوئے مدیرہ۔ بحریرت میں غوطہ زن ہو کر اس قدر مشترک کی تلاش میں ہے جو کہ فال

اور۔ اور (غصے سے کف اڑاتے ہوئے) اس کافر بل کی جگہ راوی کاپل نہیں ہو سکتا تھا کیا؟ ایک دم مسلمان ان جگہوں پہ جاتے ہوئے اور محبوبہ کو لے جاتے ہوئے میرے بھائیوں کی چٹخیں نکل جائیں۔ کراہیں ابل پڑیں۔ جسم کی چولیس ابل جائیں اور بال ایک رات کیا چند گھنٹوں میں ہی سفید ہو جائیں۔

اتنا خرچہ؟

اب ہر کوئی بزنس ٹائیکون۔۔۔ وزیر شذیر۔۔۔

انڈسٹری کا مالک تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ کوئی مجھ جیسے غریب سفید پوش۔۔۔ پردہ پوش بھی تو ہوتا ہے۔۔۔ ہیں کہ نہیں؟

خبردار (دانت پیٹتے ہوئے) جو خط کو غیر ضروری سمجھا ورنہ ایف آئی آر (گردن اکڑا کر سخت تنبیہ ہی انداز)

اب آپ خود انصاف کریں۔ کیا یہ ظلم نہیں؟ کیا واقعی ہی یہ ظلم نہیں؟

آہ! میرا دل۔۔۔ وہ درد سے پھٹا جا رہا ہے اور آہ!۔۔۔ آہ! میری جیب وہ مجھ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر روتی ہے اور آخر میں آپ سے مودبانہ التماس ہے کہ خدارا مجھ پہ اور میرے جیسے کئی دوسروں پہ رحم کیا جائے۔

میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں اور اسی احترام کے ساتھ یہ عرض ہے کہ خدارا۔۔۔ خدارا ایسی مخلوق کو ڈائجسٹ میں ہرگز ہرگز جگہ نہ دی جائے اور آخر میں (آخر یہ آخر ہو گا کب؟ مدیرہ اب دانت پیٹتے ہوئے سوچ رہی ہیں) ایک خواہش عرض ہے کہ۔

کاش میں ڈریکولا ہوتا۔ ایسا ڈریکولا جو کہ پینے کو خون نہیں۔ سیاہی۔ اب تک تو آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی۔ تو پھر اللہ حافظ۔ واسلام

ایک انتہائی مجبور۔۔۔ ہیروز کا ستایا ہوا۔

اور نہ۔۔۔ نغین کا مارا ہوا۔

نعمان عابد!

خصوصی نوٹ!

(خدا شائع کیا جائے۔ وہ بھی پورے کا پورا اور نہ۔۔۔
ایف آر۔ نہیں فوجی عدالتیں۔!)

یہ ایک کالج کا منظر ہے۔

کالج کی پتھریلی روش۔ جس کے دونوں کناروں پہ
اونچے اونچے ہرے بھرے سرسبز درخت ہیں اور ان
درختوں سے ذرا پرے۔ روش کے دونوں اطراف
میں خوب صورت لش ہری گھاس گراس کے لان ہیں
۔ جن میں پھولوں کی کیاریاں ہی پھولوں کے بوجھ
سے تالاں دکھائی دیتی ہیں۔

اگر اس پتھریلی روش پہ ٹاک کی سیدھ میں (اور
بطرس کے مطابق اگر ٹاک ٹیڑھی ہو تو حامل ہذا کو ہر
قصور سے مستثنیٰ مانا جائے)

چلتے جائیں تو آپ آڈیٹوریم کے سامنے جا رکیں
گے۔ اگر آپ گھوم کر پیروں کو ذرا سی تکلیف دے کر
آڈیٹوریم کی پچھلی طرف پہ جائیں تو وہاں موجود
سیڑھیوں پہ آپ کو ایک لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دے
گی۔

نرم و نازک سی۔ کسی شاعر کے خواب سی۔ ذرا
میٹھی سی اور بہت ساری نمکین۔ اس کا منہ بری طرح
سے لٹکا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہے۔ اور وہ
عجیب غمناکی کی تصویر بنا ہوا ہے۔

وہ لڑکی غم کی پینٹنگ نظر آتی ہے اور دکھ کی تو گویا
عملی تفسیر ہے۔

اس کا سانس جیسے اندر ہی اندر گھٹ رہا ہے۔ اور وہ
بار بار گہرے گہرے سانس لے کر تنفس کو بحال کرنے
کی اپنی بہترین کوشش میں ہے۔ اس کی آنکھیں نم
ہیں مگر آنسو آنکھوں سے باہر نہیں آتا ہے۔

اور وہ سخت تکلیف میں ہے۔

آنسو جیسے اس کے دل پہ کر رہے ہیں اور اس کے
دل کو کاٹ کاٹ کر خون ہونے کا سبب بن رہے ہیں۔
وہ خلاؤں میں گھور رہی ہے اور اپنے کسی غیر مرئی
نکتے کی تلاش میں ہے جس کو وہ مزید گھور سکے۔
اس خوب صورت سی نمکین لڑکی کے ساتھ ایک
اور لڑکی بھی موجود ہے۔

وہ اس نمکین لڑکی کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے۔ بے حد
ہمدردی سے اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کا تسلی دینے کا
ایک انداز ہے مگر۔ تسلی کسی بھی طرح وقوع پذیر
نہیں ہو پا رہی ہے۔

”نائلہ!“ بالآخر اس نمکین لڑکی نے اپنے ساتھ
موجود لڑکی کو مخاطب کیا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے! میری زندگی کا سب سے بڑا
دکھ سب سے بڑا غم کیا ہے؟“

یاد رہے کہ یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ تھوڑی سی
میٹھی اور نمکین سی۔ لڑکی۔ خود زندگی کا سب سے
بڑا دکھ اور سب سے بڑا غم نظر آ رہی تھی۔

”کیا ہولنا نائلہ نے بھی انوکھے سے لہجے میں
پوچھا۔“

وہ چند لمحے ضبط کی آخری منزلوں کو عبور کرتے
ہوئے۔ اسے دیکھتی رہی۔ اور پھر اس نے ہونٹ
دباتے ہوئے سر جھکایا تھا۔

”میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ۔۔۔“ ذرا
ساؤتف۔۔۔ شاید اس کے گلے میں آنسو اٹکے تھے۔
”کہ۔۔۔ عالم شاہ مرگیا (جو چلے تو جاں سے گزر گئے کا ہیرو)

اور اب وہ نیم مجنوں حالت میں دور۔ بہت ہی دور
آسمان کی وسعتوں میں کچھ کھوج رہی تھی (شاید عالم
شاہ کی روح کو)

”صبح نے پچھلے دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔“
”کیوں؟“ وہ صبح کے ابو تھے جو اس اطلاع پہ چونکے

تھے۔

”وہ اس کے کسی ناول کا ہیرو۔ مر مر کیا ہے۔“

یہ صبح کی امی تھیں جنہوں نے یہ اطلاع کافی چیزے انداز میں پہنچائی تھی۔ اور اس اطلاع پہ صبح کے ابو نے ایسا منہ بنایا تھا کہ جیسے قل انہیں ہی کروانے ہوں۔

”ہے کدھر؟ بلاؤ اسے۔“

”رہنے دیں۔ کون سا اثر ہوتا ہے اس پر۔“

”افوہ! کھائے گی نہیں تو مزید حالت خراب ہوگی، بلاؤ اسے۔ بات کرتا ہوں میں۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولے تھے۔

تھوڑی دیر بعد۔ صبح ان کے کمرے میں موجود تھی۔

جاوید صاحب خاموشی سے اسے اندوہناکی اور غمناکی کی تصویر بنے ہوئے دیکھتے رہے تھے پھر ایک گہرا سانس بھر کر انہوں نے اس پر سے نظریں ہٹائی تھیں۔ ان کی بیٹی کچھ ایسی ہی جذباتی تھی۔

”اوھر آؤ۔ صبح بچے۔ میرے پاس آؤ۔“ انہوں نے بڑے ہی پیار سے پکارا تھا بلکہ پچکارا تھا۔

اور لیس جی۔ صبح نے منہ بسورنا شروع کر دیا ہے۔ ”کیا ہوا؟ میرے بچے! کیوں ایسی حالت بنائی ہے۔“ اپنے پاس بٹھاتے ہوئے جاوید صاحب نے اسے ساتھ لگایا تھا اور بس۔

”ابو!۔“ وہ جاوید صاحب کے گلے لگ کر اس بے ساختہ انداز میں روئی تھی کہ عرصہ دراز کے بعد سببم کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

”بس۔ بس میرے بچے! بتاؤ تو سہی۔“

”عا۔ عا۔ عا۔“ ہچکیاں۔

”عالم۔“ ہچکیاں۔ ”عالم شاہ۔“ پھر سے ہچکیاں۔

”عالم شاہ۔ مر گیا ابو!“ اور وہ رونا کہ خدا کی پناہ۔

اور جاوید صاحب۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو وہ اپنی ہنسی روکنے کی بہترین کوشش میں سرگرداں دکھائی دے رہے تھے۔

”بس۔ بس میری جان جانا تو سب کو ہے۔ ایک نہ

ایک دن چلو وہ ذرا جلدی چلا گیا۔ بھری جوانی میں ہی سہی۔ بس کیا کریں۔ موت جوانی تھوڑا ہی دیکھتی ہے۔ چل میرے بچے چپ ہو جاؤ شاہباش۔“ اور اس کا دھواں وار قسم کا رونا بتدریج کم ہو رہا تھا۔ اور۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ ان سے الگ ہو کر اپنی آنکھیں اور ناک صاف کر رہی تھی۔ واضح رہے کہ ہچکیاں لیتے ہوئے۔

”چلو میرا بیٹا! اب کھانا کھا لو شاہباش! تم کھانا نہیں کھاؤ گی تو اس کی روح کو تکلیف ہو گی نا۔“

جاوید صاحب نے بھی اسے وہاں پہ ہی لا کر مارا تھا۔ جہاں یہ وہ مر سکتی تھی۔

”دل نہیں کر رہا ابو!“ حسب توقع جواب۔

حسب عادت جاوید صاحب نے قمقموں کے جم

غفیر کو اپنے اندر ہی روکا تھا اور کس طرح روکا تھا۔

بک ہا۔ نہ ہی پوچھے۔

”تھوڑا سا۔ اپنے ابو کی خاطر کیا اب مرے

ہوئے کی خاطر تم زندوں کو بھول جاؤ گی۔“ ایموشنل بلیک میلنگ۔ ماں باپ کا عظیم اور مشہور زمانہ ہتھیار۔

”ابو۔“ وہ تڑپ کر بولی تھی اور ذرا ملاحظہ

فرمائیے۔ وہ تڑپی کس بات پہ تھی۔ زندوں والی بات پہ؟

ارے نہیں۔ مرے ہوئے والی بات پہ۔

”میں کھانا کھا لیتی ہوں۔ مگر آپ اسے مرا ہوا نہ

کہئے۔ وہ زندہ رہے گا۔ میرے دل میں کچھ لوگ اس طرح سے مرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں۔“

”واہ۔ واہ۔“ جاوید صاحب عیش عیش کر اٹھے

تھے۔

اس کے فلسفے۔ نا معلوم کس ناول کا اثر تھا۔ چلو

جو بھی تھا۔ وہ کھانا کھانے پہ تیار ہو گئی تھی۔

اتنا ہی بہت تھا۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ صبح اکلوتی ہوگی یا پھر چارپانچ بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن ہوگی یا پھر یہ کہ وہ گھر بھر میں سب سے چھوٹی ہوگی۔

تو عرض یہ ہے کہ آپ کے سارے مفروضات غلط ہیں۔ صبح کی دو بہنیں اور تین بھائی تھے۔ اور وہ گھر بھر کی لاڈلی بھی نہیں تھی۔



عالم شاہ کی وفات کو پانچ چھ ماہ گزر چکے ہیں اور اب وہ کافی بہتر حالت میں تھکے کھاتی پیتی بھی ٹھیک ہے اور سوتی بھی ہے اور کبھی۔ کسی بات پہ ہنس بھی دیتی ہے۔ صد شکر کہ اس نے یہ ناول اپنی اشاعت کے کافی عرصے بعد پڑھا تھا۔

صبح کو یہ مطالعے کی لت اپنے ابا جان سے لگی تھی۔ ان کے گھر میں باقاعدہ ڈائجسٹ آتے تھے۔ ابا جان کالا بھری کارڈ بھی تھا۔ جو ان سے زیادہ صبح کے زیر استعمال تھا۔ اور اس کا اپنا کالج لائبریری کارڈ۔ وہ تو پوچھے ہی نہ۔ سال میں دو دفعہ بنتا تھا۔ ایک دفعہ تعلیمی سال کے آغاز میں اور دوسری دفعہ تعلیمی سال کے درمیان میں۔

اتوار بازار کا اسٹیشنل دورہ۔ صرف ناولز کی خاطر کیا جاتا۔ نہ صرف یہ وہاں آدمی قیمت پر رائے ناولز بیچ کر نئے ناول خریدے جاتے۔ یہ ابا اور صبح کی مشترکہ ہائی تھی۔ ابا کی گھر بھر میں اسی وجہ سے صبح سے ہی زیادہ بٹی تھی۔

وہ دونوں ہی محبت میں بچت کے ضرور ہی قائل تھے۔ واضح رہے کہ کتابوں کی محبت۔ آج کل اس کا دل پہلے کی نسبت کافی حد تک بہل چکا تھا اور وہ اک نیا ناول پڑھ رہی ہے۔ اور وہ بھی بھلا کون سا۔

”امرنیل“۔ ہا ہا۔

اور ابھی جب کالج دین اسے اس کے گھر والی لین کے باہر اتار کر گئی تھی۔ تو اس سے بالکل بھی صبر نہیں

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا باپ ہے اور کیسی بیٹی ہے۔ بیٹی کا تو خیر لڑکیوں کی اسی قوم سے تعلق تھا جو کہ ڈائجسٹ، ناولز وغیرہ پڑھتے ہوئے کھانا جلا دیتی ہیں، ہاتھ جھکسا لیتی ہیں، بچن کو ناولز پڑھتے ہوئے امی کی اہمہلی فار جیسی آواز بالکل بھی سنائی نہیں دیتی اور جب زور سے دھپ پڑتی ہے تو پھر پتا چلتا ہے وہ دور سے آئی آواز۔ اتنی بھی دور نہیں تھی۔

وہ ہی قوم۔ جو کہ ڈائجسٹ، ناولز کو اس طرح سے گم ہو کر پڑھتی ہے پاس سے بار بار گزر جائے۔ بعد ڈھول تاشے۔ شہاب ثاقب ٹوٹ کر گر پڑے۔ زلزلہ آجائے یا سیلاب بہہ جائے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

وہ ہی قوم جو کسی کالج کلاس فیلو حتیٰ کہ محلے فیلو کے

پاس موجود نیا ڈائجسٹ یا ناول دیکھ کر کسی سوڑھے جھسی بھکاری بن جاتی ہے۔ اور سونے پہ سہاگہ اس میں بالکل بھی شرم محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہی قوم جو کتابوں کے اندر ناول / ڈائجسٹ چھپا چھپا کر پڑھتی ہے، وہ ہی قوم جن کی رال چکن کڑائی، بریانی، شوارما یا کبابوں پہ نہیں ٹپکتی۔

وہ ہر اس ناول، ڈائجسٹ پہ لپکتی ہے جو کہ انہوں نے نہ پڑھا ہو۔

اور وہ ہی قوم جو کہ ناول، ڈائجسٹ کو اس طرح سے چٹ کر کے پڑھتی ہے کہ بیچاری دیمک شرمندہ ہو جائے۔

یہ ساری قوم ایسی ہوتی ہے کہ ”عالم شاہ میرا ہے“ والے جملے پہ آپس میں اس طرح سے لڑتی ہے کہ بات بال نوچنے کی نوبت تک جا پہنچتی ہے۔

اور وہ قوم۔ جو کہ ہیرو، ہیروئن کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو۔ پلا کسی توقف کے بہاتی ہے۔ ہاں تو۔ بیٹی تو ایسی ہی تھی اور ایسی قوم کی سردار کھلانے کا حق محفوظ رکھتی تھی۔ اور ابا جان؟

ہو رہا تھا اتنا بھی نہیں کہ وہ کھرہنچ جائے۔ کیونکہ وہ آخری صفحات رہتی۔

عمر جہانگیر کو گولی لگ چکی ہے اور محض گولی لگنے پر ہی وہ سارا دن کالج میں ضبط کر کر کے روٹی رہی ہے اور اب جبکہ وہ اپنے گھر کی طرف جارہی تھی تو۔

اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ”امریل“ برآمد کیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا

اور جب یہ یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا جو اسے دیکھ رہا تھا۔ سو وہ چلتے ہوئے ناول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اسے بڑھتے ہوئے اس طرح سے چلتی جا رہی تھی کہ سامنے کنکریٹ کی بنی دیوار بھی آجاتی نہ۔ تو اس میں سے بھی وہ پار گزر جاتی۔۔۔ ایویس ہی۔۔۔ بے دھیانی میں ہی سہی وہ بے حد آہستگی سے چل رہی تھی۔ کیونکہ وہ بے حد تیزی سے صفحات الٹا لٹ کر پڑھ رہی تھی۔

اور دور سے وہ ایسا پیارا لائق بچہ دکھتی تھی کہ جو امتحان ہال میں بس داخل ہونے ہی والا ہو اور جس کو دیکھتے ہی لڑکیوں کی اماں اور لڑکوں کے باپ اشارے کر کر کے اور طعنے دے دے کر اپنے اپنے بچوں کی مت مار دیں کیونکہ! ناول کے اوپر کور چڑھا ہوا تھا۔ اور وہ کسی فیکسٹ بک جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ ہا ہا ہا

ہاں! تو وہ ناول میں غرق ہو کر چلتی ہوئی تیزی سے صفحات الٹتی جا رہی تھی کہ۔۔۔ اچانک ایک زوردار آواز آئی۔ دھڑام۔ اور ناول اس کے ہاتھوں سے نیچے گرا تھا۔ اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کتاب پکڑنے کے سے انداز میں لیے ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

یہ ناقابل یقین تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی تھی اور سانس۔۔۔ نامعلوم وہ کدھر تھا۔ تھا بھی یا نہیں! کچھ بتا نہیں چل رہا تھا۔

وہ شدید صدمے میں تھی۔ جس کے بعد انسان پتھر ہو کر رہ جاتا ہے۔

اور وہ ایسے زلزلے کی زد میں بھی تھی جس کے بعد انسان ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ جاتا ہے بکھر جاتا ہے۔

مگر سوال اٹھتا ہے کہ کیوں؟
”عمر جہانگیر بھی مر گیا تھا۔“

آنسوؤں کا ریل تیزی سے آنکھوں کی جانب بڑھا تھا اور پھر آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے شفاف گالوں پہ بنے لگے تھے۔

سڑک پہ کوئی نہیں تھا۔ بخدا کوئی نہیں تھا مگر نا معلوم وہ کہاں سے آن وار دہوا تھا۔

”مس۔۔۔ خاتون۔۔۔ سنئے پلیز کیا ہوا؟ اتنی پرابلم۔۔۔

نیڈ ہیلپ ہیلو پلیز۔“

وہ اس کے پاس سے ہو کر گزر جانا چاہتا تھا مگر اس کی تشویش ناک حالت نے اس کے قدم ہی پکڑ لیے تھے۔

صبح نے اتنی آوازوں پہ۔۔۔ عجیب زومبی اسٹائل میں گردن گھما کر اسے دیکھا کہ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہوا تھا۔

”عمر جہانگیر۔۔۔ عمر جہانگیر۔“ ہچکیوں کا طوفان۔
”کیا ہوا عمر کو؟“ وہ بے چارہ سمجھا کہ عمر جہانگیر اس کا کوئی عزیز رشتے دار ہے۔ کوئی بھائی شالی اور اگر صبح کو اس کی اس سوچ کا پتا چلتا تو وہ سب کچھ بھلا کر کم از کم ایک کھونسا تو اسے ضرور ہی مارتی۔
”مر گیا۔۔۔ عمر جہانگیر بھی مر گیا۔“

اس قدر تڑپ اور تڑپا دینے والے انداز میں کہا گیا تھا کہ سامنے موجود شخص واقعی ہی تڑپ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نہایت ہی ہمدردانہ جذبات ابھرے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ بری طرح سے بوکھلایا تھا۔

”عمر جہانگیر مر گیا۔“ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے صبح جاوید کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح لہرا کر بل کھا کر گھٹنوں کے بل گری گئی۔

”میڈم! مس! دیکھیے سنبھالیے خود کو! آئیے! میں گھر چھوڑتا ہوں۔ دیکھیے کچھ تو بتائیے؟ یوں تو ایسے کسے؟ خدا را خود کو سنبھالیے۔ کہاں رہتی ہیں آپ؟
افوہ کیا کروں؟۔۔۔“

اور آخر میں کچھ بے چارگی سے اس نے ارد گرد

دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ محترمہ تو صرف عمر جہانگیر کو ہی روئے جا رہی تھیں۔

”مر گیا۔ ایسے کیسے مر گیا۔ ایسے کیسے چھوڑ گیا۔“

وہ روتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔

”دیکھیے۔ میں ایسے تو آپ کی ہیلپ نہیں کر پاؤں گا۔ سنبھالیے خود کو۔ کچھ تو۔“

مگر آج تو صبح جاوید نے جیسے نہ سنبھلنے کا عہد کر رکھا تھا۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور اس معصوم سے بیچارے سے شخص کو پریشان کیے جا رہی تھی۔

ہاں نا! وہ معصوم سا بیچارہ سا نعمان عابد۔



”یا اللہ! کیا کروں۔ کس سے پوچھوں اور کس کو بتاؤں؟ آخر کروں تو کیا کروں؟“

سخت پریشانی تھی اور قریب تھا کہ اسی پریشانی میں وہ اپنے ہی بال نوچ لیتا کہ۔ کہ اسے صبح کے بیک میں سے جھانکتا موبائل نظر آیا تھا۔ اس کے گرنے کی وجہ سے وہ پاکٹ سے تقریباً ”باہر ہی آگیا تھا اور بس گرنے کو بے تاب تھا۔“

نعمان نے ڈرتے ڈرتے اور جھجکتے جھجکتے اس کے بیک سے سیل نکالا۔ وہ اگر ہوش میں ہوتی تو اس حرکت پر ایک کھپڑ تو ضرور ہی مارتی اسے۔ آخر کچھ تو کرنا تھا۔ وہ اتنی پیاری سی لڑکی اور وہ بھی روتی ہوئی پیاری سی لڑکی کو۔ یوں چھوڑ کر چلا جاتا۔ سخت طعنہ تھا۔ بھی مروا نگلی پہ سخت طعنہ تھا۔ اس نے جلدی جلدی کانٹیکٹس کھولے اور ابو جان پہ رک گیا۔ خوش قسمتی کہ وہ لسٹ پہ ٹاپ آف دی لسٹ تھا۔ کال کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگائی اور سارا کچھ بتانے میں کال کرنے سے بھی زیادہ جلدی دکھائی دی تھی۔ اس کے ابو بھاگے بھاگے آئے تھے یہ لین میں آخر کھری تو تھا۔

”کیا ہوا۔ صبح میرے بچے۔ کیا ہوا؟“ پریشان ہونا بنتا تھا۔ وہ ہوئے بھی اور ہری طرح سے ہوئے۔

قریب تھا کہ وہ اتنے پریشان ہو جاتے کہ خود بھی رو پڑتے۔ انہیں اس شے پاس گری ہوئی کتاب نظر آئی تھی (تب تک وہ عمر عمر کا ورد کرنا بند کر چکی تھی) انہوں نے ایک نظر بلکتی ہوئی روتی سسکتی صبح پہ ڈالی اور دوسری اس کتاب پہ۔

”کسی نیسٹ شیسٹ میں فیل ہونے پہ یہ حالت تو نہیں ہوتی تھی۔ اس کی تو؟“

اک انہونی کے خیال کے تحت انہوں نے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ہٹایا اور۔ اور۔

ان کا دل چاہا اس قدر ”ہائے وائے“ مچانے پہ رکھ

کر صبح بچے کو تھپڑ دے ماریں مگر۔ کیا کرتے یہ بچہ ان کا اپنا ہی بچہ تھا۔

وہ اٹھے۔ اس کی حالت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے۔

”بیٹے! آپ کا بہت شکریہ! آپ نے واقعتاً مدد کی۔“ وہ اب اس سے ہاتھ مل رہے تھے۔

”کیا! عمر جہانگیر کوئی رشتے دار تھا۔ قریبی رشتے دار؟“ ہاتھ ملاتے ہوئے ایک نظر صبح پہ ڈالتے ہوئے افسوس سے ذرا سارک کر اس نے پوچھا تھا۔

”ارے۔!“ جاوید صاحب بے ساختہ ہنسے۔ ”کچھ نہیں بر خوردار۔ کچھ بھی نہیں بس خیر کبھی آتا گھر تو بتاؤں گا تمہیں کہ عمر جہانگیر کون ہے اور اب کون تھا؟ اسی لین میں رہتے ہو؟“

اس کا ہاتھ ابھی تک جاوید صاحب کے ہاتھ میں تھا اور وہ حیرت کے جھٹکوں کی مسلسل زد میں تھا۔ یوں جیسے فالٹ لائن اسی پہ سے ہو کر گزرتی ہو۔

بٹی کے عمل پہ باپ کا رد عمل کافی حیران کن تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ باپ حال احوال پوچھنے میں مگن تھا۔ وہ بے سہارا زمین پہ پڑی تھی۔ اور باپ اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

”یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے؟“

”جی۔۔ جی وہ رشید صاحب کا بھانجا ہوں میں ادھر۔“

”اچھا۔ اچھا سمجھ گیا۔ خیر ضرور آنا گھر تمہارا شکریہ چائے پہ ادا کروں گا۔“ وہ اب وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

”جی! میں آؤں گا ضرور آؤں گا۔ افسوس کرنے عمر صاحب کا۔ ابھی اجازت دیجئے۔“

اور بس اس کے کہنے کی دیر نہیں کہ۔

”ہاہاہاہ۔“ وہاں ایک جنائی قہقہہ ابل پڑا تھا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ اب کی بار جاوید صاحب قہقہوں کے خم غم کو روک نہیں پائے تھے۔

”آنا۔ بھی ضرور ہی آنا۔“

”جی۔ جی۔“ اور وہ بھاگ گیا۔ اب کی بار۔ واقعی

ہی میں۔ جی۔ جی کہتے ہوئے اور اس مہذب انداز میں کہ اس کا بھاگنا کم از کم بھاگنا نہ لگے۔

اس پہ سے توجہ ہٹی تو جاوید صاحب نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ اور ایک بے اختیار۔ اک رخ سانس ان کے منہ سے خارج ہوئی تھی۔

وہ اب بے حد تھکے تھکے سے انداز میں سک رہی تھی۔ یوں جیسے غم سے کہ کوئی تھک جائے اور رو رو کر آنسو خشک جائیں۔

”اس کو یہ کتاب دی کس نے؟ کتنا چھپایا تھا اس کو میں نے مگر۔ یہ کتابوں کی تو گویا ایسی دشمن ہے کہ خود کتابیں پناہ مانگتی پھریں اور لا حول کا ورد کرتی رہیں۔“

اس کے پاس بچوں کے بل بیٹھتے ہوئے۔ انہوں نے کتاب اٹھائی اور پھر اس کا بازو پکڑ کر اسے بھی اٹھایا تھا۔

سیل وہ پہلے ہی نعمان سے لے چکے تھے۔ جاوید صاحب نے تسلی کے سے انداز میں اسے ساتھ لگایا اور گھر کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

اور وہ؟

وہ ان کے کندھے کے ساتھ گھسٹتے ہوئے جا رہی تھی۔ اس کے دوپٹے کا کونا زمین پہ گھس رہا تھا اور وہ عمر جمائیکر کے غم میں ضوفشاں کی طرح غم زدہ دکھتی تھی۔

اس واقعے کو دو دن گزر چکے ہیں اور سب ہی بس بھائی (بظاہر) اس کے غم میں برابر کے شریک تھے (کیونکہ اگر اسے چھیڑنے کی غلطی کی جاتی تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے۔۔۔ جیسے آپ نے سیر کی کچھار میں منہ دے دیا ہو یا پھر بھڑوں کے چہتہ میں ہاتھ ڈال دیا ہو یا پھر یہ کہ ”آئیل مجھے مار“ والی بات کر دی ہو) گھر میں سوگواری کی فضا تھی۔

کھانے کا پائیکاٹ تھا اور کالج سے پورے ایک دن کی چھٹی کی گئی تھی۔ دوسرے دن کی ابو ہرگز ہرگز اجازت جو نہیں دیتے تھے مختلف بہانوں تمہارا دل

بہل جائے گا، تم اچھا محسوس کرو گی وغیرہ وغیرہ سے اسے بہلا کر پھسلا کر بھیج دیتے تھے۔ چاہے زبردستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے وہ چپ چپ۔۔۔ اداس اور ویران سی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں۔۔۔ کاجل بھی نہیں ڈالا گیا۔ پورے دو دن سے حالانکہ دو باتوں سے اس کی موت واقع ہونے کا شدید خطرہ رہتا ہے۔

نمبر ایک۔ اگر اسے پڑھنے کو کتاب نہ ملے۔
نمبر دو۔ اگر وہ آنکھوں میں کاجل نہ ڈالے (وہ بھی بیٹ مین اسٹائل میں)

ایسی سوگواری کی فضا میں اور خاموشی کے سے ماحول میں ایک چیختی ہوئی آواز بلند ہوئی تھی۔ نہیں نہیں۔۔۔ وہ صبح کی نہیں۔ وہ گھنٹی کی آواز تھی۔

دروازے پہ رشید صاحب بمعہ اپنے بھانجے کے موجود تھے۔ ذرا سا گھبراتے ہوئے اور بہت سا ریشان۔

”جاوید صاحب! خیریت ہے۔۔۔ بچہ بتا رہا تھا کہ کوئی فوٹگی ہو گئی ہے آپ کے کسی رشتے دار کی۔ کل سڑک پہ آپ کی پٹی۔“

شو مئی قسمت کہ دروازہ جاوید صاحب نے ہی کھولا تھا اور رشید صاحب انہیں دیکھتے ہی شروع ہو گئے تھے۔

جاوید صاحب نے کچا کھا جانے والے انداز میں

بھانجے کو دیکھا۔ وہ بے چارہ سا معصوم سا سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

”آپ اندر آئیے۔ پلیز اندر تشریف لائیے۔“

”ماموں آپ جا میں میں۔“

”ارے نہیں بر خوردار۔ تمہارا تو شکریہ ادھار ہے تم کہاں جا سکتے ہو۔“

اس سہمے ہوئے کو مزید سہایا گیا تھا اور کندھے سے پکڑ کر اس کی ”راہ فرار“ کی تمام کوششوں پہ ٹھنڈا پانی نہیں۔ برف کی بالٹی ہی گرا دی گئی تھی۔ پھر ہوا یوں کہ۔

رشید صاحب کو تو یہ کہہ کر رُخا دیا گیا کہ کوئی دور دراز کا رشتہ دار تھا۔ بس بچی خود پہ قابو نہیں رکھ سکی وغیرہ وغیرہ۔

اور معلوم ہے رشید صاحب نے جواب میں کیا کہا۔

”چلیے! جنازہ نہ سہی۔ فاتحہ خوانی ہی کر لیتے ہیں“ تو یوں وہاں ”عمر جماعت“ کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے۔ فاتحہ خوانی کی گئی۔

رشید صاحب تو فاتحہ پڑھ کر اٹھ کر چلے گئے اور فاتحہ خوانی کرتے ہوئے جو حالت جاوید صاحب کی ہو رہی تھی۔ اف۔ اب کی بار قہقہوں کا جم غفیر پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ تو اسے چائے کے ساتھ شکریہ ادا کرنے کے بہانے سے روک لیا گیا تھا۔

”بر خوردار! بات یہ ہے کہ۔“

پھر یہاں سے شروع کر کے۔ جاوید صاحب نے عالم شاہ سے ہوتے ہوئے ”عمر جماعت“ تک لاکریات ختم کی تھی۔ وہ آج کی جنریشن کا تھا۔ بات سمجھ سکتا تھا۔ اور اسے کلینر کر دیا تھا کہ آخر محترم عمر جماعت کون تھے؟

وہ دم بخود ہوا۔ ساکت ہوا اور پھر بے اختیار ہنس دیا۔ اور ہنستا رہا۔

”کمال ہے۔ کوئی اتنا بھی پاگل ہو سکتا ہے کیا؟“

”نہیں!۔“ جاوید صاحب نے بے ساختہ بخ

سانس بھرا (کیونکہ صبح کے معاملے میں صرف ٹھنڈے سانس سے کام نہیں چلتا تھا) ”نہیں اونٹنی دن نہیں۔“ اب کے اسے چائے پکڑاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا اور وہ نعمان عابد۔ وہ پھر سے بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اب کی بار ذرا تہقہہ لگا کر۔



وہ رشید صاحب کی علالت کی وجہ سے ان کے ہاں مقیم تھا۔ رشید صاحب کے بچے اب بھی چھوٹے تھے اور حال ہی میں وہ بالی پاس کے بعد بستر سے اٹھے تھے۔ اس وجہ سے ان کی بہن نے (جو کہ اسی شہر میں تھی) نعمان کو ان کے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ ان کے ہاں آئے اس کا پہلا دن تھا اور پہلے دن ہی ایسی کوئی ”حسینہ۔۔۔“ آکر ٹکرا جائے تو۔ دل کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ وہ آپ سمجھ سکتے ہیں؟

اور یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ روز اسی وقت گھر سے جا کے لیے نکلتا تھا جب اس کی دین آتی تھی اور بس۔ لیں جی! ہو گیا آغاز خاموش محبت کا گروہ جانتا نہیں تھا کہ یہ کس مصیبت کا آغاز ہوا تھا۔ وہ برے طریقے سے پھنسنے والا تھا۔ بے حد برے طریقے سے۔



”تمہارا رشتہ آیا ہے!“

اس سے پہلے کہ وہ خالصتا ”ہیروئن“ والی ”کیا؟“ ذرا چیخ نما آواز میں کہتی۔ اماں بول پڑی تھیں۔

”زیادہ ہیروئن بننے کی ضرورت نہیں ہے وہ بھی میرے سامنے۔ باپ کو دکھانا یہ چونچلے۔“ بے زاری سے کہتے ہوئے انہوں نے سخت انداز میں اسے گھورا تھا۔ صبح نے برا سامنہ بنایا تھا۔ سارے سین کا بیر غرق ہو گیا تھا۔

”کس کا ہے چوپو نزل؟“

”رشید صاحب کے بھانجے نعمان کا۔“

”کیا؟“ وہ اب اپنے کیا کو دبا نہیں سکی تھی۔ ”وہ تو

ذرا بھی ہیرو نہیں دکھتا۔ ”وہ بے چاری سی پچی۔ تڑپ کر رہ گئی تھی۔“

”جتنے بھی ہیرو ہیں نا! اب خیر سے۔۔۔ شادی شدہ ہو چکے ہیں۔ رہ گیا حمزہ علی عباسی تو وہ اب کیا تمہیں گھاس ڈالے گا؟“ اماں بھی تو آخر صبح کی اماں تھیں۔

”نی وی“ فلموں کے ہیروز کی بات نہیں کر رہی میں۔ ”وہ بد مزہ ہوئی۔“

”تو جن ہیروز کی بات کر رہی ہو نا تم، وہ بھی اپنی اپنی ہیروینوں (ہیروئن کی جمع کا اردو ورژن) کے ہیں۔“

تمہارا کوئی نہیں۔ کچھ تو مر مرا چکے ہیں اور جو بچے انہوں نے اپنی اپنی ہیروئنوں کو ہی سنبھالنا ہے تم کس کی آس میں ہو؟ کیا سالار امامہ کو چھوڑے گا۔ یا حیدر ایمن کو۔“ اماں کو سخت سی تپ چڑھی تھی۔

”اماں!“ وہ ٹھنکتی۔

”تمہارے ابو ہاں کرنے والے ہیں بس۔۔۔ کچھ کہنا ہے تو ان سے جا کر کہو۔“

”کیا۔۔۔؟“ یہ کیا اس طرح سے ادا کیا گیا کہ عرصہ دراز تک لوگ ”میرا“ کی ایکٹنگ بھلا کر اسے یاد رکھنے والے تھے۔



تو پھر یوں ہوا کہ۔

ابو سے بات کر کے اس نے نعمان سے ایک ملاقات کی اجازت لے لی تھی۔ اور وہ بھی۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ اکیلے میں وہ الگ بات کہ یہ ملاقات گھر کے ڈرائنگ روم میں ہونا طے پائی تھی۔ جس کے باہر اس کے سارے بہن بھائی کلن لگا کر تو ضرور ہی کھڑے ہوں گے۔

تو وہ دن آیا۔ ملاقات کا دن۔ نعمان خوشی خوشی تیار تیار ہو کر گیا تھا اور صبح نے مرے مرے ہاتھوں سے آنکھوں میں کا جل ڈالا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“

”کیسی ہیں آپ؟“

”کیسی لگ رہی ہوں؟“ اور وہ سٹپٹا گیا (اتنا بے باک سوال؟ نعمان کے خیال میں۔)

صبح نے اس کے سٹپٹانے پہ بے حد مایوس ہو کر اسے دیکھا تھا۔ یعنی کہ وہ ذرا بھی Daring نہیں تھا۔ ہیروز کی پہلی خوبی ہی ناپید تھی۔ ”آہ!“

”آپ نے ملنا چاہا تھا مجھ سے، پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“

”ہاں! ملنا تھا کیونکہ کچھ سوال کرنے ہیں مجھے۔“

”کون سے سوال؟“ نعمان حیران ہو رہا تھا مگر ابھی

تک اپنی حیرت یہ قابو پائے ہوئے تھا۔ ”جی پوچھیے۔“ اس طرح سے متکرا کر کہا گیا کہ جیسے کہتا ہو ”جی جان سے پوچھیے۔“ ”پوچھوں؟“

”جی جی ضرور۔“

”تیار ہو؟“

”بالکل۔۔۔ بالکل۔“ وہ سمجھ نہیں پایا۔ اپنی طرف

سے پوری تیاری کر کے آیا تھا وہ۔

”تو یہ بتاؤ اگر 15 کو 35 سے ضرب دی جائے اور پھر اس میں 95 جمع کر کے 12 ماٹنس کر لیا جائے اور پھر باقی رقم کو 2 پہ تقسیم کر دیا جائے تو کیا حاصل جواب ہو گا؟“

وہ منہ کھول کر صبح کو دیکھ رہا تھا۔ صبح بے طرح سے جھنجھلائی۔ ”بتاؤ نا۔!“

”ہاں۔“ وہ بوکھلایا اور بوکھلا کر بے ساختہ اپنی جیبیں کھنگالنے لگا تاکہ وہ سیل میں سے کیسلو لیٹر نکال کر حساب کتاب کر کے جواب دے سکے۔

صبح پہلے تو حیرت سے اسے دیکھتی رہی تھی مگر جب وہ سیل نکال کر حساب کتاب کرنے لگا تو۔۔۔ تو اس کے ارمانوں پہ ٹھنڈی برف کی بالٹی گر گئی تھی۔ نہیں کلیشیر ٹوٹ رہا تھا۔ حالانکہ کوئی بڑے فیکٹورز نہیں تھے، ساہ سی رقم تھی۔

”رہنے دو۔۔۔“ بے حد مایوسی سے کہہ کر اس نے سانس خارج کی تھی۔

اب ہر کوئی سالار سکندر تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہر کوئی آبادی کے 25% حصے کو Belong نہیں کر سکتا۔ صبح نے سالار کو لسٹ سے باہر نکال دیا تھا۔ پھر جیسے خود کو تسلی کی تھپکی دی۔

”میں کر دیتا ہوں۔“ نعمان نے یوں کہا کہ جیسے اس کے منہ سے نکلا ہر حرف ’حرف‘ لازم تھا۔

”نہیں رہنے دو بس!۔“ وہ بیزار ہوئی۔ ”اچھا! کرتے کیا ہو؟“

”ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتا ہوں۔“ ڈی فارمیسی کر رکھی ہے میں نے۔“

صبح تو اس جواب پہ رونے والی ہو گئی تھی۔ کتنی چڑھتی تھی نا اسے دوائیوں سے اور وہ تو حیدر مسعود کی طرح بزنس مین بھی نہیں تھا۔ اب یہ زیادتی تھی ایک کھلی زیادتی حالانکہ نومی بیچارے نے تو اپنی طرف سے اسے

امپیرس ہی کیا تھا۔

”ہاٹ؟“

”5-7“

ایک آدھ انچ کی کمی کے ساتھ اتنی ہاٹ تو اس کے ناولز کی ہیروئن کی ہوتی تھی۔ اور اب صبح دکھی ہونا شروع ہو چکی تھی۔ لیکن امید کا دامن بہر حال تھامے ہوئے تھی۔

”اچھا! اوکھے پینڈے لہبیاں نے رادواں عشق دیاں گا کر سناؤ۔“

اور اس بے چارے کا منہ دوسری دفعہ بے اختیار کھل گیا تھا۔ اب کی بار تھوڑا زیادہ ہی۔

”مجھے گانا نہیں آتا۔ میں تو باتھ روم سنگر بھی نہیں۔“ اس نے بے ساختہ تڑپ کر کہا تھا۔

لیس جی۔ ڈوب گئی۔ ڈوب ہی گئی صبح جاوید بحر رنج میں۔ تو وہ سعد سلطان بھی نہیں تھا۔

”یہ انتخاب ہے ابو کا؟“ وہ چند لمحے نم آنکھوں کے ساتھ اس انتخاب کو دیکھتی رہی۔ وہ کوئی ایک تو ہوتا اور

وہ بے چارہ اس کی نم آنکھوں کو دیکھ کر بوکھلا تا رہا۔ مگر پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

صبح نے کچھ سوچا۔ سر اٹھا کر اس انتخاب کو دیکھا۔ پھر کچھ دیر سوچا اور پھر سے اس انتخاب پہ نظریں جما دیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا کر بار بار بلا وجہ ہی گلا صاف کرتا رہا۔ چھٹی سے پہلو بدلتا رہا۔ مگر کہہ کچھ نہیں پایا۔

صبح نے ایک سب سے سانس بھرا اور پھر سے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

”قرض کرو میں اور تم شدید سردی کی رات میں کہیں باہر روڈ پہ ہیں کہ اچانک بارش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے صرف اک شال لی ہوئی ہے جبکہ تم نے جیکٹ پہن رکھی ہے۔ تو کیا تم مجھے سردی سے بچانے کے لیے۔ اپنی جیکٹ اتار کر دو گے؟“ بڑی ہی آس سے پوچھا گیا۔ دراصل اس کا رومانس لیول ”چیک کیا گیا تھا۔“

اور وہ نعمان عابد۔ جو ابھی تک اس کے سوالوں کے جواب ٹھیک طرح سے دے نہیں پایا تھا تو اب کی

بار اسے ایسا لگا کہ۔ وہ اسے ضرور ہی متاثر کر سکے گا۔

اب کی بار تو ضرور ہی۔ اس نے مسکرا کر اور قدرے دلچسپی سے صبح کو دیکھا۔

صبح کو بے اختیار ڈھارس ہوئی۔

”میں تمہیں کیوں جیکٹ دوں گا؟ میں تمہیں اتنی ٹھنڈ میں۔ صرف ایک شال میں باہر تھوڑی لے کر جاؤں گا۔ میں گھر سے نکلتے ہی تم سے کہوں گا کہ سویٹر پہن لو اور پھر بھی تم نے نہیں پہنا تو میں خود تمہارا سویٹر کیری کر لوں گا۔“

”ہو گیا رومانس؟ پڑ گئی ٹھنڈ۔ کھل گیا نامنہ؟“

صبح کے لیے بس یہ آخری دھچکا تھا۔

وہ کھلے منہ اور بے حد شاک کی حالت اور رنج و غم کی سی کیفیت کے ساتھ اس انتخاب کو دیکھ رہی تھی وہ تو اسے ایک جیکٹ دینے کا روادار نہیں تھا جاذب سلطان خاک بنتا۔

”مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔“ بالکل قطعی انداز میں اس نے نعمان سے کہا تھا۔

”کیوں؟“ وہ بے طرح سے گھبرایا اور پھر بول کھلایا۔
 ”تم سالار سکندر کی طرح ذہین نہیں ٹھیک ہے۔
 میں نے کمہر دما نز کیا۔ تم حیدر مسعود کی طرح بزنس
 مین نہیں۔ میں نے پھر بھی قبول کر لیا۔ تم سعد
 سلطان کی طرح گمانیں سکتے۔ اس اوکے۔ چلو اب ہر
 بندہ گا بھی نہیں سکتا۔ صبر شکر کر لیا میں نے۔ تمہاری
 ہاٹ اس کو تو میں نے آنکھیں بند کر کے نظر انداز کیا۔
 سمجھو کہ جبر کیا اور اب۔ اب یہ کیا؟ جاذب سلطان
 کی طرح کیا تم تو اس کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔“
 یہ واضح رہے کہ شرم کی وجہ سے وہ یہ نہیں کہہ پائی
 تھی کہ جاذب سلطان کی طرح رومانٹک ہے۔
 ”یہ قابل قبول نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ہرگز
 ہرگز بھی نہیں اور ابھی تو میں نے پرسنالٹی کی بات
 چھیڑی ہی نہیں یاد رہے۔“
 ایک ابرو اچکا کر۔ ذرا سی سنجیدگی اور بہت ساری
 خفگی کے ساتھ وہ تیکھا تیکھا بول رہی تھی۔ اور وہ جو
 اس کی بات اچھے خاصے موڈ میں سن رہا تھا۔ تو اب سنتے
 سنتے موڈ خراب کر چکا تھا۔



اسے لگا کہ شادی سے انکار ناول نہ پڑھنے کی بنیاد پر
 ہوا تھا اور اس جیسے آدمی کو محسوس بھی یہ ہی ہونا
 چاہیے تھا۔

وہ آدمی جو کہ اخبار کو بھی پورا ہفتہ لگا کر ختم کرتا ہو۔
 وہ کہاں سمجھ سکتا تھا ان ”فیلنگز“ کو جن کی بنیاد پر انکار
 ہوا تھا وہ سمجھتا تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی وجہ تو نہیں تھی
 کہ ختم نہ کی جاسکے۔

وہ اتنا تو ضرور ہی پڑھا لکھا تھا کہ اردو، بڑھ لیتا تو ناول
 کیوں نہیں؟ آخر کیوں نہیں۔ سو پہلی فرصت میں وہ
 ایک بک شاپ پہ چلا گیا۔ اور جاتے ہی اس نے بھلا کیا
 کہا۔ ملاحظہ فرمائیے۔
 ”السلام علیکم؟“
 ”وعلیکم اسلام۔“
 ”مجھے کچھ کتابیں چاہئیں۔“
 ”جی! کون کون سی۔ نام بتائیے۔“
 ”نام۔“ ”اے جھٹکا لگا۔“ ”وہ تو نہیں معلوم۔“
 اب کے جھٹکا کھانے کی باری دکان دار کی تھی۔
 ”آپ کتابیں ہی خریدنے آئے ہیں نا؟“ اس نے
 عینک کے اوپر سے اسے مشکوک انداز میں گھورا تھا۔
 ”ہاں۔۔۔ لینی تو کتابیں؟ آ۔۔۔ ہاں نہیں ناول ہیں۔۔۔
 بڑبڑلاتے، بڑبڑلاتے وہ یکدم پُر جوش ہو کر بولا تھا۔
 ”او بھائی۔۔۔ ناول بھی بنانا نام کے نہیں ہوتے۔“

رقیب، ایک بھی ہو تو وہ ”روسیا“ کہلاتا ہے اور
 یہاں تو رقیبوں کی ایک فوج جمع تھی۔ مرد بچہ تھا، موڈ تو
 بگڑنا ہی تھا۔
 ”کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ یہ ”سالار سکندر“ حیدر
 مسعود، ”سعد سلطان“ اور ”جاذب سلطان“ کون
 ہیں؟“

(لیس جی!۔۔۔ خود ہی ماری۔۔۔ اس مرد بچے نے اپنے
 ہی پاؤں پہ خود ہی کلہاڑی ماری)
 ”تم ناول نہیں پڑھتے؟“ اس تکلیف کے ساتھ
 بوجھا گیا تھا کہ جو تب محسوس ہوتی ہے جب پیٹ میں
 گھونساڑتا ہے۔ اور وہ بھی بہت زور کا۔
 ”نہیں۔۔۔“ وہ بے ساختگی میں بول اٹھا۔۔۔ ہا ایک
 اور کلہاڑی۔

”آآآ۔۔۔“ اور بس اس کا منہ ”آ“ کے انداز میں
 ہی کھلا رہ گیا تھا اور وہ ہاتھ کی انگلیاں اس کھلے منہ پہ

دکان دار اب کے ذرا بیزار ہوا تھا۔ یہ کیسا کتابوں کا شوقین تھا؟

”اچھا!“ اس کا منہ لٹک گیا اب کیا حوالہ دے؟
ہاں۔ ہاں۔ وہ نام کون سے نام تھے جو صبح نے لیے تھے۔

”حیدر سلطان۔ سالار مسعود جازب سکندر اور سلطان سعد یا پھر شاید سعد سلطان۔ ان۔ ان۔ ناموں والے ناولز ہیں؟“

رک رک کر اور سوچ سوچ کر بولتے ہوئے وہ دکان دار کے لیے ایک لطیفہ بن رہا تھا۔ چلتا پھرتا اس نے بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کیا تھا۔ اس نے مطلوبہ ناولز اس کے سامنے رکھنے شروع کر دیے تھے۔

آخر تو وہ بک سیلر تھا کیا اتنا بھی نہ جانتا۔ ناموں کی گزیر ضرور تھی۔ مگر آخر کو وہ بک سیلر تھا۔

”لیس جی! اب کے نعمان عابد صاحب کا منہ ہو نقول کی طرح سلوموشن میں کھلنا شروع ہو چکا تھا۔ اور ایسا بھلا کیوں ہوا؟“

ان ناولز کی ضخامت کو دیکھ دیکھ کر

”محبوبہ کے لیے لے رہے ہو؟“ دکان دار نے اس ناولز کے بنڈل کے اوپر ہاتھ رکھ کر ذرا سے چھیڑنے کے سے انداز میں پوچھا۔

”جی۔۔۔؟“

”یا پھر یہ کہ محبوبہ کی محبت میں لے رہے ہو؟“ اور اب کی بار وہ بیچارہ ”جی“ کہنے لائق بھی نہ رہا تھا۔ کھسیا کر والٹ سے پیسے نکالنے لگا تھا۔

اور پیسے ادا کرتے ہوئے اس کی چھین نکل گئی تھیں۔ وہ اب بک لور تھوڑا ہی تھا جو کہ ہنس کر کتابوں کے لیے جیب خالی کر دیتا۔ کتاب خریدنا اس کے لیے دنیا کا سب سے غیر ضروری کام تھا ان ناولز کا بل اسے کراہنے پہ مجبور کر رہا تھا اور وہ اپنی کراہوں پہ قابو پانے پہ مجبور ہو رہا تھا۔ آخر کو محبت جیسی واردات جو ہو چکی۔

تو قارئین کرام۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ۔۔۔ وہ شخص جو ایک دن کے اخبار کو پورا ہفتہ لگا کر ختم کرتا ہو۔ کسی ایسے شخص کو وہ چند ناولز پڑھنے پڑ جائیں تو اس کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

اسے اس کام کے لیے کئی سال درکار تھے اور اگر وہ کئی سال لگا دیتا تو صبح جاوید اسے کیا ملتی؟ ہاں البتہ! اس کے بچے ضرور اسے ماموں کہہ کر پکارتے تو اسے یہ کام کرنا تھا اور چند دنوں میں ہی کرنا تھا۔

اس نے شروعات چائے کے بالٹی جیسے بھرے کپوں سے کی تھی۔

افاقہ؟

چچ چچ۔۔۔ نہیں ہوا۔

دوسرے سے تیسرے صفحے پہ ہی جمائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔۔۔ چوتھے پہ آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ پانچویں پہ الفاظ اس کے سامنے کتھک ڈانس پیش کرنے لگتے اور چھٹے پہ بس جی۔۔۔ چھٹے صفحے پہ وہ ڈھیر ہو جاتا۔ صبح کو یا تو وہ کتاب کے اوپر پایا جاتا یا پھر کتاب اس کے اوپر۔ ”پھر چائے کو

موقوف کر کے کافی کے مک شروع کیے گئے۔“

افاقہ؟

”چچ چچ۔۔۔ کیسے ہو سکتا بھلا؟“

اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے تو وہ وقتاً فوقتاً آزما تا ہی رہا تھا۔ وہ یہ بھی کر چکا کہ سردی میں نہا کر ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ کر پڑھنے لگا مگر دوسرے دن ہی بخار اور زکام۔ اب بس یہ ہی ٹوٹکا رہ گیا تھا کہ وہ سر کے بالوں کو رسی کی مدد سے پنکھے سے باندھ لیتا۔

ظاہر ہے۔۔۔ وہ اب ایسا نہیں کر سکتا تھا تو؟

تو یہ کہ زندگی میں پہلی بار وہ رونے پہ مجبور ہوا تھا۔ اسے مطالعے کی عادت تھی اور نہ ہی اس نے نصاب کی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب پڑھی تھی اس میں وہ حس ناپید تھی جو کہ کتاب پڑھنے پہ مجبور کرتی ہے۔ صبح جاوید سمجھیں تو اللہ ہی پوچھے۔ تم نے کیسے مرنے کو روئے؟ یہ مجبور کر دیا۔“



ایسا تو ڈی فارمیسی کی کتابوں نے اس کے ساتھ نہیں کیا تھا اور یہ حال تو لمبے لمبے اوکھے اوکھے سے فارمولاز نے بھی نہیں کیا تھا جو یہ ٹائٹل اس کے ساتھ کر رہے تھے۔

تب اس کا دل چاہتا۔ لات مارے اپنی محبت پہ۔
گولی مار کر اپنے ہی سینے میں دفن کر ڈالے۔
اور بھول جائے صبح کو اور شام کر ڈالے اپنی ہی زندگی کی۔

مگر اب کہ وہ صبح، جیسی صبح! جو کہ روز صبح اس کے راستے میں کسی کالی بلی کی طرح آجاتی اور اس کے ہر پلان ہر عہد کا ستیاناس کر کے رکھ دیتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی اور دل کسی بڑے ہی برے ضدی بچے کی طرح ایڑیاں مار مار کر رونے لگتا۔ ایسا ضدی بچہ جو لالی پاپ سے بھی نہ بھلتا ہو تو پھر

کبھی کتاب اس کے اوپر پائی جاتی تو کبھی وہ کتاب کے اوپر پیا جاتا تھا۔



اور پھر قارئین!

اس نے وہ معرکہ مارا کہ آج تک کسی ہیرو، کسی عاشق کسی مجنوں، کسی فریاد، کسی دیو داس نے نہ مارا ہو گا۔ یہ تخت چھوڑنے سے بھی مشکل تھا اور اس کے بجائے وہ نہر آسانی سے کھود لیتا۔ محبت میں اس نے ٹائٹل کی ایک کثیر تعداد حفظ کر ڈالی تھی۔

محبت ہو تو ایسی۔ عاشق ہو تو ایسا۔ ناممکن کے نا کو ہٹا دینے والا۔

اس کا یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ جان گیا۔ کہ حیدر، سلار، جاذب اور سعد کے اباؤں کا نام کیا کیا تھا؟

مگر نقصان بھی ہوا۔ اور وہ یہ ہوا کہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کون سی فہلنگز تھیں جن کے تحت اسے انکار ہوا تھا۔ وہ جتنے اور ٹائٹل پڑھتا اس کا غصہ، جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ ٹائٹل لکھنے والوں میں ایک کثیر تعداد

خواتین کی تھی اور وہ ڈائجسٹ کی دنیا سے بھی نا بلند نہیں رہا تھا۔

اور بس۔۔۔ یہ وہی وقت تھا جب نعمان علیہ عرف مصنفین کا مارا اور ہیروز کا ستایا ہوا۔ ایک خط لکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اور کس طرح سے غصہ نکال سکتا تھا۔ وہ یہ ہی کر سکتا تھا۔ سو اس نے وہ ہی کیا۔ اس کیفیت میں۔۔۔ وہ کیفیت جو کہ انسان کو خود کشی پہ مجبور کر دیتی ہے۔

اور ادھر صبح کے گھر میں کیا ہو رہا تھا بھلا؟ اماں کا غصہ اس سوانیزے پہ تھا کہ جس کے بعد قیامت کا آنا اٹل تھا۔

وہ ابابھی تھے جواب تک انہیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ تو اسے مار مار کر سارا ہیرو نامہ، ٹاک کے راستے باہر نکال دیتیں اور اباب۔ وہ اسے سمجھانے، پچکارنے اور منانے میں مصروف تھے۔ اور اس کو شش میں تھے کہ جلالی اباؤں والی ٹرک انہیں آزماتا نہ بڑے۔

مگر یہ صبح! اس کا ایک ہی رونا تھا۔ مجھے سالار، حیدر، سعد، جاذب جیسا کوئی ہیرو چاہیے (عمر جہانگیر اور عالم شاہ کا نام وہ مر کر بھی نہ لیتی۔ اسے بھری جوانی میں بیوہ ہو جانا منظور نہیں تھا)

اور پھر ایک دن کیا ہوا کہ۔۔۔
انہوں نے بڑے مان سے (اور کچھ جذباتی اداکاری کرتے ہوئے) اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا۔
”صبح! تمہیں لگتا ہے کہ تمہارا باپ تمہارے لیے کسی غلط آدمی کا انتخاب کر سکتا ہے؟ ہو لو بچے! کیا ایسا کر سکتا ہوں میں؟ (وہ بھی آخر صبح کے ابو تھے جھمی) اور بس۔

جذباتی ہوتی ہیں ٹائٹلیں اور وہ جو جذباتیت کا چلتا پھرتا اشتہار تھی، کیسے نہ مانتی۔
اتنے مان سے جو ہاتھ اس کے سر پہ دھرا ہوا تھا۔ کیسے ہٹا کر اسے کیسے جھٹک دیتی آخر کو وہ جذباتیت کا ایک اشتہار تھی۔ وہ بھی چلتا پھرتا ہوا۔



تو قارئین۔۔۔ پھر سب کچھ سیدھا ہوتا چلا گیا تھا مگر شادی سے ایک ماہ پہلے۔۔۔ نعمان جاوید صاحب کے پاس آیا تھا اور اس نے جو کہا اس پر جاوید صاحب منہ کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”کیوں بر خور دار۔۔۔ یہ کتابی سی خواہش تمہیں کیوں محسوس ہونے لگی؟“ وہ ذرا خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ وہ مسکرایا۔

”آپ بھول رہے ہیں ایسی کتابی خواہشات آپ کی بیٹی کو لاحق ہیں۔۔۔ وہ ایسی خواہشات کہ ہر خواہش پر اس کی نہیں مجھ بے چارے کی ”آہ“ نکلتی ہے۔ آپ نکاح کر دیں۔ اس کی کچھ خواہشات تو پوری کر سکوں میں۔ اور دین و دنیا کا اعتراض بھی ختم ہو جائے۔“

اب کی بار وہ مرد بچہ۔۔۔ ذرا سا بے چارہ بچہ بنا تھا۔ اور جاوید صاحب نے خوش ہو کر اسے دیکھا تھا۔ ان کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ بالکل بھی غلط نہیں تھا۔



مورخہ یکم جنوری 2015ء۔

موسم۔ طاہر ہے سردی کا
وقت۔ رات دو بجے کا

موسم کی کیفیت۔ انتہائی شدید ٹھنڈ۔

ایسے میں رات دو بجے نعمان کا فون گدھے کی طرح بولنا شروع ہوتا ہے۔ وہ نیند میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا ہے مگر موبائل پھر بھی نہیں ملتا۔

وہ اپنی کوشش موقوف کر کے سونا چاہتا ہے مگر جب گدھا نہیں آپ کے کان کے نیچے ڈھینچوں شروع کر دے تو کیا آپ سو سکتے ہیں؟ یقیناً ”نہیں“ سو سکتے۔

”ہیلو؟“ نیند کے نشے میں ڈوبا ہیلو۔ جو کہ نعمان کی طرف سے ادا ہوا تھا۔

”سنو۔“

”کون ہے؟“

اور کون نے بے حد خفگی سے فون کو کان سے ہٹا کر

گھورا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو فون کی پہلی بیل پہ ہی جان جاتا۔ مگر یہ فارمولا جیسا ڈل آدمی۔ ہونہ۔

”صبح بول رہی ہوں۔“ اس نے منہ پھلا کر کہا۔

”ہائیں۔۔۔ صبح۔۔۔ خیریت۔۔۔ اس وقت گھر پر سب

ٹھیک ہے۔ انکل تو ٹھیک ہیں۔ کیا آئی ٹھیک نہیں؟“ ہڑبڑا کر کیے جانے والے سوال۔

ہو گیا نابیرا غرق۔ سارے رومانس کا۔ صبح جی بھر کے بد مزہ ہوئی مگر حسب عادت ہمت نہ ہاری۔

”سب ٹھیک ہے۔ کیا تم میری بات سنو گے؟“

”ہاں بولو؟“ اور اب تک نعمان کافی حد تک جاگ چکا تھا۔

”ابھی کیا تم مجھ سے ملنے آ سکتے ہو؟“ اور اس

فرمائش پر وہ بے ساختہ کراہا۔

”صبح یار! بہت ٹھنڈ ہے باہر۔۔۔ 3 پہ پہنچا ہوا ہے

ٹمپرچر۔۔۔“ بے اختیار وہ منمنایا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کی کتابی ٹائوٹھی فرمائشیں پوری کرنی ہیں۔

”تم۔۔۔“ صبح نے دانت پیس کر کہا اور فون شیخ ڈالا

تھا۔ اور اب وہ رو رہی تھی۔ زار و قطار۔۔۔ یہ تھا اس کا ہیرو جو کہ اپنی منکوہ کی ذرا سی فرمائش نہیں پوری کر سکتا تھا۔

آہ! کہ اس کی فرمائشیں۔



مورخہ 2 جنوری 2015ء۔

موسم۔ ٹھنڈ

وقت رات دو بجے کا

اور حالت موسم۔ شدید سردی۔

اس کا موبائل الارم کی طرح اوچی آواز میں بجنے

لگا۔ اس نے نیند میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ سیل کو نہیں ملنا تھا۔ نہیں ملا۔

سیل فون ڈھونڈنے کی کوشش موقوف کر کے اس

نے سونا چاہا تو۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا بھلا جبکہ سیل فون

کان کے نیچے الارم کی طرح۔ خیر اس نے فون اٹھایا اور

نیند میں ڈوبی آواز میں بولی۔

ادائے دلربائی پہ وہ ”ننا“ ہی تو ہو لیا تھا۔

”ہیلو!“

”تم سوئی ہوئی ہو۔؟“ دوسری طرف سے دنیا کا

سب سے احمقانہ ترین سوال پوچھا گیا۔

”ہاں! سو رہی ہوں۔“ اور پہلی طرف سے پوری

کائنات کا بے تکا ترین جواب دیا گیا۔

”وہ کل تم نے کہا تھا کہ تم سے ملنے آسکتا۔“

”چلو کوئی بات نہیں پھر سہی۔“

اور صبح کے پورے کے پورے چوہہ طبق روشن ہو

گئے تھے۔ وہ کل کی خواہش آج پوری کر رہا تھا اور اگر

اسی طرح ہوتا رہا تو۔ ہو گئیں ساری حسرتیں پوری۔

بے ساختہ وہ تلملائی تھی۔

”تمہیں آج یاد آیا ہے۔“ وہ صبح میں ”غرائی“ ہی

تھی۔

”کل تو میں سو رہا تھا۔ مشکل تھا نکلنا۔ آج میں

اسی لیے جاگ رہا تھا۔ تم نے فون نہیں کیا تو۔ میں

نے کر لیا۔ سوچا پوچھ لوں میں آؤں؟“

ہائے ایسی معصومیت کہ صدقے واری ہو جانے کو

دل چاہئے پہلے تو صبح کو غصہ آیا مگر جب اس نے کہا کہ

”میں آؤں۔“ تو صبح اس کے اس انداز پہ فدا ہوتے

ہوتے جی تھی۔ وہ اس کے لیے جاگ رہا تھا۔ محض

اس لیے کہ کل اس نے فرمائش کی تھی۔ وہ بے ساختہ

ہی مسکرائی۔

”سوچ لو۔ ٹھنڈ ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ ٹھنڈ نے کیا کہتا ہے۔“

”نمونہ نہ ہو جائے تمہیں؟“ اس نے چھیڑا۔

”اچھا ہے! تمہاری محبت کا اور تمہاری محبت میں

مارا کھلایا جاؤں گا۔“

”بکو اس نہیں کرو۔ تم کوئی عالم شاہ تھوڑے ہی ہو۔“

پتا نہیں کیوں مگر۔ اسے یوں اس کا مرنے مارنے

کا ذکر کرنا اچھا نہیں لگا۔

”تو میں۔ آؤں؟“

”صبح نے تمہیں۔ تمہارے لیے معاف کیا۔“ وہ کھٹکھٹائی

اور وہ فنا ہو گیا۔ اس انداز۔ اس ادا پہ اور اس

☆ ☆ ☆

وہ اگلے روز اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ ابا جان سے

اسے ساتھ لے جانے کی اجازت لینے۔ صبح کو وہ پہلے

ہی مطلع کر چکا تھا۔ وہ انتظار میں بہت ہی بری طرح

سے چکر کاٹ رہی تھی اور جیسے ہی اجازت ملی۔ وہ یہ جا

۔۔۔ وہ جا۔

اماں سکتے کے سے عالم میں اس کی بے حیائی ملاحظہ

کرتی رہ گئیں۔

”ایسی تو تربیت نہیں کی تھی میں نے۔۔۔“ وہ چڑکر

بولیں۔

ابا ہنس پڑے اور بہن بھائیوں نے وہ جملے کہے کہ

الاماں۔

نومی نامعلوم کس دوست کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔

سب اس کی توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔ گاڑی میں

دھیمے سروں میں بچتا میوزک۔

اس کے کلون کی مہک۔

اس کی جذبے لٹاتی بلکہ اڑاتی نگاہیں۔ بہترین ڈنر

سوٹ۔ یہ بھی نامعلوم کس دوست کا تھا۔ لیون پہ

ٹھہری دل خوش سی مسکراہٹ۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔

ہائے! کتنے ایسے خواب تھے جو ہر رات اسے آیا

کرتے تھے۔

مگر یہ کیا تھا؟ جو حقیقت ہونے کے باوجود خواب کا

ساماں باندھ رہا تھا۔ حسرتیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں

بھلا؟

سب ہیروئیز سے بالاتر محسوس کیا تھا خود کو بے

اختیار اسے اپنے آپ پر رشک آیا اور اس نے نعمان

کو دیکھا بڑے ہی پیار سے اور۔ اور یا حیرت۔

نعمان عابد کے چہرے پہ اسے کبھی سالار کا گمان

ہوتا تو کبھی حیدر۔ کبھی اسے وہ جاذب لگنے لگتا تو کبھی

سعد۔

یا حیرت! یہ بھی ہونا تھا۔ وہ بے دھیانی میں دیکھے

گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

نعمان نے مسکرا کر اسے ذرا شرارت سے دیکھا اور وہ بری طرح سے سرخ ہوئی تھی۔

وہ گاڑی سے اتر اور گھوم کر اس کی طرف آیا تھا۔ اور صبح وہ مسمرانہ ہو کر سیدھے ہاتھ پہ گال نکائے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت پنٹ کے اوپر V گلے والا سویٹر پہنے ہوئے تھا اور اچھا لگ رہا تھا۔ معمول سے زیادہ۔

اس نے صبح کی طرف کا دروازہ ذرا سا جھکتے ہوئے کھول کر ہاتھ سے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ یوں جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، شوہر تھا۔ ہائے اللہ وہ مری تو گئی تھی۔

صبح لال سرخ ہوتی باہر نکلی تھی۔

نعمان نے گاڑی لاک کی اور اس کے ساتھ چلنے لگا کہ اچانک۔

”ذرا شہو محترمہ! آپ کو میری جیکٹ پہننے کا بہت شوق تھا نا سو میں نے ایک جیکٹ گاڑی میں رکھی ہے۔“

وہ اس کی شال کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اور صبح کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ الگ سے جیکٹ لے کر آیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے کہا ”تمہیں میری جیکٹ پہننے کا بہت شوق تھا نا۔“

اور جب جیکٹ لا کر وہ اس کے کندھوں پہ ڈالنے لگا تھا۔ اف اسے لگا کہ آسمان پہ آتش بازی عین اسی وقت شروع ہوئی تھی۔ اور کتنی ہی گھنٹیاں بچ بچ اٹھی تھیں۔

”میں یہ والا سویٹر نہیں اتار سکتا ڈیر! پھر یاں جو خراب ہو جائیں گے۔“

اس کے کندھوں پہ جیکٹ ڈالتے ہوئے وہ جھک کر کہہ رہا تھا اور وہ اس بات پہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اسے ذرا بھی تو برا نہیں لگا تھا۔

سب اچھا ہی اچھا دکھ رہا تھا اور اچھا ہی اچھا محسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھی۔

ڈنر کے بعد وہ اسے گھر کے باہر اتار گیا تھا اور جب وہ ذرا سی مدہوشی میں گنگنائی ہوئی مسکرا مسکرا کر پرس

کی چین کو انگلیوں پہ لپٹتی کھولتی ہوئی۔ انگلی کو شرما شرما کر دانٹوں کے نیچے دبائی ہوئی۔ لڑکھڑا کر بے ترتیب چال سے چلتی ہوئی۔ اندر آئی تو آتے ہی۔ آتے ہی اماں کی چپل کا وار سیدھا اس پہ ہوا تھا۔ جو کہ اس کے آنے کی ہی منتظر تھیں۔

وہ ہڑبٹائی اور سارا نشہ ہرن۔ (یہ ہر قسم کا نشہ ہرن کرنے کا آزمودہ نسخہ ہے۔ ساری مایا میں جان لیں۔) ”اف۔۔۔“ اگلا احساس تکلیف کا تھا۔ وہ اب تلملا کر اپنا بازو۔ دبا رہی تھی اور اماں کو خفگی سے دیکھ رہی تھی۔

”غضب خدا کا گیارہ بجنے کو ہیں۔ حد ہی ہو گئی بے شری کی۔ کیا سوچتے ہو گے کالونی والے۔ یہ تربیت کی ہے بچی کی۔“

”شوہر کے ساتھ گئی تھی۔ کسی ایرے غیرے کے ساتھ تو نہیں۔“ اور بچی نے آنکھوں میں آنسو بھر لانے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔ مگر اماں ان کی خشک سالی کو بھانپ چکی تھیں۔ آخر کو اماں تھیں۔ وہ بھی۔

”صبح! کیوں مجھے بے عزت کروانا ہے۔ ایسی تربیت کی ہے میں نے تمہاری؟“ اماں نے اب کے ذرا کے نرمی سے کہا تھا۔

”بے عزت ہونے والی کیا بات ہے اماں! اجازت لے کر گئی تھی نا۔ آپ دونوں کی کوئی غلط کام تو نہیں کیا نا میں نے۔ ہاں! دیر ہو گئی۔ اس کے لیے سوری۔“

پیار سے بات کرتے وہ ان تک آئی تھی اور ان کے سامنے جا کر دونوں کان پکڑ لیے تھے۔ اماں چند لمحے خفگی سے اسے دیکھتی رہیں۔ یوں جیسے کہ چپک کر رہی ہوں کہ اس کی بات میں کتنا ڈرامہ تھا۔

”آئندہ اتنی دیر نہ ہو۔“ پھر خفگی سے کہتے ہوئے چلی گئیں ان کے جاتے ہی اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔ سارا مزاکر کر اہو گیا تھا۔ مگر چلو کوئی بات نہیں۔ سلسلہ تصورات۔ وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مدہوشی تو اب طاری نہیں ہو سکتی تھی کہ ”چپل زدہ“ مقام ابھی تک دھک رہا تھا۔ تو مسکراتی ہوئی گنگنائی ہوئی پرس کی چین کو انگلی پہ لپٹتی کھولتی ہوئی۔

99

محبت میں اس طرح کے کام بھی کسی نے کیے ہوں

گے بھلا؟

وہ پاگل سی۔۔۔ صبح جاوید۔۔۔

اور وہ۔۔۔ اس کے لیے پاگل سا نعمان عابد۔

☆ ☆ ☆

تو مہندی والا دن آگیا۔

وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے خود پہ پر فوم اسپرے کر رہا

تھا کہ اچانک اس کا سیل فون بول اٹھا تھا۔

اس نے اٹھا کر دیکھا تو۔۔۔ تو صبح کی کال تھی۔

”صبح کانگ“ کے الفاظ دیکھ کر اس کی سانس جہاں

تھی وہیں پہ رک گئی تھی۔ یہ ہرگز ہرگز بھی نیک شگون

نہیں تھا۔ اس وقت یہ کال۔

”ہیلو!“ ذرا محتاط انداز میں کہا گیا۔

”کیا کر رہے ہو۔“ دوسری طرف سے شوخ انداز۔

”تیار ہو رہا تھا محتاط لہجہ برقرار تھا۔

”اچھا!“ وہ بلا سبب کھلکھلائی۔ اور وہ بلا سبب

”سہم“ کر رہ گیا۔

”سنو!“

”بولو!“

”کیا تمہارا دل نہیں چاہ رہا کہ مجھے اس پیلے رنگ

میں دیکھو۔ قسم سے بڑا بیچ رہا ہے مجھ پر اور میرا دل چاہ

رہا ہے کہ سب سے پہلے تم دیکھو مجھے۔۔۔ دو سرا کوئی

بھی نہیں۔“

”ہو گیا نا وقوع پذیر۔۔۔ برا شگون۔“ اس نے تھک

کر سانس خارج کی کہ اب سانس لینے میں کوئی

مضائقہ نہیں تھا۔

”صبح! ڈیر ابھی تھوڑی دیر بعد آنا تو ہے نا میں نے۔۔۔

تو تب دیکھ لوں گا نا۔ دیکھو“ آج کے دن۔ اچھا تو

نہیں لگتا نا۔ اور پھر میں کس بہانے سے اکیلا آؤں گا

اور کس طرح سے گیٹ سے اندر داخل ہو پاؤں گا۔ کیا

یہ کہہ کر صبح سے ملنا ہے۔ کتنی بری بات ہے نا۔؟

تمہاری اماں تو میری ہڈیوں کا سوپ بنا کر پیش کر دیں گی

اس ایک ماہ میں اس نے پوری کوشش کی تھی صبح کی

ہر ٹاولنی خواہش کو پورا کرنے کی۔ وہ جتنے پھول اسے

بجھوا سکتا تھا۔ اس نے بجھوائے حالانکہ ایسا کرتے

ہوئے اسے آئی (صبح کی امی) سے سخت شرم محسوس

ہوتی تھی مگر۔

یا تو وہ شرم رکھ لیتا یا پھر ”صبح جاوید۔“

مہنگی مہنگی امپورٹڈ چاکلیٹس (جو اس نے خود بھی

کبھی نہ کھائی تھیں) وہ اسے گفٹ کر چکا تھا۔

اور ٹاول۔ اس کا تو پوچھو ہی نا۔ وہ اتنے ٹاول

خرید کر اسے دے چکا تھا کہ بس دیوالیہ ہونے کو

تھا۔

اعلا سے اعلا ریسٹورنٹ میں اسے لے کر جا چکا تھا۔

مگر یہ کام اس نے ایک دوبار سے زائد نہیں کیا تھا۔

واضح رہے۔

کتنی ہی دفعہ ٹھنڈ میں اس کے ساتھ آؤں کریم

کھانے کے بعد وہ ”زکام“ کو بھگت چکا تھا۔ اور یاد

رہے کہ یہ نوی کے لیے مارے توڑ لانے سے زیادہ

مشکل کام تھا۔ اور اس پہ ستم یہ ہوا کہ۔۔۔ صبح محترمہ کی

برتھ ڈے بھی اسی ایک ماہ میں آئی تھی۔

صبح نے بذات خود ٹھنک ٹھنک کر اسے بتایا تھا اور

اس طرح سے بتایا تھا کہ وہ جان گیا برتھ ڈے کتنا

اسجیٹل ہونا چاہیے اور رومانٹک بھی۔

وہ بے ساختہ گرا ہوا تھا۔ بھی ویڈنگ ڈے باقی تھا۔ وہ

سوچ کر مزید کرا رہا۔

مگر اپنی تمام کراہوں کو دباتے ہوئے اس نے صبح

کے لیے بے حد خوب صورت سونے کی نازک سی

رنگ خریدی تھی۔ جو کہ برتھ ڈے والے دن اس پر

اور چاہ سے پہنالی گئی تھی کہ بے اختیار صبح جاوید عیش

عیش کرا بھی اور پھر سے اس پہ نذا ہوتے ہوتے پکی

تھی۔

محبوب کے کسی نے ایسے بھی نخرے اٹھائے ہوں

پھولوں سے الرجی ہے۔

”ہا۔۔“

لیس جی۔۔ وہ دلہن بھی دوستوں کے جھرمٹ میں آ چکی ہے۔ اور اس کو دیکھ دیکھ کر نوی محترم دل کو سنبھالنے کی اپنی پوری کوشش میں ہیں۔

کیا غضب تھا۔۔ جو اس نے ڈھایا تھا اور ڈھار ہی تھی۔۔ مگر یہ کیا؟۔۔

دلہن کا منہ اتنا سو جا ہوا ہے کہ وہ کیا سا محسوس ہو رہا ہے اور ایسا کیوں ہے بھلا؟ کیونکہ دو لہا صاحب ایک از میرانہ سی (از میرٹ جیسی) حرکت کر چکے ہیں۔ وہ اس کو سب سے پہلے دیکھنے نہیں آیا تھا وہ محبت میں حماقتوں کا قائل نہیں تھا کم از کم۔

”یار! سوڈ تو ٹھیک کرو۔۔ ورنہ یاد رکھو۔ میں نے مہندی کا فنکشن تمہاری کسی فرمائش پہ دوبارہ نہیں کروانا۔ کہ تب میرا موڈ خراب تھا۔“

اس نے سرگوشی کی۔۔ دلہن نے منہ اور پھٹا لیا۔

”صبح۔۔ یار پلینز ابونٹ خراب نہ کرو۔ اب ہر

فرمائش تو پوری نہیں کر سکتا میں!“ وہ زچ ہوا۔

اور صبح بے ساختہ پانی پانی ہو گئی تھی۔ اسے ٹھیک

وقت پہ ٹھیک احساس ہوا۔ کیا۔ کیا تھا جو وہ کر چکا تھا اس کے لیے۔

”سوری۔۔“ مگر نخرے سے کہا گیا۔

”ہا۔۔“ ایک سکھ بھرا سانس تھا۔ اور اس کے بعد۔۔

سارے فنکشن میں صبح کی مسکراہٹ دائیں سے

بائیں گل تک پھیل رہی تھی۔ اتنی کہ اماں بار بار اسے دانت اندر رکھنے کی تنبیہ کر کر کے تھک چکی تھیں اور اس انتظار میں تھیں کہ کب اسے چپل زدہ کیا جاسکے۔

ہا۔۔ یہ صبح جاوید بھی نا۔

تو قارئین کرام۔۔ شادی کا دن آچکا ہے۔ وہ غضب تھا جو کل دلہن نے ڈھایا تھا اور آج وہ ”قیامت“ تھی جو کہ صبح برپا کر چکی تھی۔

آج کے مہینو میں۔۔ جانتی ہوتا پہلے ہی کتنی مشکل سے مانی ہیں۔ مہندی کے اکٹھے فنکشن کے لیے۔۔“

وہ کتنی بے چارگی سے بول رہا تھا۔ آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے اور صبح۔۔ وہ اس کے بات ختم کرتے ہی پھر سے کھلکھلائی۔ ایویس ہی۔۔ بلا سبب ہی۔۔ وہ الگ بات کہ اس وقت نوی کو اس کی ہر ہر کھلکھلاہٹ خطرے کا بھدا سارن محسوس ہو رہی تھی۔

”تم سامنے والے گیٹ سے تھوڑا آؤ گے۔ تم بیک یارڈ سے آنا۔ قسم سے آج مجھے بیک یارڈ کی اہمیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا ہے۔“ اس کی بے چارگی کو تو محسوس ہی نہیں کیا گیا تھا۔

”صبح۔۔ یار!“

”میں انتظار کر رہی ہوں۔“ لاڈ سے کہہ کر اس نے فون بند کیا بلکہ آف ہی کر ڈالا تھا۔ اب وہ کسی اور کو فون کر کے یہ کہنے سے تورہا۔

”صبح سے بات کرو اوس۔۔“ اس کی تو بہنیں بھی اسے آج کے دن اپنی درگت نہیں بنوانی تھی۔

”اف۔۔“ بے ساختہ اس نے اپنے بنے بنائے سلیقے سے سنوارے گئے بال نوچے تھے۔

کاش! کہ میں ”از میرٹ“ ہوتا۔ کاش۔۔ کہ بڑی شدت سے خواہش انھی تھی۔

یہ ایک مہندی کا سین ہے۔ اسٹیج پہ صوفے کی

بجائے جھولا رکھا گیا ہے اور جھولا جیسٹمین کے پھولوں سے۔۔ سجایا گیا ہے۔

اسٹیج پہ چڑھنے کے لیے دو تین اسٹیپ ہیں اور ہر اسٹیپ کے دونوں اطراف گولڈن رنگ کے گھڑے رکھے ہوئے ہیں جن کو مہندی کی نسبت سے پہلے پھولوں کے ہار سے سجایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اسٹیج پہ لائٹس اور پھولوں سے جو زیبائش کی گئی ہے۔ وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ ابھی ابھی اس جھولے پہ نوی آکر بیٹھا ہے اور یاد رہے کہ وہ اینٹی الرجی انجکشن لگوا کر آ رہا ہے۔ کیونکہ۔۔ کیونکہ اسے

”بندے کو اتنا جی خوب صورت نہیں لگتا چاہیے۔“

نومی بار بار یہی ہی سوچ رہا ہے۔ وہ خود اسٹیج سے اتر کر صبح تک گیا ہے۔ جبکہ وہ اسٹیج سے کئی فٹ فاصلے پہ تھی۔ اور صبح۔؟ کاش کہ وہ زور سے چیخ مار کر اپنی خوشی کا اظہار کر سکتی۔ کاش کہ وہ اپنے دو پیروں پہ اچھل سکتی۔ کاش اے کاش کہ۔

مگر ایسا صرف اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ اس کی کمر رات سے اماں کا دھمکا کھائے ہوئے تھی۔ اور اب تو وہ لوگوں کی شرم بھی نہ کرتیں۔ سو بس اسی لیے۔ وہ سر جھکا کر نومی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیے اسٹیج کی طرف چلتے ہوئے مسکرائے جاتی تھی۔

رخصتی کا منظر ہے۔ اماں صبح کے گلے لگ کر اس طرح سے روئی ہیں کہ صبح کو پہلی بار محسوس ہوا ہے کہ اماں کو اس سے کتنی شدید محبت ہے۔ اور وہ خود بھی رو پڑی ہے۔

”اماں! اب اتنا تو نہ رلائیں۔ میک اپ خراب ہو جائے گا۔“

سکتے ہوئے، اماں سے لپٹے ہوئے ان کے کان میں سرگوشی کی گئی تھی۔

اور اماں کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا تھا۔ وہ نہیں بدل سکتی تھی۔

انہیں اور رونا آیا تھا۔

انہوں نے بڑی ہی شدت کے جذبات کے ساتھ اس کا ہاتھ چوما تھا کہ صبح میک اپ پر خیریت کیے جانے والے پیسوں کو بھلا کر بے طرح رونا بھی تھی۔

اور اب یہ صبح کی سسرال میں اینٹروی کا منظر ہے۔ وہ روئی روئی سی ہے۔ اور کچھ ڈری ڈری سی بھی ہے۔ اتنے سارے اپنوں کو چھوڑ کر اتنے سارے انجان لوگوں کے بیچ آگئی ہے۔ صرف ایک شخص کے لیے۔ کہ وہ واحد اپنا ہے ان انجان لوگوں میں۔ اس کا سر بھی درد کر رہا ہے اور اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔

(یاد رہے کہ عموماً ”دلہنوں کی بھوک اڑ جاتی ہے) دونہا اور دلہن کو واقعی دروازے سے لاکر روک دیا گیا ہے۔ وہ روکنے کو ابھی سمجھنے کی کوشش میں تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔

اور پھر ایک دو منٹ کے بعد روشنی کا جھماکا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈھیروں آوازیں اور کوئی چیز یکدم۔ اس کے اوپر گرنے لگی تھی۔

وہ ایک دفعہ تو ڈری۔ مگر دوسرے ہی لمحے مسکرا اٹھی۔ اور گردن اٹھا کر بے ساختہ اوپر دیکھنے پہ مجبور ہوئی تھی۔ وہ چیختی آوازیں نومی کے کزنز اور بن بھائیوں کی تھیں۔ جو اسے دیکھ کر ہوم کہہ رہی تھیں۔ اور ایک دم اوپر گرنے والی چیز پھولوں کی پتیاں تھیں۔ جسے چھت پر سے کسی نے گرایا تھا۔

اور پھر بڑے ہی ڈرامائی انداز میں داخلی دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے اور۔۔۔

بے ساختہ، بے تحاشا خوشی کے تحت اس نے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پہ رکھے تھے۔ اور اس کا منہ ”آ“ کے انداز میں کھلا ہوا تھا۔ خوشی۔ حیرت۔ بے یقینی۔

اس نے سب کچھ بالائے طاق رکھ کر نومی کو دیکھا۔ اور جس وارفتگی سے دیکھا۔ نومی فنا ہو کر رہ گیا تھا۔

راہداری میں چلتے ہوئے چراغوں کی قطاریں تھیں۔ وہاں صرف ان ہی چراغوں کی روشنی تھی۔ ان کی دو کزنز جن کے ہاتھ میں پھولوں سے بھرا ایک ٹوکرا تھا اور ان دونوں نے اسے مخالف اطراف سے تھام رکھا تھا۔

”بیٹا! بسم اللہ کیجئے۔“ نعمان کے ابو نے اس سے کہا تھا۔

اس نے دایاں پاؤں اٹھایا اور زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے اس گھر کے اندر قدم رکھا تھا۔ ان دونوں کے قدم رکھنے کی جگہ کو قدم رکھنے سے پہلے ہی پھولوں سے بھر دیا جاتا تھا۔

یہ کیا تھا؟ اللہ یہ کیا تھا؟

صبح نے انہی کو دانستوں سے کاٹ کر یقین کرنا چاہا مگر

پھر یاد آیا کہ انہی بھی انہی تھی اور درد بھی خود کو ہی ہوتا تھا۔ اس کی ساس نے گھر میں پاؤں رکھتے ہی صدقہ و خیرات کی بھی کیا تھا۔

ایسا استقبال۔۔۔ اف۔۔۔

اسے اپنی شادی سالوں تک یاد رہنے والی تھی۔

اس کے بعد رسموں کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ وہ ہنستی رہی مگر نا معلوم کیوں نومی کو لگا کہ وہ جیسے زبردستی ہنس رہی ہے۔ اور جیسے کہ وہ کسی چیز کو ضبط کر رہی ہے۔ وہ سمجھا تھکاوٹ ہے۔ مگر یہ تھکاوٹ نہیں تھی۔ اس کا اندازہ اسے کچھ دیر بعد ہوا تھا۔

جب اسے کمرے میں لے جایا گیا تو وہاں ایک اور خوشی کا جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ کمرہ کینڈلز اور پھولوں کی آرائش سے بہت ہی اعلیٰ طریقے سے سجا ہوا تھا۔

اور یاد رہے کہ آج نومی نے انٹی الرجی انجکشن نہیں انجکشنز لگوائے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ چھینکتا ہوا پایا گیا ہے۔ اسے یوں چھینکتا دیکھ کر اس نے نظریں اٹھا کر نومی کو دیکھا۔ اور اس طرح دیکھا کہ نومی چھینکنا بھول کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کوئی ایسا تاثر جس نے فوراً "نومی کو اس کے پیاس آنے پر مجبور کیا تھا۔

"کیا ہوا صبح؟ کیا بات ہے کچھ برا لگا؟" اس کے پیاس بیٹھتے ہوئے۔ پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے۔ اس نے کہا تھا۔ اور صبح بس۔ اسی چیز کی کمی تھی۔

وہ رو پڑی۔ وہ اب کی بار آنسوؤں کو آنکھوں میں قید نہیں کر پالی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ لگا کر رو پڑی تھی۔

"صبح۔ کیا ہوا۔ یار کیا بات ہے۔" اس کا سر دونوں ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہوئے وہ پریشان ہوا۔ اس کا پریشان ہونا بھیا تھا۔

صبح کے ہونٹ کپکپائے اور آنسو اور تیز رفتاری سے بہہ نکلے۔ جنہیں اس نے ہاتھ سے رگڑ کر صاف کیا تھا۔ وہ ہچکچاں لے رہی تھی۔ مگر سچ یہ تھا کہ وہ

ہچکیاں روکنے کی کوشش میں تھی۔ "صبح! تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔ اگر اماں سے ملنا ہے تو لے جانا ہوں تمہیں مگر یوں تو مت رو دیا۔" مگر نہ جی۔ صبح کو تو آج ہی سارا "بحیرہ عرب" اپنی آنکھوں سے بہا رہا تھا۔

نومی اب کچھ تھک کر زچ ہو کر اسے رو تا دیکھ رہا تھا اور اس کے رونے کی رفتار کم ہونے کے انتظار میں تھا۔ مگر وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور اسے ہلکا ہلکا تسلی کے سے انداز میں تھپتھا بھی رہا تھا۔

"کوئی ایسے بھی محبت کرتا ہے۔ کوئی ایسے بھی چاہتا ہے کسی کو۔ کوئی محبت میں یوں بھی کرتا ہے بھلا؟" سر جھکائے سسکتے ہوئے بالآخر وہ بول پڑی تھی۔

"تم۔۔۔ تم اس لیے رو رہی ہو؟" وہ حیران ہوا۔ صبح نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور وہ ہنس پڑا۔ "تم بھی نا صبح! بہت ہی پاگل سی ہو۔"

"اور تم مجھ سے بھی زیادہ پاگل ہو۔ مجھ پاگل کی ہر پاگل خواہش جو پوری کی۔" شوں شوں کرتے ہو کہا تھا۔

"تم سے محبت جو تھی اور محبت میں تخت چھوڑنا، نہرس کھودنا، صحرا بدر ہو جانا ہی عظیم کام نہیں ہیں۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ "ناول" پڑھنا بھی ایک عظیم کام ہے۔"

اور وہ روتے روتے ہنس پڑی اور پانی غیس آگ لگی۔ باخدا پانی میں آگ لگی۔ اس نے زری سے ہاتھ برہا کر اس کے نم گالوں کی نمی کو ہلکے سے صاف کیا۔

صبح کی نظریں اپنے ہاتھ پہ تھیں جو ابھی تک اس نے بائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم نے مجھے جیت لیا۔ بس تم اچھے ہو۔ بہت اچھے۔" اس ادا سے کہا گیا کہ جس نے ذرا ہونا بنتا ہے۔ نومی نے جھکی پلکوں کے ساتھ اس کے ملتے لبوں کو سنا۔

اور وہ پھر سے سر جھٹک کر ہنس پڑا تھا۔ وہ سیدھے سیدھے اس سے یہ تو۔ کبھی بھی نہ کہتی۔ "مجھے تم

سے محبت ہے۔" اس کی زندگی کا ہر ہر ایونٹ خاص رہا تھا۔ اب یہ کیسے نہ ہوتا۔

"سنو!"

"ہاں!"

"ہنی مون کے لیے کہاں جاتا ہے؟"

اور وہ جواب بھی ابھی اماں کے گھر سے ہو کر آرہی تھی اور اپنے جوتے اتار رہی تھی۔ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کتنا خرچا ہو گا؟" وہ پھر سے جوتے کھولنے اور انہیں اتارنے میں مصروف ہو گئی۔

"تیس۔ چالیس ہزار۔" اس کا ارادہ نادرین اریاز کی طرف کا تھا۔ اسی حساب سے اس نے بتایا تھا۔ مگر وہ اس کے سوال پہ حیران ضرور ہوا تھا۔

جوتے اتار کر وہ اٹھ کر انہیں شوریک میں رکھنے گئی تھی۔

"اگر کچھ کہوں تو برا تو نہیں مانو گے!" اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

"اوائے! یہ تکلفات اور مسامت صبح جاوید۔" وہ مصنوعی حیرانگی سے بولا۔

"نعمان!۔" اس نے خفگی سے گھورا۔

"کہیں تمہارا سونہٹز رلینڈ۔"

"ارے نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"تو؟"

"تمہیں معلوم ہے ناکہ میں Sickness

Road کا شکار ہوتی ہوں اور۔۔۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم برا نہ مانو تو جو اماؤنٹ ہمیں ہنی مون پہ اڑانی ہے۔ وہ ہم کسی اچھے سے سوشل ویلفیئر ادارے کو دے

دیتے ہیں۔۔۔ حسین لمحے تو دل کے محتاج ہوتے ہیں نا۔۔

اور نئی زندگی کی شروعات۔ ان کاموں سے ہونی

چاہیے جن سے اللہ راضی ہوتا ہے۔" وہ جھجکتے

جھجکتے کہہ رہی تھی۔

نعمان ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔

ایسی ایسی نادہشتی سی خواہشات رکھنے والی کی۔ ایسی فقیرانہ سی خواہش۔

"یہ تم نے کہاں سے سیکھا صبح؟" کچھ حیرانگی سے کچھ پیار سے پوچھا گیا۔

"ان ہی کتابوں سے، ناولز سے جن سے مجھے عشق

ہے۔ اور جن کی محبت گھٹی میں شامل ہے میری۔۔

اور جن کے بغیر میری موت واقع ہو جانے کا خدشہ ہے۔۔۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

اور پہلی بار نعمان عابد کو احساس ہوا کہ وہ کیا سیکھے ہوئے تھی۔ اور کتابیں کیا کیا سکھاتی ہیں۔

ٹھیک ہے، اس کو کسی ہیرو کی تلاش تھی اور وہ کوئی ہیرو نہیں تھا مگر۔ صرف اس سے رشتہ جڑنے کی دیر تھی۔

صبح نے اس کے بعد کبھی بھی اس سے بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے صبر شکر کرنے

والے انداز میں رشتہ قبول کیا تھا۔ مگر اس کے بعد کبھی بے وفائی یا کسی بہتر کی تلاش نہیں کی تھی نہ کسی اور

ہیرو کو کھوجا۔ ہیرو۔ کو ہیرو بنانے والی چیز، محبت ہوتی ہے۔

یہ پر سنالٹی۔ ذہانت وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تو سپورٹنگ کرکٹرز کی طرح سے ہوتے ہیں۔ جن کے

بغیر کہانی بنتی ہے۔ نہ چلتی ہے۔

اور ہر وہ شخص ہیرو ہی ہے جو کسی سے ایسی پیور،

خالص محبت کرتا ہے۔ ہر غرض، ہر مفاد، ہر آلائش

سے پاک۔

چاہے وہ نعمان عابد ہو یا سالار، حیدر، جازب یا سعد۔۔

۔۔ یا ان کی طرح کے دوسرے کردار۔ ان سب کو محبت

خالص بنانی ہے۔ جیسے نعمان عابد، بنا تھا۔ صبح جاوید

کے لیے۔

محبت اور پیور، خالص محبت۔ یہ آج کے دور میں

ناپید ہے۔

اور جس کے پاس یہ ہے یقین کریں وہ آرن مین،

سپر مین، اسپانڈر اور بیٹ مین سے بڑا مین ہے، ہے کہ

نہیں۔۔۔؟

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نعمان عابد کا خط ایک — مشہور ڈائجسٹ کی مدیرہ کے نام۔

نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ۔
”السلام علیکم اے۔“

یقین کریں کہ میں اس وقت تشکر کے جذبات سے لٹھڑا ہوا ہوں اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ان خواتین لکھاریوں کے قلم کو عقیدت سے آنکھوں سے لگا لوں۔

کیا کمال ہے۔ بھی کیا کمال ہے جو یہ اپنے قلم کے ذریعے کرتی ہیں۔ یہ وہ کام سرانجام دے رہی ہیں جسے بجا طور پر صدقہ جاریہ کہنا چاہیے۔

مجھے حیرت ہے کہ ایک عورت ہونے کے ناتے سے جو ان پر گھریلو ذمہ داریاں عائد ہیں، یہ ان کو بھی احسن طریقے سے سرانجام دیتی ہیں اور ساتھ ساتھ جس جانفشانی سے یہ ”جہاد بالقلم“ کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ یقین مانئیے۔ دل عیش عیش کراٹھا۔

اور بے ساختہ یہ خواہش ابھری کہ ان خواتین لکھاریوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کاش کہ میں ان کے قلم کے لیے سیاہی مہیا کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتا اور کاش کہ میں ایک کانغذ ہوتا جو ان کے تبرک ہاتھوں کے نیچے ہوتا اور خود پہ بکھرنے والے موتی جیسے لفظوں پہ نازاں ہوتا۔

اے کاش کہ میں تیرے حسین ہاتھ کا ایک کانغذ ہوتا (وصی شاہ سے معذرت کے ساتھ)

میری مدیرہ محترمہ سے بھرپور سفارش ہے کہ ایسا ایک ادارہ قائم کیا جائے جو کہ ان خواتین لکھاریوں کے کام کی ترقی و ترویج کے لیے مخصوص ہو اور جس کے ذریعے سے ان خواتین لکھاریوں کے کام کو احسن طریقے سے سراہا جائے۔

میری یہ بھی گزارش ہے کہ اچھا اور معیاری کام کرنے والوں کو بونس بھی دیے جائیں۔ یہ جو کہانیوں میں ذہانت و فطانت سے بھرپور کردار ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ان ہی کے زرخیز مانگوں کا کمال ہوتا ہے۔

ذہانت کرداروں کی نہیں ان کے اپنے ذہن کی ہوتی ہے۔ ایسی خوبصورتی سے کسی بھی منظر کو بیان کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ایک دفعہ تو سب کچھ نیچ پانچ کر ضرور ہی وہاں جایا جائے۔ ایسے ایسے شاہکار۔ کردار۔ واللہ کہ عقل دنگ رہ جائے۔ اور وہ وہ سبق آموز کردار۔ واللہ۔ واللہ۔ الفاظ نہیں مل رہے کہ اب کیا کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ خط کی طوالت آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ اور میں کبھی بھی ان لوگوں میں سے نہیں ہونا چاہوں گا جو آپ کی پریشانی کا باعث ہوں۔

میں مدیرہ صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ وہ اس ڈائجسٹ کو اس قدر منظم اور احسن طریقے سے چلا رہی ہیں۔ یقیناً ”وہ داد کی مستحق ہیں۔“ اور آخر میں صرف ایک خواہش۔

کاش میں ان کے ہاتھ کا ایک کانغذ ہوتا۔ کاش اے کاش۔

آخری سطور لکھتے ہوئے میرا دل محبت و عقیدت کے ان جذبات سے لبریز ہے جیسے کسی بھی ”بک لور“ (کتابوں کا عاشق) کا ہو سکتا ہے۔ گو کہ مجھ میں وہ خالص حس ناپید ہے جو کتاب سے محبت اور اس کے مطالعے کے عارضہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مگر پھر بھی میں واقعی بہت عقیدت و احترام محسوس کر رہا ہوں اور ان جذبات میں خود کو لٹھڑا ہوا پایا ہوں۔

والسلام! نعمان عابد۔

ایک انتہائی خوش قسمت اور خواتین لکھاریوں کا

فیض یافتہ۔

خصوصی نوٹ : (خط اگر آپ روی کی نوکری پر نذر بھی کر دیں گی تو یقین کریں کوئی کلمہ، کوئی دکھ، کوئی نہ ہو گا۔ شکریہ)

عرض مصنف : (باخدا یہ تحریر صرف اور صرف مزاح کی ایک کوشش ہے اور۔۔۔ برائے مہربانی اس کو ہر تعصب سے بالاتر ہو کر پڑھا جائے۔ شکریہ)



خسک سدا

کی تین-بجلز ان فتنہ خیز اور شرانگیز بہنوں کو کوئی کیا تنگ کرتا وہ خود ہی آنے والی کا ناطقہ بند کر دیتیں اور ننھے میاں کیا کسی کو کچھ کہتے، جبکہ وہ خود ہی گھر میں تیسرے درجے کے شہری تھے۔ اگر ان کی بیگم گھر والوں کو کچھ کہہ بھی دیتیں تو اگلے دن ننھے میاں بمعہ بیگم گھر سے باہر ہوتے۔ کچھ ایسی ہی ”ڈبنگ“ بہنیں

تھیں ننھے میاں کی اور شادی شدہ بچے کے باوجود بھی ان کا عمل دخل برقرار تھا۔ سب سے بڑی بہن فرزانہ جو ”گربہ گشتی روز اول“ کی قائل تھیں کہ سامنے والے کو سراٹھانے کا موقع ہی نہ ملے۔ سامنے والا کیسا بھی ہو، ہرگز خاطر میں نہ لاؤ بلکہ فوراً اس کی خامیاں، برائیاں گنونا شروع کرو، تاکہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تمہارے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ فی الحال تو یہ فارمولا وہ اپنے شوہر پر گزشتہ چھ سال سے آزما رہی تھیں اور اپنے شوہر کی شرافت کو اس فارمولا کی کامیابی سمجھتی تھیں۔

دوسری بہن شبنم جو ”سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔“ کی تفسیر بنی پھرتی تھیں، اب یہ الگ بات ہے کہ وہ اکثر و بیشتر دوسروں کے لیے درد سر ثابت ہوتیں، کیونکہ کسی کی مدد کرنا اور بات ہے، کسی کے کاموں میں بلاوجہ ٹانگ اڑانا الگ بات ہے۔ لوگوں کے کام بگاڑنا ان کے پائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور اگر کوئی شامت اعمال ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا تو وہ ”لو ایک تو ہم مدد کر رہے تھے“ کہہ کر وہ لتے لیتیں کہ کہنے والا کان دبا کر اپنی راہ لیتا۔ ان کا سسرال گو کہ میکے سے اتنا قریب بھی نہ تھا۔ مگر گھر کا کوئی بھی معاملہ ہو۔ یہ جھٹ بس پکڑ میکے کے مسائل پنپانے اور بقول محلے والوں کے

بارے ننھے میاں کے گھر والوں کو ان کی شادی کرنے کا خیال آ ہی گیا۔ ننھے ننھے ننھے میاں ہرگز ننھے نہ تھے، بلکہ ماشاء اللہ چالیس سالہ ”جوان“ تھے جن کے شانوں پر تین، تین بہنوں کی شادی کرنے کا فریضہ یوں دھردیا گیا تھا اور اس فریضے سے سبکدوش ہوتے اب اکرم عرف ننھے میاں چالیس برس کے ہو چلے تھے۔ گھر والوں کے لیے تو راوی اب بھی چھین ہی چھین لکھ رہا تھا، مگر براہو اس دنیا کا جو کسی کو سکھ کا سانس نہیں، لینے دیتی اور اس سے بھی زیادہ عورتوں کی کتر کتر چلتی زبانوں کا، جو بانگ دہل کہنے لگی تھیں کہ بیٹے کی کمائی سے اب بیٹیوں کے گھر بھرنے کا ارادہ ہے، جب ہی تو شوکت جہاں بھولانے کا نام نہیں لیتیں۔ اب تو چھوٹی والی کی شادی کو بھی سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب دوسروں کے بارے میں بات کرنا تو بڑا آسان ہے، مگر یہ ہی دوسرے جب آپ کے بارے میں بات کریں تو برداشت کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا شوکت جہاں بھی ایک دن بھرک ہی گئیں۔

”اے نوج! میں کاہے نہ بھولاؤں گی، ارے وہ تو ننھے کی خود ہی مرضی نہ تھی کہ بہنوں کے ہوتے بیاہ نہ کروں گا، نہ جانے آنے والی کیسی ہو، کس مزاج کی ہو۔ میری پیاری بہنوں کو تنگ نہ کرے۔“

حالانکہ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ ارشادات قطعاً ”اکرم میاں کے نہ تھے کہ وہ بے چارے ہر جگہ، ہر شادی میں نکاح کے چھوارے اس امید پر بڑے فوق و شوق سے کھاتے پائے جاتے تھے کہ سنا تھا اس طرح کھانے والے کی جلدی شادی ہو جاتی ہے اور رہی بات ان کی معصوم بہنوں کو تنگ کرنے کی تو ان کی تین بہنیں اتنی ہی معصوم تھیں جتنی (چارلس ایبجلز)

سیا ڈالنے پہنچ جاتیں۔
 تیسرا اور آخری نمونہ نادرا تھیں، بہن کی زبان کے
 جوہروں کے آگے کوئی نہ ٹیک سکتا تھا۔ یہ نہ صرف
 زبان سے ”پھول“ بھجارتی تھیں، بلکہ۔ اشارے میں
 دیکھ دیکھ کے ان کے شیطانِ دماغ کو بھی چار چاند لگ
 چکے تھے۔ محترمہ بات کا بے سنگز پرانے میں ماہر تھیں اور
 اب تو وہ وہ سازشیں تیار کرتی تھیں کہ انہما ڈالے بھی
 عیش عیش کرا نہیں۔ محلے والے ان کو ”پیار“ سے
 ”نادراہ فتنی“ بلاتے تھے اور وہ سیں ننھے میاں کی اماں تو



دھڑکا بھی لگ گیا تھا کہ کہیں ننھے میاں خود ہی کسی کو پسند نہ کر لیں اور کسی دن گھر کے آئلن میں لاکھڑا کریں کہ یہ لواہاں! تمہاری بہو اور بہو اگر پیاسا من بھائی آگئی تو وہ تو سر پر تھ کرنا چے کی اور ساتھ ان سب کو بھی تنگی کا ناچ بچوائے گی۔ لہذا فوراً ”نور چشمیوں کو فون کھڑکایا گیا کہ سب ساتھ آجاؤ، تاکہ بوا حمیدہ کے بتائے رشتوں پر غور کر لیا جائے۔ فون تو محض بہانہ تھا۔ تینوں کی تینوں ہمراہ اپنے اپنے چھوٹے فتنوں کے ساتھ حاضر ہو گئیں اور رنچھوڑ لائن کی تنگ و تاریک گلیوں میں بنے اس دو کمروں کے مکان میں ”تھنک ٹنک“ سر جوڑ کے بیٹھ گیا۔ زور سارا اس بات پر تھا کہ بھابھی ایسی لائی جائے جو ساس مندوں کے سامنے سر نہ اٹھائے، زبان کے بجائے صرف ہاتھ چلائے (بھئی کام کرنے کے لیے) اور بس جی حضوری ہی کرتی رہے۔ لو بھلا کوئی یہ پوچھے کہ بہو چاہیے یا رو بوٹ، مگر جناب بھڑوں کے چھتے کو کون چھیڑے۔ ان شرائط کے علاوہ ایک اور شرط بھی لگادی گئی تھی کہ لڑکی اگر جاب کرتی ہو تو بہت اچھا ہے، تاکہ اس کی کمائی سے بھی مستفید ہوا جاسکے۔ یہ آئیڈیا نادرہ فتنی کا تھا۔ مگر اس بات پر بوا حمیدہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ جاب کرنے والی لڑکی اول تو تمہارے گھر اور علاقے کے لیے ہاں نہیں کرے گی۔ دو سرا اگر شادی ہو بھی گئی تو بھی تم لوگ کو زیادہ دن پرداخت نہیں کرے گی۔ بات سولہ آنے درست تھی۔ لہذا اس وقت بوا حمیدہ کی لائی گئی تصاویر دیکھی جارہی تھیں اور تینوں کو کوئی بھی لڑکی پسند نہیں آرہی تھی کیونکہ ایک تو کچھ لڑکیاں کافی خوش شکل تھیں اور خوب صورت بھابھی تو لائی نہیں تھی کہ اکلوتا بھائی کہیں اس کے حسن کا دیوانہ ہو کر بہنوں کو نہ بھلا بیٹھے، دو سرا کوئی بھی لڑکی کم عمر یعنی سولہ، اٹھارہ کی نہ تھی جس کو دیا کر رکھنے میں آسانی ہوتی۔ آخر کار آکٹا کر شبانہ نے تصویریں ایک طرف کریں اور اپنی کراری آواز میں بوا سے کہنے لگی۔

”بوا! یہ تم کیسی تصویریں دکھا رہی ہو؟ یہ کوئی لڑکیاں ہیں پکی، پکی عمروں والی۔ ارے یہ تو آنیاں لگ

رہی ہیں۔“ اپنی بات کہہ کر خود ہی قہقہہ لگایا، جس میں دونوں بہنوں اور اماں نے بھی ساتھ دیا، مگر آگے بھی بوا حمیدہ تھیں، چمک کر بولیں۔

”اے بنو! یہ آنیاں دکھ رہی ہیں تو تمہارے بھائی کو بھی اب لوگ انکل ہی کہتے ہیں۔ کون سا چھنا کا کا ہے موا تمہارا بھائی۔ ہم بہنوں کی شادیاں کرتے کرتے آدھا گنجا تو ہو گیا۔ بے چارا اب اس کے لیے ہنکھوڑا جھولتی پچی کا رشتہ لانے سے تو رہی میں۔“ یہ صاف گوئی سن کر تو تینوں بہنوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”اب اتنا بڑھا بھی نہیں ہمارا بھائی۔“ کہہ کر بوا کے لئے لیے جانے کا آغاز کیا ہی جانے والا تھا کہ شوکت جہاں بوا کے بگڑتے تیور بھانپ کر جلدی سے میدان میں کود پڑیں اور معاملہ رفع دفع نہ کرانے کے لیے بولیں۔

”چل چھوڑ بوا، کوئی اور رشتے لے آؤ، یہ تو سمجھ نہ آرہے ہیں۔“ بوا نے برا سامنے بنا کر تصویریں سمیٹ کر اپنے کھیلے نماپرس میں رکھیں اور بولیں۔

”اگلی دفعہ تب آؤں گی تمہارے ہاں، جب واقعی تمہارے مطلب کا کوئی رشتہ ہوا، ورنہ میں نہ آنے والی، اب تم کنبوسوں کے ہاں غضب خدا کا دھکے کھاتے آؤ، نہ تم لوگ چائے پانی کا پوچھتی ہو نہ آنے جانے کا کراہ دیتی ہو۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ رشتہ طے ہوتے ہی پانچ ہزار روپے اور دو جوڑے لوں گی، ورنہ یاد رکھنا میں طلاقیں کروانے کی بھی بڑی ماہر ہوں اور یہ کم عمر لڑکی اور وہ بھی جاب کرتی ہوئی والی شرطیں تو بھول جاؤ لی بنو۔ غضب خدا کا بندہ کبھی خود بھی آئینہ دیکھ لے۔“ بوا کا پارہ تو کراچی اور ممبئی کے درجہ حرارت کو بھی مات دینے لگا۔

”اری حمیدہ، بیٹھو تو۔ چائے بنواتی ہوں۔“ شوکت جہاں نے بوا کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”ارے اپنے پاس رکھو اپنی چائے، مار لگتا ہے ایک ہی پتی کو بار بار جوش دے کے استعمال کرتی ہو، نہ رنگ، نہ خوشبو، نہ ذائقہ۔“ بوا حمیدہ بکتی جھکتی

”آئے ہائے اماں۔۔۔ تم کو بھی یہ ہی دچولن ملتی ہے“
 ننھے کا رشتہ ملے کرنے کے لیے؟ کتنی باتیں سنا کر گئی
 ہے۔ عمر کا لحاظ نہ ہوتا تو منہ توڑ دیتی۔ ”یہ نادرہ فتنی
 تھی۔“

”ارے تو۔۔۔ تو میرے ہاتھ میں ہیں“ تمیں ہزار رکھ
 دے تو میں بلاؤں ان انگریزی بولنے والی پرکٹی رشتہ
 کرنے والی مائیوں کو سب سے کم پیسے لیتی ہے بوا حمیدہ
 دو باتیں سن لیں تو کیا ہو گیا۔ باتیں چپک تھوڑی کنیں
 مجھ کو اور چلو نکلو تم سب اب یہاں سے اور ان فتنوں
 کو بھی تھوڑا تمیز سکھاؤ۔ ”آج تو شوکت جہاں کسی اور
 ہی جہاں میں تھیں بنو بیٹیوں کو یوں لتاڑ دیا تھا“ مگر
 بیٹیاں بھی آخر انہی کا پر تو تھیں۔ فرزانہ ڈھٹائی سے
 بولی۔

”اوہ ہو اماں۔۔۔ تم تو بہو کے آنے سے پہلے ہی
 انکارے چبانے لگیں، مگر ہم تو اب کھانا کھا کر شام میں
 ہی جائیں گی اور کھانا باندھ کے بھی لے کے جا میں
 گی۔ اب گھر جا کر کون پکائے گا۔ یہ بھی شکر ہے کہ
 سسرال والوں نے ہمیں خود ہی الگ کر دیا۔ ورنہ ان
 کے لیے بھی روٹیاں تھوپی پڑتیں۔“ ان زریں
 خیالات پر بانی دونوں بہنیں بھی سر دھننے لگیں۔ اور
 اندر آتے ننھے میاں نے سوچا۔

”تم لوگوں کی زبانوں کے آگے کوئی ٹک پاتا تو تم
 سسرال میں رہتیں نا“ بے چاروں کو عزت چاری تھی
 جب ہی الگ کر دینے میں عافیت جانی۔ ”مگر یہ بات
 با آواز بلند کہہ کر رہے سے بل نہیں اڑوانے تھے۔
 لہذا چپ رہنے میں عافیت جانی اور اپنی بہنوں کے
 فرما کٹی گھانوں پر آنے والے اخراجات کا حساب
 لگانے لگے کہ تنوں جب بھی آئیں بازار سے ہی بریانی
 نہاری، حلیم یا تکیہ کباب منگوائے جاتے، کیونکہ بقول
 ان کے مہکماتو آرام کے لیے ہوتا ہے۔“



کچھ دن یوں ہی گزرے تھے کہ بوا حمیدہ باپتی کا پتی

گھر میں داخل ہوئیں اور آتے ہی بولیں۔

”لو بتو! اللہ شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔
 آج بالکل تمہارے مطلب کا رشتہ لائی ہوں۔ لڑکی
 ہے تو تیس سال کی، مگر لگتی نہیں ہے۔ بس رنگ
 تھوڑا کم ہے، مگر نوکری بھی کرتی ہے اور لوگ بھی تم
 سے زیادہ پیسے والے ہیں۔ لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔
 اس لیے اپنے سے کم حیثیت لوگوں میں بھی رشتہ
 دینے کو تیار بیٹھے ہیں۔ اب تم تصویر دیکھ لو اور اپنی
 چندال چو کڑی کو بھی بھلے دکھا دو اور ہاں کوئی اعتراض
 کرنے سے پہلے ذرا اپنا گھر اور لڑکا بھی غور سے دیکھ
 لینا۔ میں چلتی ہوں اب۔ کہیں اور بھی کام ہے۔“ بوا
 حسب عادت دو ٹوک بات کر کے چلتی بنیں اور اماں
 نے فوراً ”بیٹیوں کو بلاوا بھیج دیا“ جو حسب معمول فوراً
 ہی آپہنچیں۔ اماں سے تفصیلات سن کر تو تینوں بہنیں
 جھوم ہی اٹھیں یہ رشتہ تو گویا ان کے لیے ہی تھا۔
 بھا بھی کم شکل یعنی طعنے دینے میں آسانی اوپر سے کمائی
 والی بھی۔ بس تھوڑا سا خدشہ یہ تھا کہ مالی حیثیت میں
 لڑکی کا مہکمہ مضبوط تھا تو کہیں اس بل بوتے پر بھا بھی
 خرے نہ دکھائے، مگر اماں نے سمجھایا کہ۔

”جب شادی ہو جاتی ہے تو منجھو سب کشتیاں جل
 گئیں۔“ میکے پر اکثر دکھائی تو وہیں چھوڑ آؤں گی اور
 ویسے بھی گھر والے تو ایسے بے زار بیٹھے ہیں اس سے
 کہ ہم جیسوں میں بھی رشتہ دے رہے ہیں تو بس
 کہاں کا مہکمہ۔۔۔“ تینوں بہنوں نے لڑکی کی تصویر
 کو اوکے کر دیا۔ ”ہیڈ کوارٹر“ سے منظوری کے بعد
 ننھے میاں کو تصویر دکھانے کی رسم ادا کی گئی۔ لڑکی کا نام
 صنوبر تھا۔ رنگ بے شک سانولا تھا۔ مگر نقوش میں
 وہی جاذبیت تھی جو اکثر سانولی رنگت کی حامل خواتین
 میں ہوتی ہے۔ لہذا ننھے میاں کو وہ لڑکی اچھی لگی، مگر
 بہنوں کو ”ہاں ٹھیک ہے“ کہہ کر مطمئن کر دیا۔ جانتے
 تھے کہ اگر پسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کر دیا تو شاید بہنیں
 یہاں شادی ہی نہ کروائیں۔ ان کا روکھا پھیکا ”ٹھیک
 ہے“ سن کر بہنوں کے چہروں پر جواطمینان اتر ا تھا۔ وہ
 ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ آخر کو وہ باہر کی

دنیا میں کام کرنے والے دس طرح کے لوگوں سے ملنے والے شخص تھے۔ لوگوں کے رویوں کو پہچانتے تھے۔ اگر ادب و احترام۔ لحاظ و مروت میں وہ اپنے گھر والوں یا محلے والوں سے زیادہ بات یا بحث نہیں کرتے تھے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ عقل سے پیدل تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی بہنوں کے مزاج کے مطابق ہی رد عمل دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اگلے جمعے کو ان کی بہنیں اور والدہ صنوبر کے گھر پہنچ گئیں۔

صنوبر کے گھر والے خاصے کھاتے جیتے لوگ تھے۔ اپنا کاروبار تھا۔ لہذا مالی طور پر بہت زیادہ نہیں تو کافی مستحکم تھے۔ رہائش کاروبار کی مناسبت سے بے شک کھار اور میں ہی تھی مگر وہ منزلہ کافی کشادہ اور خوب صورت مکان بنا ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کر ہی شوکت جہاں کافی مرعوب ہو گئیں مگر بیٹیوں نے فوراً والدہ ماجدہ کو اصول نمبر ایک سمجھایا کہ لڑکی والوں سے ہرگز متاثر نہیں ہونا بلکہ یہ ہی جتنا ہے کہ وہ رچھوڑ لائن میں رہ کر بھی ڈیننس میں رہنے والوں سے ہرگز کم نہیں۔ لہذا ابواحمیدہ کے ہمراہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ماتھے پر پڑے بلوں کو تھوڑا اور گہرا کیا گیا اور چاروں اماں بیٹیاں پکا سامنہ بنا کہ گھر میں داخل ہوئیں جہاں حسب توقع استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا اور اس رویے نے چاروں کی گردن میں کچھ اور تازہ پیدا کر دیا۔ اب یہ الگ بات کہ جب سموسوں، گلاب جامن، مشای کباب، کسٹرو اور چنا چاٹ سے بھری زالی سامنے آئی تو سارا کروفر وہیں کا وہیں دھرا رہ گیا۔ ہر چیز سے مکمل انصاف کرنے کے بعد بھی نادارہ فتنی نے فرمایا۔

”ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ ہماری کھانے کی دعوت کریں گی، چلیں، اگلی دفعہ جب ہم بھائی کے ساتھ آئیں گے تو کھانا ہی کھا کے جائیں گے۔“ اس بے تکلفانہ انداز پر صنوبر کی والدہ اور بہنیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ مگر ابواحمیدہ نے اپنی پاٹ دار آواز میں نادارہ کو جواب دیا۔

”اے بی بی! خود تو دو سردوں کو بغیر تہی کے چائے پلاؤ اور دو سردوں کے ہاں دعوتوں کی فرمائش کرو۔ واہ بھئی

وام۔ ایسی ڈھٹائی نہ دیکھی۔“ یہ کھری کھری سن کر شوکت جہاں جلدی سے بات سنبھالنے کو بولیں۔

”ارے بوا مذاق کر رہی ہے۔ ابھی بچی ہے۔“ اور اس بچی کی عمر کے بارے میں بوا کا مزید کوئی ارشاد سننے سے پہلے لڑکی کو بلوانے کی فرمائش کر ڈالی۔

صنوبر آئی تو تینوں بہنوں نے حسب مقدور ناک بھوں چڑھائی کہ ظاہر تو یہ ہی کرنا تھا کہ بس پڑھی لکھی لڑکی کی وجہ سے ہاں کر رہے ہیں، ورنہ ہمارے بھائی کو تو لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ صنوبر کے گھر والے یہ سب دیکھ رہے تھے مگر برداشت کرنے پر مجبور تھے کہ ایک تو وہ وضع دار لوگ تھے۔ دوسرے ابواحمیدہ نے اس رشتے کے ہو جانے کی کافی امید دلائی تھی۔ لہذا ان لوگوں نے اپنے طور پر ننھے میاں کے متعلق ضروری چھان بین بھی کروائی تھی اور لڑکے کی شرافت اور اچھی کمائی کا جان کر ان کی دلی خواہش تھی کہ یہاں رشتہ طے ہو جائے اس کے لیے نہ صرف چاروں اماں بیٹیوں کی آؤ بھگت کی جارہی تھی بلکہ ان کی طنزیہ گفتگو کو بھی نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ صنوبر کی عمر تیس برس ہو چلی تھی اور اس معاشرے میں کنواری لڑکی کو گھر بٹھا کر اسے لوگوں کی فضول باتیں سن کر نفسیاتی مریض بنانے سے بہتر تھا کہ ”کچھ لو کچھ دو“ کے حقیقت پسندانہ رویے کو اپناتے ہوئے مناسب رشتہ دیکھ کر اس کو اس کے گھر کا کر دیا جائے۔ روپیہ پیسہ نصیب کا ہوتا ہے اور ساس ننڈیں بھی آخر کار ٹھیک ہو ہی جاتی ہیں اور اولاد ہو جائے تو پھر تو یہ چھوٹی موٹی الجھنیں خود ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ صنوبر کے گھر والوں کو یہ رشتہ مناسب ترین لگ رہا تھا۔

آخر کار سب کی دعائیں رنگ لائیں اور شوکت جہاں اور ان کی بیٹیوں نے صنوبر کے لیے پسندیدگی کا عندیہ دے دیا۔ دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اکرم کے گھر والے عید کے فوراً بعد شادی کرنا چاہتے تھے۔ یعنی شادی کی تیاریوں کے لیے محض دو مہینے تھے۔ صنوبر کے گھر والوں نے بوا حمیدہ سے اتنی جلدی پر اعتراض کیا تو ابواحمیدہ نے

سمجھایا کہ۔

میں ناک کٹنے سے بچ جاتی تھی اور اب اسی بھائی کے لیے وہ بیٹھی زہرا گل رہی تھیں۔

”ہاں تو اچھا ہے نا“ اب ہم بھی ان ہی پیسوں سے کپڑے بنوا میں گئے اور جہاں تک اس کلونی کے کپڑوں کی بات ہے تو ہم زیادہ بھاری کپڑے تو لیں گے ہی نہیں بلکہ کاٹن اور جارحٹ کے ملے کڑھائی والے کپڑے رکھیں گے اور ہاں شاپنگ کے لیے لیاقت آباد (المعروف لالو کھیت) سے اچھی جگہ کوئی نہیں۔ سب سے سستا مال وہیں ملے گا۔ لہذا ٹھیک ٹھاک پیسے بچیں گے جو ہم تینوں آپس میں بانٹ کر اچھی اور مہنگی جگہ سے اپنے لیے کپڑے بنوائیں گے۔“ نادرہ فتنی کا فتنہ خیز دماغ ہمیشہ کی طرح دور کی کوڑی لایا تھا۔

اور پھر اس مشورے پر عمل کرنے کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ بری میں ہلکے ترین کام کے دو شادی کے جوڑوں کے علاوہ باقی سب جوڑے کاٹن یا پرنٹڈ جارحٹ کے تھے۔ جبکہ چیلوں کے نام پر محض دو سینڈلیں موجود تھیں۔ مختلف بچت بازاروں سے گھٹیا کاسمیٹکس کا سامان بھی لیا گیا تھا۔ البتہ ننھے میاں کی تھوڑی بہت تسلی کروانے کے لیے ایک عدد تھلکے جیسا سونے کا سیٹ اور منہ دکھائی کے لیے کانڈ جیسی سونے کی انگلی تھی لے لی گئی تھی۔ اس سارے بچت پلان کے باوجود بہنوں کو قلق ہی رہا کہ اتنے پیسے نہیں بچ سکے کہ وہ اپنے لیے سونے کی کوئی چیز لے سکیں۔ دوسری جانب اکرم عرف ننھے میاں کو صنوبر کے گھر والوں نے ساتھ لے جا کر اچھی مارکیٹوں سے شاپنگ کروائی تھی اور شادی سے کچھ دن پہلے جب جینز کا سامان ان کے گھر آیا تو بھی ہر چیز کی قیمت اور معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ اس پر بھی شوکت جہاں نے اعتراض کیا کہ۔

”کھانے کی میز نظر نہیں آرہی۔“ اب کوئی یہ پوچھتا کہ بی بی دو کمروں کے اس گھر میں ڈائننگ ٹیبل آپ رکھیں گی کہاں؟ کہ دونوں کمرے تو پہلے ہی صنوبر کے بیڈ روم سیٹ، صوفہ سیٹ، ٹی وی اور فریج سے بھر چکے تھے کہ چلنا پھرنا بھی مشکل ہو رہا تھا مگر یہ آئینہ

”اے آج کل جینز بری بنانا کچھ مشکل نہیں“ بس پیسہ ہاتھ میں ہو۔ تم اب فضول کی باتوں میں لڑکی کا رشتہ ہاتھ سے نہ نکالو۔ لڑکے والوں کی مان لو اگر کچھ کمی بیشی رہ بھی جائے تو بعد میں پورا کرتی رہنا۔“ اصل میں دو احمیدہ کو خدشہ لاحق تھا کہ اگر صنوبر کے گھر والوں تک ننھے میاں کے گھر والوں کی زبان دورازی اور تیز طراری کے قصے پہنچ گئے تو کہیں انکار ہی نہ ہو جائے اور ان کو وہ پانچ ہزار لوٹانے پر جا میں جو انہوں نے بڑی دقتوں سے شوکت جہاں سے نکلوائے تھے۔ اوہر ننھے میاں کی جیب خالی کروائی جا رہی تھی۔ تینوں بہنیں ننھے میاں کو جونک کی طرح چمٹ گئی تھیں کہ نہ صرف ان تینوں کو دس دس ہزار نیک دیا جائے گا بلکہ پیاری بھابھی کے لیے بھی زیادہ رقم دی جائے تاکہ وہ زبردست سی بری تیار کر سکیں۔ پس پردہ یہ مقصد کارفرما تھا کہ اس رقم میں سے بھی حصہ بنورا جائے گا۔ ننھے میاں نے بھی کمال فراخ دلی سے دو لاکھ روپے عنایت فرما دیے جس میں ایک لاکھ کا مزید اضافہ کروایا گیا کہ سونے کے نرخ تو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں تو ایک لاکھ کا تو صرف سونے کا زیور ہی آجائے گا۔ باقی دو لاکھ کپڑے، میچنگ جیولری، جوتے وغیرہ کے لیے کافی ہوں گے۔ اب ننھے میاں تو بہنوں کو تین لاکھ تنہا کر شان دار بری کے سنے دیکھتے باہر چلے گئے۔ جبکہ کمرے میں موجود تینوں بہنوں کو اتنی رقم دیکھ کر ہی سکتہ سا ہو گیا تھا۔

”اے آبا! دیکھ رہی ہو بیوی کے لیے کیسے جیب خالی کر کے گیا ہے ہمارے لیے تو کبھی کچھ نہ نکالا۔“ شبانہ سکتے سے باہر آکر بولی اور اپنے بھائی کے لیے کچھ نہ دینے کا شکوہ کرتے وہ اس ساند سامان کو یکسر فراموش کر گئیں جو ہر سال عید، بقرعید، رمضان، شب برات اور اس کے علاوہ ان سب کے بچوں کی پیدائش پر کپڑے، کھلونے، پھل، مٹھائی اور نقد روپیہ یا سونے کی چھوٹی موٹی چیز کی شکل میں ان کا بھائی انہیں دیا کرتا تھا اور تب ان کی زبان شہد چکانے لگتی تھی کہ سسرال

دکھا تا کون؟

کہاں ہے۔ وہ آپ کا بھی بہت اچھا میک اپ کرے گی۔" یہ سیدھا سا جواب سن کر تینوں بہنوں کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں، وہ تو صنوبر کی طرف سے ٹکڑا توڑ جواب کی منتظر تھیں۔ جس کو بنیاد بنا کر کوئی جھگڑا شروع کیا جاسکے، مگر یہ پلان تو ناکام ہو گیا تھا۔ خیر ابھی آگے بہت مواقع تھے جن سے فائدہ اٹھا کر بھابھی کا جینا حرام کیا جاسکتا تھا۔



ولیمہ کے ایک ہفتے بعد ہی کھیر پکوائی کی رسم ادا کر کے صنوبر کے اوپر گھر کی ساری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ اتنی جلدی کام سونپ دینے کا عذر یہ پیش کیا گیا کہ تینوں بہنیں تو اپنے گھر کی ہیں اور اماں سے تو اب اتنا کام ہوتا نہیں تو بھئی اب بہو سب سنبھال لیں، ورنہ کون کرے گا کام۔ صنوبر نے ماتھے پر ایک شکن لائے بغیر بہت خوش اسلوبی سے ساری ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ تین آدمیوں کا کام ہوتا ہی کتنا ہے۔ وہ اپنی جاب جاری رکھتے ہوئے بھی آرام سے گھر سنبھال لے گی، مگر جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ گھر کے تین لوگ تو محض نام کے تھے۔ آئے دن تینوں بہنیں اپنے اپنے بچوں سمیت یکے آدھکتی تھیں اور ان کی آمد کے ساتھ ہی مختلف کھانوں کے فرمائشی پروگرام جاری ہو جاتے تھے۔ وہ بہنیں جو پہلے میکے آنے پر بازار سے کھانے منگوا منگوا کر کھاتی تھیں، اب وہی بازاری کھانے ان کو سخت مضر صحت لگنے لگے تھے۔ لہذا بھابھی سے کہا جاتا کہ بریانی، حلیم، نہاری یا کوئی گھر پر تیار کیے جائیں اور ان مشکل کھانوں کی تیاری میں کوئی بھی اس کی مدد نہیں کروا تا تھا ورنہ ہی اسے کسی قسم کی رعایت دی جاتی تھی کہ وہ رات میں یہ کھانے تیار کر دے۔ سو ہوتا یہ تھا کہ اکثر صنوبر تھکی ہاری گھر میں داخل ہوتی اور اس کا ارادہ یہ ہوتا کہ نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر وہ فوراً آرام کے لیے کمرہ بند کر کے سو جائے گی، مگر سامنے ہی تینوں مندیوں بمعہ بچوں کے

ان ہی باتوں میں آخر شادی کا دن بھی آ ہی گیا اور صنوبر اکرم صاحب کی دلہن بن کر آگئی۔ شادی کی پہلی صبح صنوبر اور اکرم کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر بہنوں کو تھوڑی پریشانی ہوئی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ننھے میاں کو دلہن پسند نہیں آئے گی اور وہ ضرور بہنوں سے شکوہ کریں گے اور یوں ان لوگوں کو صنوبر کو باتیں سنانے اور اپنی مرضی پر چلانے میں آسانی ہوگی، مگر ننھے میاں ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو محض ظاہر کو دیکھ کر زندگی کے فیصلے کر لیتے ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں وہ شعور کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں صورت کی چار روزہ چاندلی پر سیرت کی دائمی خوب صورتی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ صنوبر کی نرم مزاجی اور سلجھی ہوئی طبیعت کو جاننے کے لیے انہیں کسی نجوی کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اس کے لیے ان کا باہر کی دنیا کا تجربہ ہی کافی تھا۔ لہذا وہ خوش اور مطمئن تھے۔ مگر یہ اطمینان بہنوں کا چین اڑا رہا تھا، جب ہی آنکھوں آنکھوں میں تینوں نے اشارے کیے اور ناشتے کے لیے بیٹھے اکرم اور صنوبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرزانہ بولیں۔

"اے بھابھی! رات تو میک اپ سے تمہاری شکل ہی بدل گئی تھی، کالی رنگت کو کیسا صاف بنا دیا تھا پارلروالی نے۔ مجھے بھی پتہ رہنا، میں ولیمہ کا میک اپ وہیں سے کرواؤں گی۔ ویسے تو میں کترینہ لگتی ہوں۔ (اللہ معاف کرے) مگر ذرا ہم بھی دیکھیں کہ وہ صرف بد صورت لوگوں کو خوب صورت بناتی ہے یا خوب صورت لوگوں کو بھی مزید خوب صورت بناتی ہے۔"

آخر میں ٹھٹھا مار کر ہنسیں اور باقی دو بہنوں نے بھی ساتھ دیا۔ اس بے ہودہ جملے پر اکرم صاحب صرف پہلو بدل کر رہ گئے۔ شادی کے پہلے ہی دن بیوی کی حمایت میں کچھ بول کر وہ جو رو کا غلام کا خطاب حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر بہن پر ایک کڑی نگاہ ضرور ڈالی جو انہوں نے کمال صفائی سے نظر انداز کر دی، جبکہ صنوبر بڑے تحمل سے گویا ہوئی۔

"جی ضرور آیا، میں آپ کو ضرور بتا دیتی ہوں کہ پارلر

براجمان ہوتیں اور اس کی شکل دیکھتے ہی کہتیں۔

سب اپنے پاس۔

صنوبر حیرت سے منہ کھولے یہ سب سن رہی تھی۔ اس کے تو سان و گمان میں نہ تھا کہ اس کے دو جملے یہ طوفان لے کے آئیں گے۔ خشک ہوتے گلے اور کپکپاتی آواز کے ساتھ اس نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

”نہیں آیا! میں نے یہ تو نہیں کہا“ میں نے تو صرف۔۔۔“ مگر شوکت جہاں نے اس کو ڈانٹ کر چپ کروا دیا۔

”اری چپ رہ۔ تو ہوتی کون ہے میری بچپوں کو حدیشیں پڑھانے والی، تجھے تو میں ننھے سے ٹھیک کرواتی ہوں۔“ اور صنوبر کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ رات تک وہ وقفے وقفے سے اپنی مندوں سے معافیاں مانگتی رہی، مگر وہاں اکڑ برقرار رہی اور جب ننھے میاں تھکے ہارے گھر آئے تو ”مقدمہ“ نئے سرے سے کھولا گیا اور شبانہ صاحبہ نے رو کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی روداد بھائی کو سنائی۔ توقع یہ ہی تھی کہ ابھی بھائی اٹھ کر بیوی کو چولی پکڑ کر نکال باہر کرے گا۔ مگر اس وقت امیدوں پر پانی پھر گیا جب ننھے نے صرف بیوی پر ایک نظر ڈالی اور سخت آواز میں کہا۔

”آئندہ تم میری بہنوں کے لیے کھانا نہیں بناؤ گی، میری بہنیں تمہاری محتاج نہیں ہیں۔ یہ آئندہ جب بھی آئیں گی تو میں ان کے لیے خاص طور پر باہر سے کھانا لے کر آؤں گا اور آیا“ آپ اب جب بھی آئیں تو بس مجھے ایک فون کر کے بتادیں کہ آپ کو کیا کھانا ہے“ میں فوراً لے کر آ جاؤں گا۔“

آپا تو اتنی عزت افزائی پر نہال ہی ہو گئیں اور صنوبر کو اور تو کچھ سمجھ نہ آیا، بس کمرے میں جا کر زار و قطار روئے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ننھے میاں اندر داخل ہوئے۔ صنوبر نے خفگی سے منہ پھیرا تو ننھے میاں پاس آکر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”لو بھئی یہ بن بادل برسات کیوں؟ اور مجھ سے کیا ناراضگی“ میں نے تو کھانا بھی نہیں کھایا نہ اس میں نقص نکالے تو مجھ غریب پر یہ ستم کیوں۔“

”بڑی دیر لگا دی آنے میں۔ کب سے انتظار میں بیٹھے ہیں کہ تم آؤ تو کھانا بنانے کے کھلاؤ ہمیں۔ بھئی ہم تو اب باورچی خانے میں جاتے نہیں کہ کہیں تم برا مانو کہ میرے گھر میں دخل اندازی کرتی ہیں۔ بھئی ہم نے تو اپنا بھائی اور پورا گھر تمہیں سونپ دیا ہے۔ اب تم جانو، تمہارا کام۔ اب اگر دل چاہے تو کھانا بنا کر کھلاؤ، ورنہ ہم تو گھڑی دو گھڑی کو آتے ہیں، کہو تو وہ بھی نہیں آئیں گے۔“ ایک سانس میں کہی بے ربط باتیں جن کا مقصد صرف صنوبر کو ستانا ہوتا تھا۔ سن کر صنوبر زبردستی مسکراتے ہوئے کہتی۔

”ارے نہیں باجی، آپ کا اپنا گھر ہے، جب چاہیں آئیں۔ میں ابھی کھانا بناتی ہوں۔ بتائیں کیا بناؤں۔“ اور یہ سنتے ہی مختلف فرمائشیں کر دی جاتیں، جن کو پورا کرنے میں وہ ہلکان ہو جاتی۔ کوئی بھی کچن میں آکر نہ اس کی مدد کرواتا، نہ یہ کہہ سکتی تھی۔ ہاں البتہ جب کھانا سامنے آتا تو اس پر نکتہ چینی کرنا حق سمجھا جاتا، یہ سوچے بغیر کہ نہ صرف کسی کی دل آزاری ہو رہی ہے، بلکہ کھانے میں نقص نکالنے کا فعل اللہ کو بھی کتنا گوارا گزرتا ہے۔ ایک دن اسی طرح صنوبر کے بنائے گئے چکن پلاؤ میں خامیاں نکال نکال کر اور بوٹیوں کی کمی کا رونا رو کر کھانے سے انصاف کیا جا رہا تھا تو صنوبر نے ہمت کر کے شبانہ کو ٹوک ہی دیا۔

”آپا حدیث میں ہے کہ اگر کھانا پسند نہ آئے تو اس کو خاموشی سے چھوڑ دو، مگر اس میں نقص نہ نکالو اور جہاں تک بوٹیاں کم ہونے کی بات ہے تو جتنا گھر میں موجود ہو گا اتنا ہی پکاؤں گی نا۔“ بس یہ جائز بات کہنا غضب ہو گیا۔ شبانہ نے وہ داؤدلا مچایا کہ اس پاس کے لوگ اپنے گھروں سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے۔

”ارے اب ہمارا یہاں آنا کھانا اور کچھ کہہ دینا بھی برا لگنے لگا۔ چھ مہینے میں ہی یہ حال ہو گیا۔ تم ہمیں یہ کہہ رہی ہو کہ ہمارے آنے سے تمہارا بٹ خراب ہو جاتا ہے۔ گوشت کم پڑ جاتا ہے۔ ارے آئندہ اپنے گھر سے لے کر آئیں گے کھانے کا سامان، تم رکھو

مذہب خواہین ڈائجسٹ 113 مئی 2015ء

بمشکل ہنسی ضبط کرتی کچن میں جا کر کھانا گرم کرنے لگی۔



صنوبر کے جاب چھوڑنے کی خبر گھر والوں پر بجلی بن کر گری۔ ان چھ مہینوں میں صنوبر نے اپنی ضرورت کے لیے کچھ روپے نکال کر پوری تنخواہ شوکت جہاں کے ہی ہاتھ پر رکھی تھی جسے وہ شروع کے رسمی انکار کے بعد اب اپنا حق سمجھ کر وصولی تھیں اور نہایت آرام سے بیٹیوں اور ان کے بچوں پر خرچ کرتی تھیں۔ اب یوں ان چند ہزار روپوں سے محروم ہو جانا ان کو بڑا کھل رہا تھا۔ اس تنخواہ کو دے دینے کے علاوہ بھی صنوبر اکثر ان چھوٹی موٹی فرمائشوں کو پورا کرتی رہتی تھی جو مندوں کے بچے مامی سے بڑے دھڑلے سے کرتے تھے۔ بیٹ بال، پیانو والا جیومیٹری باکس، بابل ڈول کتنی ہی چیزیں اس نے بچوں کو لا کر دی تھیں اور اس خرچ کے لیے وہ اپنے خرچ میں سے کٹوتی کرتی تھی۔ وہ کوئی فرشتہ صفت قسم کی آسمان سے اتری ہو نہ تھی، مگر ہر لڑکی کی طرح وہ بھی سسرال والوں کو اپنا بنانا چاہتی تھی اور اس کے لیے تھوڑا پیسہ خرچ کرنا کوئی گھماٹے کا سودا نہ تھا، مگر ان چھ مہینوں میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ لہذا جب اکرم نے اسے جاب چھوڑنے کا کہا تو وہ بخوشی مان گئی کہ اس کی اپنی ضروریات تو اکرم پورا کر دیتے تھے اور اس کو یقین تھا کہ وہ اکرم سے جب بھی جتنے پیسے مانگے گی وہ اسے دے دیں گے۔ اتنا اچھا ہم سفر مل جانے پر اس کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔

شوکت جہاں نے ننھے میاں سے صنوبر کی جاب چھڑوانے کی وجہ پوچھی، درحقیقت وہ یہ چاہ رہی تھیں کہ اگر یہ فیصلہ صرف صنوبر کا ہوا تو وہ ننھے میاں پر زور دے کر اس سے جاب جاری رکھوانے کا کہیں گی، مگر ننھے میاں نے کہا۔

”نہیں اماں! کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ جاب کرنے والی لڑکیاں زیادہ سرچڑھنے لگتی ہیں، یہ بھی

”آپ نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ بات ہولی کیا تھی اور بس فوراً فیصلہ سنادیا کہ آئندہ تم کھانا نہیں بناؤ گی۔ یقین کریں، میں نے تو۔“ صنوبر کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ننھے میاں اس کے کندھے کے گرد بازو جمائے کر کے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرا چکے تھے۔

”عقل مند! تم سے کچھ اس لیے نہیں پوچھا کہ میں اچھی طرح اپنی بہنوں کی فطرت سے واقف ہوں کہ انہوں نے مختصر برکا کو اپنا ہوا گا، مگر یہ بات کہہ کر میں تمہارے خلاف کوئی نیا محاذ نہیں کھلوانا چاہتا تھا۔ میں چھ مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ تم گھر، جاب اور مہمان داری کے درمیان کس طرح گھن چکر رہتی ہو، میں بہت دن سے چاہ رہا تھا کہ کم از کم یہ فرمائش کھانے بنانے سے تمہاری جان چھڑواؤں، لیکن یہ کام ایسے کرنا تھا کہ نہ تم بری بنو، نہ مجھ پر بیوی کی حمایت کا الزام آئے اور آج یہ موقع خود آپا نے فراہم کر دیا۔ اب تمہیں ان کی خاطر تواضع کے لیے گھن چکر بننے کی ضرورت نہیں، اب تمہیں کچھ پکانے کو نہیں تو تم معصوم شکل بنا کر کہہ دینا کہ اکرم نے منع کیا ہے، مجھے ڈانٹ بڑے کی اور ادھر میں ان کے فرمائش پر دو گرام پورے کر کے ان کو بھی خوش کر دوں گا۔ اور پکیزا اب تم یہ جاب بھی چھوڑ دو، اگر مناسب سمجھو تو مجھے تمہاری کمائی کی ضرورت نہیں۔ البتہ تم خوشی سے کرنا چاہو تو میں رد کوں گا نہیں۔ اب مجھ غریب بھوکے آدمی کو آج کھانا دیا جائے گا یا نہیں۔“ آخر میں لہجہ متبسم ہو گیا اور صنوبر تو مارے تشکر کے کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اپنے آنسو صاف کر کے وہ اٹھنے لگی تو اکرم صاحب نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”اور ابھی چہرے پر ہنسی اور اطمینان مت لانا، کوئی نہ کوئی دروازے کے پاس ہی کھڑا کن سوئیاں لے رہا ہو گا۔ لہذا جلدی کھانا لاؤ پھوہڑ عورت۔“ آخری جملہ خاصا دھاڑ کر کہا گیا، تاکہ باہر والے سن لیں اور جب صنوبر باہر نکلی تو دروازے کے ساتھ کھڑی نادارہ سٹیٹا کر رہ گئی اور صنوبر اکرم کے اتنے درست اندازے پر

کس ایسی نہ ہو جائے۔ بس یہ گھر بیٹھے اور تمہاری خدمت کرے۔ تمہیں پیسے چاہیے تو مجھے کہو۔“
 ”نہیں، نہیں۔“ کہہ کر ان کی بلائیں لینے لگیں اور دوسرے کے لیے سبزی کا تھی صنوبر، اکرم کی اس چالپوسی پر ان کو دل ہی دل میں داد دینے لگی۔ شوکت جہاں کچھ اس لیے بھی خاموش ہو گئیں کہ صنوبر اب امید سے تھی اور اصل سے زیادہ سود تو پیارا ہوتا ہی ہے۔

جواب چھوڑنے سے صنوبر اور اکرم کا یہ خیال کہ صنوبر کو اس حالت میں آرام مل جائے گا، خام خیالی ثابت ہوا۔ گھر کے کام تو ہوتے ہی تھے اس کے علاوہ اب اس کو زچ کرنے کا ایک اور انداز اپنایا گیا تھا کہ اب جو بھی بند آتی اسے ساتھ ملے کپڑوں کا ٹکڑا اٹھا لاتی کہ بھابھی تو سارا دن گھر پر فارغ ہی ہوتی ہیں سو چا مل کے دھلوادیں گی۔ اب یہ الگ بات کہ ایک دو پھیروں کے کپڑے دھونے کے بعد وہ خود تو بچوں کے تنگ کرنے کا بہانہ کر کے کمرے کی راہ لیتیں اور صنوبر باقی ماندہ کپڑے دھو دھو کے ہلکان ہو جاتی یا پھر صنوبر کو شامی کباب، خنے یا گاجر کا ڈھیر حلوہ بنانے کا آرڈر دے دیا جاتا اور وہ کباب سل پر پیتے پیتے حلوہ بھونتے بھونتے تھک کر چور ہو جاتی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے اور صنوبر اپنا گھر بنائے رکھنے کی خاطر سب کچھ سہہ رہی تھی، مگر اب اس کی جسمانی حالت اس بے تحاشا تسکین کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔
 لہذا ایک دن کچن میں کام کرتے ہوئے وہ بری طرح چکرا گئی۔ بڑی دقتوں سے اس نے اکرم صاحب کو آواز دی اور ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر شوکت جہاں گئے بھی ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔
 بیٹیوں کا ساتھ دینے کے چکر میں وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ کچھ زیادہ ہی زیادتی کر گئی تھیں۔

”اب آئے گی تو کوئی کام نہیں کرواؤں گی۔ ان ٹگوڑ ماریوں کو بھی ڈانٹوں گی کہ بھابھی کا خیال کریں۔ اے میرے بچے کی نسل آگے چلنی ہے۔ کم بختوں نے میری مت بھی مار دی ہے۔“ ننھے میاں کے ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آنے تک وہ یوں ہی صحن میں چکر کاٹتی

وعدے وعید کرتی رہیں، مگر جب ننھے تنگہ میں داخل ہوئے تو وہ حیران ہو کر ان کی طرف لپکیں۔
 ”دلہن کہاں ہے؟ کہاں چھوڑ آئے؟“ ننھے میاں نے ماں پر ایک کھلی نگاہ ڈالی اور اپنے ابلتے غصے پر قابو پا کر بولے۔

”صنوبر کو اس کے میکے چھوڑ آیا ہوں، وہ اب ڈلیوری تک وہیں رہے گی۔ میں اس کا سامان لینے آیا ہوں، تاکہ لے جا کے دے دوں اسے۔“

”مگر کیوں؟“ ابھی تو چار مہینے باقی ہیں اور ہمارے ماں ایسا کوئی رواج نہیں کہ بہو میکے جا کر رہے اور بچے کی پیدائش وہیں ہو۔ میں جا کر اسے لے آتی ہوں۔“ شوکت جہاں یہ سب کچھ بہت دل سے بہو کی محبت میں کہہ رہی تھیں۔ مگر ننھے تو ان پر الٹ ہی پڑے۔

”کیوں؟ کیوں لے کر آئیں گی آپ اسے؟ تاکہ وہ یہاں کو لہو کے نیل کی طرح پھر سے کام کرے؟ اس کا انسان ہونا آپ لوگوں کو نظر نہیں آتا جو آپ لوگ حد سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالتے ہیں۔ میں اگر کچھ کہتا نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تجھے کچھ نظر بھی نہیں آتا۔ ایک سال میں آپ لوگوں نے اتنی زیادتیاں کی ہیں اس کے ساتھ کہ میں تو حیران ہوں کہ کیا سکے بیٹے کی بیوی سے بھی اتنی نفرت کی جاسکتی ہے؟ اور اب تجھے جو رو کے غلام کا طعنہ مت دیجئے گا۔ آپ خود بھی جانتی ہیں کہ آپ نے زیادتی کی ہے، میں صرف آئینہ دکھا رہا ہوں۔ وہ ہرگز یہاں نہیں آئے گی، اب ڈلیوری تک۔ اب خود سنبھالیں، اپنا گھر آپ اور آپ کی بیٹیاں۔“

دونوں طرف توازن رکھنے کے خواہش مند ننھے میاں، ”آج بول پڑے تھے کہ شاید یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ جس میں توازن رکھنا ناممکن نہ سہی تو بہت مشکل ضرور ہے، اور شوکت جہاں مزید کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کو افسوس اور شرمندگی ضرور تھی، مگر جب شانہ کو فون پر ساری گفتگو سنائی تو شانہ جھٹ میکے آپہنچیں اور بھائی کو سخت ست کہا، جس کا اکرم صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنی اماں کو سمجھایا کہ۔

”ہرگز بہو کے لیے اب نرم کرنے کی ضرورت

بذخواتن ڈائجسٹ 116 مئی 2015ء

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نہیں، ورنہ سرچڑھ کرنا چے کی۔ وہ میکے جا کر بیٹھ گئی، تم سے اجازت بھی نہ لی۔ ارے ناراض ہونا تو تمہارا بننا ہے۔“ اس قسم کی باتیں کر کے انہوں نے شوکت جہاں کو خوب مطمئن کر دیا اور جب صنوبر نے بیٹی کو جنم دیا تو نہ شوکت جہاں اسے دیکھنے گئیں اور نہ ہی ان کی بیٹیاں۔ اس رویے پر جہاں ننھے میاں کو شدید دکھ ہوا، وہیں صنوبر کے گھر والوں نے بھی شکوہ کیا، مگر اکرم صاحب محض خاموش رہنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ بات صرف خفگی اور ناراضگی تک رہتی تو ٹھیک تھا، مگر جب صنوبر بچی کو لے کر واپس سسرال پہنچی تو چاروں ساس، مندوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ صنوبر کی والدہ، بہن اور بھائی اس کو چھوڑنے آئے تھے اور اس دفعہ وہ بھی خاموش نہیں رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نادارہ نے صنوبر کو پھیر مارا اور بچی کو بھی اس کی گود سے چھیننے کی کوشش کی۔ اس پر صنوبر کے گھر والے مزید بھر گئے اور پولیس بلوائی۔ وہ تو بھلا ہو کسی محلے والے کا جس نے اکرم صاحب کو بروقت بلوایا اور انہوں نے اپنے سسرال والوں کی منت سماجت کر کے معاملہ ٹھنڈا کر دیا۔

صنوبر کو انہوں نے واپس میکے جانے کا کہا اور یہ بھی کہا، کچھ دن میں، میں خود آکر تمہیں لے جاؤں گا۔ ماں، بہنوں سے انہوں نے کچھ نہیں کہا، نہ گلہ، نہ شکوہ کیا، مگر اگلے دن جب دو کمروں کے مکان کے اوپر مزید دو کمرے بننے شروع ہوئے تو بہنوں کے داؤد اٹھانے پر انہوں نے صرف اتنا کہا۔

”جب دلوں میں اتنی نفرت ہو تو الگ رہنا ہی بہتر ہے۔ میں چالیس سال کی عمر میں اب دوسری شادی نہیں کر سکتا، نہ ہی اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ سکتا ہوں۔ میری زندگی کے بہت سے قیمتی سال ازدواجی خوشیوں کے لیے ترستے گزرے ہیں، مزید سال برباد نہیں کر سکتا۔ میری بیوی پر صرف میری خدمت کرنا فرض ہے۔ تمام سسرال والوں کی نہیں، اور یہ حق اسے دین

دیتا ہے اور اگر یہ حق نہ ہوتا تب بھی میری بہنیں سسرال سے الگ رہتی ہیں تو وہ کیوں نہیں۔ تم لوگوں کا خیال میں ویسے ہی رکھوں گا، لیکن اب تم لوگ اوپر

کے حصے میں نہیں آؤ گے، نہ ساتھ کھاؤ گے۔“ یوں ننھے میاں۔ صنوبر کے ساتھ اوپر شفٹ ہو گئے۔ صنوبر اماں کو کھانا پہنچا دیتی۔ جب وہ بیمار ہوتیں تو حتی المقدور تیمارداری بھی کرتی، لیکن مندوں کو اب کھانا خود ہی پکانا پڑتا ہے۔ وہ جب بھی آئیں، لہذا اب ان کا آنا بھی برائے نام رہ گیا ہے۔ ننھے میاں اب بھی بہنوں پر ویسے ہی کھلا خرچ کرتے ہیں، لیکن وہ بے تکلفی اور اپنائیت اب ان کے رویے سے مفقود ہے جو پہلے بھی اور خود اب بہنیں بھی ان سے کچھ کہتی جھجکتی ہیں کہ اب شوکت جہاں بھی بیٹیوں کو برا بھلا کہتی ہیں کہ جن کے کمرے میں آکر انہوں نے ہمیشہ بہو کو پرایا ہی سمجھا۔ انہوں نے ننھے میاں سے کئی دفعہ بہو سے معافی مانگنے کے لیے کہا، جس پر ننھے میاں ان کے پیر پکڑ کر کہتے ہیں۔

”اماں تم مجھے گناہ گار نہ کرو۔ مگر یہ شیشہ جو ٹوٹ گیا اسے ٹوٹے ہی رہنے دو، اس کو جو ٹوگی تو بھی دراڑ ہمیشہ رہے گی۔“

ننھے میاں کا الگ رہنے کا فیصلہ شاید غلط ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اس فیصلے کی حد تک ان کو پہنچانے والے رویے کیا ٹھیک تھے؟ اگر معاشرے میں ہر دوسرے گھر میں بہو کے ساتھ روار کھے جانے والا یہ رویہ ہندوؤں کے رسم و رواج کا مرہون منت ہے، تو ان رسوم سے علیحدہ ہوئے تو ہمیں نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہو گیا ابھی بھی ذہن و دل اتنے تنگ کیوں؟ بہو نہ گھر سے بھاگ کر آتی ہے، نہ خرید کر لائی جاتی ہے، پھر ہمیشہ پرانی کیوں ہوتی ہے؟ بہو کے ساتھ کچھ بھی برا کرتے یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ وہ بیٹے کا نصف ہے۔ اس کو تکلیف دینا بیٹے کو بھی تکلیف دیتا ہے؟ اگر ننھے میاں الگ نہ ہوتے تو جلد یا بدیر یا تو وہ خود یا گل ہو جاتے یا صنوبر کو طلاق دے دیتے تو کیا یہ حل قابل قبول ہے؟ شوکت جہاں کے مرنے کے بعد کیا ان کی بیٹیوں کے

لیے کوئی مہکمہ ہو گا۔ جہاں آکر وہ اپنے دکھ سکھ کہہ سکیں؟ اگر وہ بھابھی کو تھوڑی سی عزت و تکریم دے دیتیں تو کیا بھائی کے دم سے میکے کا مان برقرار نہیں رہتا؟



ازیت ہر تکیا تک۔ بیسے ملائی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

اس کا موبائل پینٹل کئی گھنٹوں سے مسلسل بج رہا تھا۔ وہ بے حس بیٹھی رہی۔ موبائل چیخ چیخ کر خاموش ہو جاتا اور پھر پندرہ منٹوں بعد پھر سے بختے لگتا۔ اب پھر موبائل بجنا شروع ہو چکا تھا۔ عمر کی مستقل مزاجی کی حد تھی۔

ریحان نے اپنا بھاری ہوتا سر گھٹنوں سے اوپر اٹھایا۔ بے تحاشا رونے کے باعث آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی اکڑے وجود کے ساتھ وہ بیڈ تک آئی۔ اپنی جگہ سے اٹھنے اور بیڈ تک آنے کے لیے اسے بے حد جسمانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جوڑ جوڑ سے چیخ اٹھتا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور فون

کمرے کا دروازہ بند تھا مگر قفل نہیں تھا۔ کمرے کی ساری بتیاں بجھادی گئی تھیں۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے گرے ہوئے تھے لیکن پھر بھی دروازے کی درز سے ہلکی سی روشنی کی لکیر سی کمرے میں دال ہو کر اس کمرے اندھیرے کو پیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ریحان فرش پر بچھے کارپٹ پر سر گھٹنوں میں دیے اور دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ وہ رورور کر تھک چکی تھی مگر درد تھا جو کسی صورت کم نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں مسلسل گریہ وزاری سے سرخ ہو رہی تھیں اور پونے بے حد بھاری۔ کئی گھنٹوں سے ایک ہی زانیے سے بیٹھنے کی وجہ سے جسم اکڑ گیا تھا۔ مگر اسے جسمانی تکلیف کی پرواہ ہی کب تھی۔ جو درد اسے قریبی رشتوں سے ملا تھا اس کے بعد سے تو ہر

عزیز ولی

پس گویا سیر کر



ریسوا کیا۔
 ”ریحان۔ تم نے کیا سوچ کر مجھ سے اتنی گھٹیا
 بات کی۔ بولو؟“ عمر کی سرد آواز اس نے سنی۔ اس کی
 آنکھیں پھر سے نیرہانے لگیں۔
 ”میں پچھلے چار گھنٹوں سے تمہیں مسلسل فون
 کر رہا ہوں تم فون ریسو نہیں کر رہیں میرے میسجز
 کا جواب بھی نہیں دے رہیں۔ تمہیں لگ رہا ہے میں
 تمہیں بخش دوں گا۔ تمہیں اس کا جواب ضرور دینا
 پڑے گا۔“ غصے اور پریشانی میں ڈوبی عمر کی آواز۔ اس
 نے اپنی سسکی روکی۔
 ”عمر۔ میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا ہے۔ وہ بہت
 سوچ کر کہا ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں بہتر ہے تم بھی

ناولٹ



اس فیصلے کو قبول کر لو اور تمام کاغذی کارروائی کر کے مجھے طلاق نامہ بھیج دو۔ خدا حافظ۔“

رحمات نے یہ تمام جملے ادا کرتے وقت اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی اس کی آواز لرزتی رہی۔ عمر نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی فون ہٹ دیا تھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے اسکرین کو گھورتی رہی۔



وہ سر پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ صبح اچانک ہی رحمت کا فون آیا اور اس نے اپنی طرف سے سارے رشتے ختم کر ڈالے۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وجہ بتانے پر وہ راضی نہیں تھی۔ وہ مستقل اس کا نمبر ملا رہا تھا۔ اور جب اس نے فون اٹھایا بھی تو کیا کہا۔؟ اس کی آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ روئی رہی ہے اور بات کرنے کے دوران بھی وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ عمر کو اس بات کا احساس ہو اس لیے اس نے اپنے لہجے کو مزید گھور بنا لیا ہے۔ مگر عمر کو کیسے معلوم نہ ہوتا۔؟ وہ تو اس کی سانسوں میں بستی تھی۔ وہ اس سے بے خبر کیسے ہو سکتا تھا؟ عمر کو اندازہ تھا کہ وہ خود پر جبر کر کے اس سے بات کر رہی ہے۔ اس لیے اس نے فون کاٹ دیا۔

عمر نے کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا موبائل اپنی نیلی جینز کی پاکٹ میں ڈالا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

رحمات کا وہ فضول سا فون آتے ہی اسے اس سے ملنے کے لیے جانا چاہیے تھا۔ یہ اتنے سارے گھٹنے ضائع کرنے کے بجائے آمنے سامنے ہو کر اس سے سیدھی بات کرنی چاہیے تھی۔ اسے بھروسہ تھا کہ اگر وہ اس کے سامنے ہو گا تو وہ اسے اصل وجہ بتا دیتی اور

شاید اب تک معاملہ سلجھ بھی چکا ہوتا۔

وہ خود کو ملامت کرتا تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ نگاہ ضوفشاں بیگم پر پڑی۔ وہ نفیس سی ساڑھی پہنے

کہیں جانے کے لیے تیار لکڑی تھیں۔ بیڑمیاں اترتے عمر کو دیکھ کر وہ اس کے قریب آئیں۔

”شکر ہے کہ تم گھر پر ہو؟“ عمر نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ضوفشاں نے بے حد غور سے اس کے حلیے اور پریشان چہرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہ عمر کی انگلیوں میں دبی چابی پر بھی پھر وہ بڑے آرام سے گویا ہوئیں۔

”مجھے ضروری کام سے جانا ہے اور تمہارے پیاباب تک نہیں پہنچے۔ نجانے وہ کب آئیں، تم ہی مجھے ڈراپ کرو۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ عمر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ ضوفشاں بیگم پھر سے بولیں۔

”قالبا“ تم بھی کہیں جا رہے ہو“ اس سادہ اور لا پرواہ حلیے میں وہ صرف اور صرف رحمت سے ملنے ہی جاسکتا ہے۔ یہ بات انہیں اچھی طرح معلوم تھی اور انہیں تو یہ بھی معلوم تھا کہ رحمت نے اس سے شادی سے انکار کر دیا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس سے ملے۔ عمر کو روکنے پر تو وہ قادر نہیں تھیں لیکن اسے زچ تو کیا جاسکتا تھا سو وہ کر رہی تھیں۔ ذوالقرنین نے انہیں کہا تھا کہ وہ راستے میں ہیں اور پہنچنے والے ہیں مگر پھر بھی وہ عمر سے ڈراپ کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ عمر نے انہیں جواب دینے کے بجائے جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ملا دیا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ اور تم مجھے

جواب دینے کے بجائے فون کے ساتھ لگ گئے۔“

انہیں عمر کی یہی حرکتیں غصہ دلاتی تھیں کہ وہ انہیں اذیت دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

”پاپا! آپ کتنی دیر میں پہنچ رہے ہیں؟ ممی بڑی بے

مبری سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ وہ طنزیہ ان کی

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ عمر کی چالاکی پر وہ سلگ کر رہ گئیں۔

”او کے ٹھیک ہے“ خدا حافظ۔“ اس نے فون

کاٹ کر موبائل پھر سے پاکٹ میں رکھا اور ان کی

طرف دیکھا۔

”پاپا کہہ رہے ہیں وہ پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گے اور آپ تب تک اپنا میک اپ ٹھیک کر لیں۔ آپ کی ٹھوڑی پر لپ اسٹک لگ گئی ہے۔“ وہ آخری سیڑھی سے چکنے فرش پر قدم رکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے بولا۔ وہ جو اسے خوب سنانے کا ارادہ رکھتی تھیں فوراً کمرے کی جانب بھاگیں۔ عمر کو ان کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ان کی ٹھوڑی پر لپ اسٹک نہیں لگی تھی لیکن وہ اس وقت ان کے سوال و جواب میں الجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ان کے جاتے ہی باہر کی جانب بڑھ گیا۔



روتے روتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے اس نے یک دم آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے بے حد قریب بیٹھا تھا اسے لگا وہ خواب دیکھ رہی ہے اتنا حسیں خواب اس نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔ ہڑبڑائی تب جب اس کے ہاتھ پر عمر کے ہونٹ ثبت ہوئے تھے۔ وہ جھٹکا کھا کر اٹھی وہ سامنے بیٹھا اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح خائف ہوئی تھی۔ اس نے چہرہ موڑ کر تکیے پر بڑا دوپٹا اٹھا کر اپنے گرد لپیٹا۔ اس ساری کارروائی کے دوران وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ریحاب کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ عمر کا یوں بلا اجازت اس کے کمرے میں آنا اور استحقاق سے بیٹھنا ان سب نے اس کے غصے کو برمھادیا۔

”تمہیں مجھے یہاں دیکھ کر ضرور حیرت ہو رہی ہوگی کہ انکل کی غیر موجودگی میں گھر کیسے آگیا بلکہ سیدھا تمہارے کمرے میں ہی آگیا۔“ وہ ریحاب کا سرخ چہرہ دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ وہ گردن موڑے بیٹھی رہی جیسے وہ یہ ساری گفتگو دیواروں سے کر رہا ہو۔

”مجھے تم نے یہاں بلایا ہے ریحاب۔“ اس الزام پر ریحاب نے شدید غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر مجھ سے ملنے کے لیے تمہارا دل اتنا ہی بے قرار تھا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا۔ میں آجاتا۔ اتنا بڑا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ بیڈ پر پھیل کر بولا۔ یوں کہ اس کا کندھا ریحاب کے کندھے سے لگ گیا وہ پیچھے ہوئی مگر عمر نے اپنا بازو اس کے گرد حائل کر دیا۔ ریحاب اچھنبے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ کل رات سے شدید اذیت برداشت کر رہی تھی۔ ہزار جتنوں کے بعد اس نے عمر سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ کتنی تکلیف اٹھا رہی تھی وہ یہ سن کر کہ... اور عمر۔ اسے یہ سب مذاق لگ رہا تھا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ شدید غصے سے اس کی گویائی ہی سلب کر لی تھی۔ مگر آنکھوں کو بننے کا بہانا مل گیا تھا۔ عمر اسے روتا دیکھ کر گر بڑا گیا۔

”ریحاب۔ کیوں رو رہی ہو؟“ وہ پریشان سا پوچھ رہا تھا۔ وہ اور شدت سے روتے لگی۔

”پلیز۔ خاموش ہو جاؤ اور بتاؤ آخر کیا ہوا ہے؟“ وہ اس کے ہاتھ اس کے چہرے پر سے زبردستی ہٹا کر بولا۔ ”آپ یہاں سے جا میں بس۔“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ عمر نے بے چارگی سے اسے دیکھا وہ اسے دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ اگر اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتی تو سارا غصہ بھول جاتی۔

”ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا لیکن ایک شرط پر۔“ وہ جانتی تھی کہ اس کی شرط کیا ہے۔

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنا زیادہ کیوں رو رہی ہو؟“ وہ اس سے قطع تعلق کی وجہ دریافت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے یوں بلک بلک کر رونے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ حالانکہ گھر سے نکلنے سے پہلے اور یہاں پہنچنے تک اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس سے اس فضول بات کی وجہ پوچھ کر ہی ملے گا مگر اسے روتا دیکھ کر اسے بس یہی پوچھنا یاد رہا تھا عمر کی آنکھوں میں اپنے لیے بے تحاشا محبت دیکھ کر وہ نگاہ چراگئی۔

اجازت نہیں دے سکتا۔ تم پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ جیتے جی بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ یہ بات اپنے اس بچکانہ ذہن میں بٹھالو تو بہتر ہے۔“ عمر نے انتہائی سخت لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی اور اسے چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ ریحاب ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

عمر کا یہ جارحانہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ آج تک وہ اس سے نرمی سے پیش آتا رہا تھا۔ کسی گہرے سایہ دار درخت جیسا تھا وہ۔ دونوں کا نکاح ہوا تو وہ بھی آہستہ آہستہ اس کی محبت میں مبتلا ہونے لگی تھی۔

عمر سے دور ہونے کا فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی، مگر اس فون کال کے بعد تو جیسے اس نے خود یہ فرض کر لیا تھا کہ اسے ہر صورت عمر سے دور رہنا ہے۔ ایک مرد نے اس کا بھروسہ توڑا تھا۔ دنیا کے سارے مردوں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔



عمر بے حد شرمندہ تھا کہ اس نے ریحاب پہ ہاتھ کیوں اٹھایا۔ وہ خود کو ملامت کرتا رہا۔ ساری رات وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پایا۔ ریحاب کا روتا اداں چہرہ، بے چین نگاہیں، خود سے بھی کوئی راز چھپاتے ہنسیا تے لب ساری رات نگاہوں میں گھومتے رہے۔ عمر کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ کانٹوں پر رات گزارنا کیا ہوتا ہے۔

آخر ایسا کیا ہو گیا تھا جو وہ اس حد تک جانے کا سوچ رہی تھی؟ اگر اسے مجھ سے کوئی شکایت ہوتی، وہ کم از کم ایک بار تو مجھ سے کہتی، لیکن اس سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہے۔ کہیں ضوفشاں مہی نے تو نہیں ریحاب میرے اور ان کے تعلقات کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے۔ ان کے کسی جھوٹ پر تو وہ یقین کر ہی نہیں سکتی پھر وہ وجہ اگر میری فیملی سے نہیں تو کیا خبر انکل یا منال سے متعلق ہو۔ لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس سب میں میری کیا غلطی؟ وہ پوری

”یہاں جو کچھ بھی ہوا اس میں کیا عمر قصور دار ہے؟“ وہ پھر سے سوچنے لگی۔ اس کا دل کچھ اور کہہ رہا تھا اور دماغ کچھ اور۔ اسے صرف وہ کرنا تھا جو دماغ نے سمجھایا۔ دل کی تمام دلیلیں، تمام ثبوت دماغ نے رد کر دیے تھے۔

”یقین آپ سے اپنا ہر تعلق ختم کر چکی ہوں۔ میرا اب آپ سے کوئی رشتہ نہیں تو پھر میں ایک انجان شخص کو اپنے آنسوؤں کی وجہ کیوں بتاؤں؟“ دل اور دماغ کی اس جنگ میں دماغ جیت گیا تھا۔ ریحاب کے آنسو گھم گئے تھے۔ اس کی آواز میں اب مضبوطی اور بے حد اجنبیت بھی تھی۔ عمر حق دق اسے دیکھنے لگا۔

”ریحاب۔“ اس ایک پکار میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دکھ، حیرانی، تکلیف۔ اس نے چہرہ موڑ لیا۔ عمر نے کندھوں سے تمام کراہی سمٹ موڑا۔

”میرا اور تمہارا تعلق اتنا کمزور ہرگز نہیں کہ ایک جھٹکے سے ٹوٹ جائے“ میں جانتا ہوں کہ ضرور کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے اور اس نے تم پر بہت منفی اثرات مرتب کیے ہیں اور اسی کے زیر اثر تم پہ سب کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی دن میں تم بالکل نارمل ہو جاؤ گی۔ مجھے تم ساری حقیقت بتا دینا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ریحاب نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے۔

”مجھے جو فیصلہ کرنا تھا وہ میں کر چکی ہوں۔ اب چاہے جتنا بھی وقت گزر جائے، میں اس فیصلے کو تبدیل نہیں کرنے والی۔ مجھے ابھی طلاق چاہیے۔“ اس نے سرد مہری سے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔ عمر کا ہاتھ بے ساختہ اٹھا۔ ریحاب گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”آج کے بعد اگر تمہاری زبان پر غلطی سے بھی طلاق کا لفظ آیا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا اور میں دیکھتا ہوں کہ کیسے تم مجھ سے رشتہ توڑ لی ہو۔ ساری دنیا سے لڑ کر تمہیں میں نے اپنے نام لکھوایا ہے مسز ریحاب عمر۔ اتنی آسانی سے میں تمہیں اپنی دنیا

رات اسی طرح اندازے لگاتا اور رد کرتا رہا۔
صبح ہوتے ہی اس نے ارادہ کیا کہ وہ آج پھر جائے گا
اپنے دوستوں کی معافی مانگ کر اس سے حقیقت
اگلو آنے کی کوشش کرے گا۔ بغیر کپڑے تبدیل کیے
صرف چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر اس نے
اپنی سرخ آنکھوں کی جلن کم کرنے کی کوشش کی اور
باہر نکل آیا۔

صبح سات بجے کا وقت تھا۔ گھر کے لوگوں کی صبح
بہت دیر سے ہوا کرتی تھی اور آج تو ویسے بھی اتوار تھا
بارہ بجے کے بعد ہی کسی کا چہرہ دیکھنے کو ملتا، مگر جب وہ
لان میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ صوفشاں بیگم لان میں
واک کرتی پائی گئیں۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ
جلدی سے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کہ ان کی نگاہ اس
پر پڑی۔ ان کے پکارنے پر بیزار سا ہو کر پلٹا۔
”صبح صبح ایسی حالت بنا کر کہاں جا رہے ہو؟“
انہوں نے انگلی سے اس کے حلقے کی طرف اشارہ
کر کے کہا۔

”میں اپنے دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔“ وہ
ناچاٹے ہوئے تجھی چھپا گیا۔
”تمہارا ایسا کون سا دوست ہے ریحاب کے علاوہ
جو اتنی صبح صبح بیدار ہو جاتا ہے بلکہ تمہیں اتنی
ایمر جنسی میں بلاتا ہے کہ تمہیں کپڑے تک بدلنے کا
ہوش نہیں رہتا۔“ ایک تو تفتیش اس پر طنز۔ وہ غصے
سے پلٹا۔

”ہاں۔ میں ریحاب سے ملنے جا رہا ہوں۔ آپ کو
کیا اعتراض ہے؟“
وہ مسکرا میں۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اور اعتراض ہو گا بھی تو
کیوں؟ آخر کو وہ تمہاری دلاری منکوحہ ہے۔ دن ہو یا
رات، تم کسی بھی وقت اس سے ملنے جاسکتے ہو۔“
انہوں نے ہنستے ہوئے اس پر چوٹ کی۔ انہیں اچھی
طرح اندازہ تھا کہ عمر کی اس حالت کے پیچھے ریحاب لی
نی کا ہی ہاتھ ہے۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ
عمر، فکیل صاحب کی غیر موجودگی میں اس سے ملنے

جائے۔ وہ ہفتے دو ہفتے بعد ہی ان کے گھر جاتا تھا، وہ بھی
کچھ دیر کے لیے، لیکن کل نہ صرف وہ ان کے گھر گیا
تھا بلکہ ساری رات اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہی
تھی اور اب اس کی سرخ آنکھیں، فکر مند چہرہ سارے
راز اگل رہا تھا۔

”آپ کو کوئی اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے کیوں
کہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آپ کے کسی
اعتراض کو کبھی خاطر میں نہیں لایا اور نہ ہی کبھی لاؤں
گا۔“ وہ بھی عمر تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے ان کا
جواب سننے کی زحمت نہیں کی تھی۔

جب وہ ریحاب کے گھر پہنچا تو زینت صفائی میں
لگی ہوئی تھی۔ عمر کو اتنی صبح دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئی۔
نوکرانی بھی وجہ دریافت تو کر نہیں سکتی تھی۔ البتہ
فورا ”سلام کیا۔“

”وعلیکم السلام! منال بی بی کہاں ہیں؟“ اس نے
پوچھا۔

”جی وہ تو دو دن سے اپنے گھر گئی ہوئی ہیں۔ آپ کو
نہیں معلوم؟“ زینت کے جواب پر اس کا ماتھا ٹھنکا۔
کل اسے منال کا پوچھنے کا ہوش نہیں تھا اور آج جب
پوچھا تو وہ یہاں تھی ہی نہیں۔

”آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟“ وہ اپنے آپ سے
مخاطب ہوا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے
ریحاب کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ روشنی کے کمرے
میں پہنچتے ہی ریحاب نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے
تھے۔

”ریحاب!“ عمر کی بے قرار آواز پر بھی وہ ٹس سے
مس نہ ہوئی۔

”آئی ایم ریلی سوری۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔
ریحاب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تمہاری طلاق والی بات نے میرے ہوش و حواس
سلب کر لیے تھے۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔
تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں۔ تم
میرے لیے، میری سانسیں چلتی رہنے کے لیے
ضروری ہو۔ اگر ریحاب نہیں تو عمر زاد القرمین کے لیے

زندگی نہیں۔ تم اتنی آسانی سے مجھے موت کیسے دے سکتی ہو؟ کیسے مجھے اپنی زندگی سے نکال سکتی ہو؟“ عمر کے لفظوں میں سچائی کی محک اور جذبات کی تربیت تھی۔ ریحاب کا دل کانپ گیا۔ وہ بے آواز رونے لگی۔ ”تمہارا یوں رونا ثابت کرتا ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میرا ساتھ تمہیں قبول ہے۔ تم بھی میرے سنگ اپنی زندگی گزارنے کی خواہش مند ہو۔ تو پھر یہ انکار کیوں؟ کیوں تم ہماری سیدھی سادی زندگی کو پرچہ راستوں پر گھسیٹ رہی ہو؟“

وہ بہت بے چین سا پوچھ رہا تھا۔ ریحاب نے تمام تر ہمت مجتمع کی اور اس کی طرف دیکھا۔

”عمر! مجھے آپ سے محبت ہو یا نہ ہو، وہ الگ کہانی ہے مگر مجھے آپ پر بھروسہ نہیں۔“ ریحاب کے اس ایک جملے نے ہی عمر کی ذات ہلا کر رکھ دی۔ عمر کے ہاتھوں میں دبا اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ریحاب نے اس سے آنکھیں نہیں چرائی تھیں، وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی وہی کہانی سن رہی تھیں جو ریحاب کی زبان نے سنائی۔ یہ جملے ادا کرتے اس کی زبان لہجے بھر کے لیے بھی نہ لڑکھرائی۔ وہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ پایا۔

”تم نے مجھ میں ایسی کون سی خرابی دیکھ لی جو تمہارا مجھ پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا۔“ وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”اچھا۔ آپ میں تو جیسے کبھی کوئی خرابی تھی ہی نہیں۔“ ریحاب کے طنز اف۔

”وہ میرا ماضی تھا اور میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔“ اسے لگا وہ اپنی صفائی دے رہا ہے یہ احساس ہوتے ہی وہ ایک دم چپ کر گیا۔

یہ وہ ریحاب نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ وہ حیران پریشان سا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر عمر نے اسے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ ریحاب نے اس کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھنے لگی۔ وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چلا گیا۔ کمرے کے

دروازے کے پار آکر اس نے عمر کا ہاتھ چھو ڈیا۔

”آج کے بعد میرے دل کے اور میرے گھر کے دروازے آپ پر بند ہیں۔ انہیں کھولنے کی کوشش بھی کی تو آپ بہت نقصان اٹھائیں گے۔“

وہ ایک قدم کمرے کے اندر رکھتے ہوئے بولی۔ وہ اب تک شاک میں تھا۔ ریحاب کا ارادہ بھانپ کر اس نے بند ہوتے دروازے کو دھکا دیا۔ اگر آج اس نے دروازہ بند کر دیا تو معاملہ اور خراب ہو جاتا۔ بگڑ جاتا۔ وہ خود انا میں آجاتا اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے رشتے کو وہ انا کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ریحاب کو دروازہ بند کرتے دیکھ کر دروازے کو دھکا دیا تھا۔ ریحاب کی درد سے بھری چیخ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ دروازہ ریحاب کے سر سے بری طرح ٹکرایا تھا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر گئی، گرنے کی وجہ سے اس کا پاؤں مڑ گیا تھا۔ ماتھا ایک طرف سے پھٹ گیا تھا اور اب خون رس رہا تھا۔ عمر بھاگ کر اندر آیا۔

”پلیز یار۔ غصہ بعد میں کر لیتا، جتنا لڑنا ہے لڑ بھی لینا، پر ابھی اٹھو اور ڈاکٹر کے پاس چلو۔“ اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ پاؤں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ پٹھے ہوئے ہونٹ اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا، مگر وہ ڈھیٹ بنی اپنا بازو چھڑا رہی تھی۔ عمر کو اس کی ڈھشائی پر شدید غصہ آیا۔

”تم اگر اب نہیں اٹھو گی تو تو میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔ ریحاب ڈر سی گئی۔ عمر نے اب اسے سہارا دیا تو وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بمشکل بیڈ تک آئی۔ عمر نے فرسٹ ایڈ باکس ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالا۔ اس سے پہلے کہ وہ باکس کھولتا۔ ریحاب نے غصے سے باکس چھینا اور خود ہی اپنے زخم صاف کرنے لگی۔

”ہو گئی میری ٹرینمنٹ۔ اب آپ جائے یہاں سے۔“ لہجہ اور انداز دونوں روکھے تھے۔ عمر نے کچھ دیر اسے دیکھا۔

”انکل واپس آجائیں تو میں ان سے رخصتی کی بات کروں گا اور اگر تم نے ان کے ساتھ کوئی فضول بات کی تو پھر مجھ سے کوئی گلہ مت کرنا۔ تم میری بیوی ہو۔ میں تمہیں عزت سے رخصت کروا کر لے جانا چاہتا ہوں، لیکن تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو پھر میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔ اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں یہ بھی یاد رکھنا۔“ ساری نرمیاں بالائے طاق رکھ کر وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی مگر انداز ایسا تھا کہ وہ گھبرا سی گئی۔

”اگر آپ نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان لے لوں گی، مگر آپ کا نام جوڑے رکھنے کی اذیت میں برداشت نہیں کروں گی۔“ وہ چیخ کر بولی۔ عمر کے اچھے قدم رک گئے تھے وہ اس کی جانب پلٹا اور نہایت سرد انداز میں اسے دیکھا۔

”تو ٹھیک ہے، تم اپنا ارمان پورا کر لیتا۔ میں تو وہی کروں گا جو میں نے کہا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ عزت کے ساتھ اس گھر سے ڈولی میں رخصت ہونا ہے یا پھر حرام موت گلے لگا کر باپ کی عزت داغ دار کرنی ہے، لیکن ایک بات ذہن میں بٹھالو۔ دونوں صورتوں میں میرا نام تمہارے نام کے ساتھ ہی رہے گا۔“

وہ مطمئن سا کہہ کر باہر نکل آیا۔ اور وہ اس کے الفاظ پر غور کرتی رہ گئی۔



وہ کسی کو بھی بتائے بغیر حیدر آباد آگئی تھی۔ شارق زمان نے اسے بلایا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اس کے بلانے پر انکار کرنے کی مستحکم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنے اماں ابائیک کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی کیونکہ اسے ان سے ملنا نہیں تھا۔ اگر وہ شارق زمان کی بات ماننے سے انکار کر دیتی تو وہ خود کراچی پہنچ جاتا۔

وہ شارق کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر انتظار کر رہی

تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ خوب سجا خوشبوؤں میں ڈوبا اس کے سامنے پراجمان ہو گیا تھا۔ اس کا دل نفرت سے بھرنے لگا اس مصنوعی خوشبو میں ڈوبا وجود اندر سے کتنا غلط تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔ شارق اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

”کیسی ہو۔؟“ وہ بڑی لگاوٹ سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے کیوں بلایا ہے یہاں۔؟ اب تمہیں مجھ سے

کیا کام پڑ گیا۔؟“ وہ غصہ دباتے ہوئے بولی۔

”تم سے تو مجھے مستقبل قریب میں بہت سے کام رٹنے والے ہیں۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، لیکن وہ ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

”میرے سامنے اکڑا مت کرو۔ تم جانتی ہو کہ میں

اکڑنے والوں کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“ اس کا لہجہ یک

دم بدل گیا۔ منال کیسے بھول سکتی تھی۔ چپ ہو رہی۔

”کام کی بات کرو۔“ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ

کو مضبوط کرتے ہوئے کہا اور جواباً ”اس نے جو طلب

کیا اس سے منال کو زمین و آسمان گھومتے محسوس

ہوئے۔



انہیں عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

اس بے چینی کی وجہ جاننے سے وہ قاصر تھے۔ یہاں

اتنی دور وہ ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں آئے تھے اور

اسی کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک دم ہی ان کا دل ہر کام

سے اچاٹ ہو گیا۔ رگ و پے میں بے قراری دوڑ رہی

تھی۔ انہوں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ

کھڑے ہوئے۔ کئی روز سے ان کی رنجش سے بات

نہیں ہو پائی تھی۔ وہ انہیں بہت یاد آرہی تھی۔ تب

ہی ان کا موبائل بج اٹھا۔ انہوں نے لپک کر فون

اٹھایا۔ رات کے بارہ بجے اگر وہ فون کر رہی تھی تو

یقیناً ”کوئی خاص وجہ ہوگی۔“

فون سن کر وہ مزید پریشان ہو گئے تھے۔ کل کی

میٹنگ کے بعد انہیں فوراً ”پاکستان کے لیے نکلنا تھا۔“

وہ پہلے ہی بے تحاشا پریشان تھی۔ اس پر عمر کے فون نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وہ اسی وقت حیدر آباد سے نکلی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ملازمہ سے ریحاب کا پوچھا۔

”جی وہ تو دو دن سے اپنے کمرے میں بند ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں۔ نجانے کیا ہو گیا ہے۔“ وہ پریشانی سے بتا رہی تھی۔ منال فوراً اس کے کمرے میں آئی۔

”ریحاب۔“ اس نے آواز دیتے ساتھ ہی لائٹس آن کیں۔ ریحاب بستر پر آڑی ترچھی بیٹھی تھی اس کی آواز پر وہ لٹ سے مس نہ ہوئی۔ منال گھبرا کر قریب آئی۔ وہ شدید بخار کی کیفیت میں تھی۔ اس کا چہرہ تھپتہ پانے لگی۔ اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں اور منال کو اپنے قریب دیکھ کر اس نے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔

”ریحاب! اٹھنے کی کوشش کرو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔

”منال۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ اس نے تمام ہمتیں مجتمع کر کے چیخ کر کہا تھا۔ منال کارنگ فن ہو گیا۔

”کیا ہوا ریحاب! تم ایسا ہی ہو کیوں کر رہی ہو؟ فی الحال سب چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔“ منال حد درجہ پریشان تھی۔ آخر کار اس نے عمر کو فون کر کے بلایا۔ عمر سیدھا ریحاب کے کمرے میں چلا آیا۔

”اٹھو۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں کیا کروں گا؟“ منال باہر کھڑی بن رہی تھی۔

”مجھے نہیں جانا۔ تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“ وہ غصے سے بولی۔

”نہیں چھوڑ سکتے ہم تمہیں ایسے۔“ وہ بھی سخت لہجے میں بولا۔

”نہیں جاؤں گی میں۔ نہ جینے دیتے ہو نہ مرنے دیتے ہو۔ آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ کیوں مجھے پاگل کرنے پر تلے ہو تم سب کے سب۔“ وہ وحشت سے چلا رہی تھی۔ اس نے عمر کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ عمر کتنی ہی دیر ساکت سا اس کی اس اہتر حالت کو دیکھتا رہا اور پھر چپ چاپ اسے اٹھا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔ منال بھی آکر بیٹھ گئی تو اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”اگر وہاں اسپتال میں بھی تم نے یہ سب کیا تو میں سب کے سامنے وہ کروں گا جو تم برداشت نہیں کر پاؤ گی۔ بہتر ہے چپ چاپ اپنا علاج کرواؤ۔“ اسپتال پہنچ کر عمر نے اسے وارننگ دی۔

”میں چاہتا ہوں کہ انہیں ایسی دوا دی جائے جس سے یہ سو سکیں۔ پریشانی کے باعث یہ دو راتوں سے جاگ رہی ہیں۔“ عمر ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ریحاب غنودگی کے عالم میں برسرِ پارہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری دوست؟؟؟ میں اتنا چاہتی ہوں وہ۔“ منال کا سانس رک گیا۔

”میرے پایا۔“ وہ سسکی۔ منال کے ہاتھ سے ریحاب کا ہاتھ چھوٹ گیا۔

”تم سب بہت برے ہو۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔“ مجھے نفرت ہے تم سب سے۔ اپنے آپ سے بھی۔ ہر چیز سے۔“ منال کو لگا ساتوں آسمان اس پر گر گئے ہوں۔ وہ بے جان سی ہو گئی۔

ریحاب کے ٹوٹے پھوٹے جملوں نے اسے کیا کچھ نہیں سمجھا دیا تھا۔ اتنی نفرت اتنی بے اعتباری؟ وہ بے اختیار ریحاب کو دیکھے گئی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ انکل کو سب بتا دوں۔ ماکہ وہ جلد سے جلد آئیں۔ ریحاب کی ذہنی حالت بہت بری ہو رہی ہے۔“ وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

”میں نے انہیں فون کیا تھا۔ ریحاب کے متعلق کچھ نہیں بتایا، بس پوچھا تھا کہ وہ کب آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ آج شام کی فلائٹ سے پہنچ جائیں گے۔“ منال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ عمر اسے

گے۔

روتا دیکھ کر لب بھیج گیا۔

”نبجانے کیا غم ہے اسے۔ کیا ہو گیا ہے ریحاب کو؟“ عمر نے بے بسی سے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ ایک ریحاب کی حالت اس پر بے خبری۔ اصل وجہ معلوم ہوتی تو ہی وہ کوئی سدباب کرتا۔ وہ چپ چاپ ریحاب کو دیکھے گیا۔ جبکہ منال سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی اسے حقیقت کا علم ہو گیا ہے؟ اگر ہاں تو کیسے؟ لیکن اس میں شکیل صاحب کا کیا قصور؟ قصور وار تو میں ہوں۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ریحاب پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

”مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں بس یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے یہاں سے دور جانا ہے۔ سب سے دور۔“ وہ اپنے آنسو روکتے ہوئے بولی۔ منال نے بے بسی سے شکیل صاحب کی طرف دیکھا۔ عمر بھی بیٹھا ہوا تھا۔

”تم ہمیں وجہ بتاؤ۔ اس کے بعد تم جو کہو گی، ہم وہی کریں گے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ ریحاب کے ہونٹوں پر قفل لگ گئے۔ وہ عمر کے سامنے کیسے یہ سب کہتی اور ہمیشہ کی طرح شکیل صاحب بنا کے سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے عمر کو اشارہ کیا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

”بیٹا۔“ وہ اس کے قریب آکر بیٹھے اور کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ریحاب نے یک دم ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا تھا۔

”مجھے بنامت کہیے۔ میں کچھ نہیں لگتی آپ کی۔“ وہ سسکتے ہوئے بولی۔ منال کا دل سکڑ کر پھیلا۔ ”کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟“ وہ بے حد نرمی سے پوچھ رہے تھے۔ ریحاب چیخ گئی۔

”منال کے ساتھ آپ کا تعلق؟“ شکیل صاحب کو لگا، کسی نے گرم سیدہ ان کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ منال کاٹک مچھکچھک تھا۔

”نفرت ہے مجھے آپ سے، منال سے، سب

سے۔“ وہ رو رہی تھی چیخ رہی تھی۔ شکیل صاحب کم صبر بیٹھے تھے۔ عمر اسے قابو کرنے کی کوشش میں تھا۔ ”عمر چھوڑ دو اسے۔ یہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، ٹھیک ہے۔ پندرہ دن بعد ریحاب کی تمہارے ساتھ رخصتی ہے۔ تم بارات لے کر آؤ یا اکیلے، تمہاری مرضی۔“ شکیل صاحب کی بات سن کر ریحاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ کمرے سے باہر نکلتے وقت ان کی چال بے حد شکستہ تھی۔ عمران کے پیچھے لپکا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ اور جا کر تیاریاں کرو۔ جس دن تمہاری رخصتی ہوگی اس دن میں منال سے نکاح کروں گا۔“ ایک اور دھماکا۔ منال کو لگا وہ زمین میں گڑ گئی ہے۔ عمر بھی نگاہیں چرا گیا۔

ریحاب البم کھول کر بیٹھی تھی اور بڑی محویت سے ایک ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ یہ ساری تصویریں اسکول اور کالج کے خوش گوار دنوں سے وابستہ تھیں۔ اس میں الجھ کر کتنا وقت گزر گیا اسے احساس تک نہ ہوا۔

کافی دیر بعد اس نے ساری تصویریں سمیٹ کر الماری میں رکھیں پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھایا اور اپنی دوست منال کا نمبر ملایا۔

”السلام علیکم! اس نے بے حد خوش گوار لہجے میں اسے سلام کیا۔

”و علیکم السلام! کیسی ہو ریحاب؟“ منال نے لہجہ ہشاش بشاش بناتے ہوئے کہا، لیکن تھکن پھر بھی ظاہر ہو گئی۔

”میں تو ٹھیک ہوں۔ تمہیں کیا ہوا، خیریت تو ہے؟“ اس نے فوراً ہی اس کے لہجے کی تھکن محسوس کر لی۔

”ارے مجھے کیا ہو گا، بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں میں بھی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اتنی مری ہوئی آواز میں کیوں بات کر رہی

ہو۔ انکل کی طبیعت کیسی ہے؟“ رحاب نے استفسار کیا۔

”تم پہلے بھی اسے کئی بار یہاں بلا چکی ہو، لیکن وہ نہیں مانتی۔ چھٹی بار بھی میں نے اپنے ہی آفس میں اسے سیٹ کرنے کا سوچا تھا، لیکن وہ تیار نہیں ہوئی آنے پر۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔ رحاب کو سب یاد تھا، لیکن وہ اس رویے کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

”پاپا! بس جاب کا بندوبست کیجئے میں اسے منالوں کی اور مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گی۔ کیونکہ اپنے والد کی بیماری اور پھر اس کی نوکری کے ختم ہونے کے بعد وہ بہت سے مسائل کا شکار ہے۔“

”نھیک ہے۔ بیٹا کو شش کرتے ہیں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”پاپا! میں منال سے ملنے کے لیے حیدر آباد جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔

”نھیک ہے۔ تم ان منتخب کرلو میں تمہیں لے چلوں گا۔ فی الحال مجھے ابھی سی چائے پلاؤ، آج ہم دونوں باہر ڈنر کریں گے۔“ وہ خوش گوار انداز میں بولے۔ وہ مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

”عمر! تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کیوں مجھے پٹوانا چاہتے ہو؟“ آصف اس کی فرمائش سن کر گھبرا گیا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے مجھے کوئی اور کیوں پیٹے۔“ اس نیک کام کے لیے میں کافی ہوں۔“ اس نے اپنے خطرناک طور دکھائے۔ آصف کا منہ بن گیا۔

”یار! دیکھ اگر تو یہ سب کرے گا اور تیرے پاپا کو پتا چل گیا تو۔“

”تو کچھ نہیں ہو گا۔ بحث مت کر اور یونیفارم دے مجھے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ آصف عمر کا دوست تھا۔ یہ فائو اشار ہوٹل آصف کے ابا جان کا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھار وزٹ کر لیتا (صرف کچن کا)۔

آج عمر نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ اسے اگر علم ہوتا کہ وہ اس سے ایسی فرمائش کرے گا تو وہ آج تو ہرگز نہ

”اب کیسے ہیں وہ؟“

”اب تو کافی بہتر ہیں۔“ اس نے گہری سانس خارج کر کے کہا۔

”اور تمہاری جاب۔“ اس کے اگلے سوال پر وہ گڑبڑا گئی۔

”جاب بھی بس ٹھیک ہی چل رہی ہے۔“

”سچ بتاؤ منال۔“ رحاب کا انداز دھمکانے والا تھا۔

”چھٹیاں زیادہ ہونے کی وجہ سے جاب سے نکال دیا گیا۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”اوہ۔“ وہ چپ ہو گئی۔

✽ ✽ ✽

شکیل صاحب گھر پہنچے تو رحاب کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے۔

”رحاب بیٹا۔“ انہوں نے اسے پکارا تو وہ ہڑبڑا گئی۔ وہ اپنے خیالات میں ابھی ان کے قدموں کی چاپ تک فراموش کر چکی تھی۔

”السلام علیکم! پاپا۔ آپ کب آئے؟“ وہ اپنی شرمندگی چھپاتی ان کے ہاتھ سے بریف کیس تھاتے ہوئے بولی۔

”خیریت۔ تم کچھ پریشان ہو؟“ وہ تشویش سے لہجے میں بولے تو وہ ہنس پڑی۔

”پاپا! آج بہت دن بعد میں نے منال کو فون کیا تو مجھے اپنی بے خبری پر شدید غصہ آیا۔“ اور پھر اس نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کر دی۔

”وہ بے حد پریشان ہے، کیونکہ اس کی نوکری ختم ہو گئی ہے آپ اس کے لیے جلدی سے جاب ڈھونڈ

آتا، لیکن نہ صرف وہ آپ کا تھا بلکہ پھنس بھی چکا تھا۔
عمر کے ہاتھوں۔ عمر کی بات نہ ماننے کا مطلب تھا اس کی ناراضی۔

عمرو میٹرز کا مخصوص لباس پہنے ہوئے ہال میں گھوم رہا تھا۔ دو آرڈر زوہ لے چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ریحاب اپنے پیلا کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مہینوں کے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ ریحاب کو دیکھ کر اسے اچھا بلکہ بہت اچھا لگا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی۔ اس کا جی چاہا وہ جائے اور اس کا حال احوال پوچھے، مگر ظاہر ہے وہ اس روپ میں اس کے سامنے جاتا تو وہ حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہو جاتی۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے شکیل صاحب کو موبائل کان سے لگائے باہر نکلتے دیکھا تو وہ اس کے پاس چلا آیا۔
”کیسی ہو۔۔۔؟“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

”آپ یہاں۔۔۔ اس حال میں۔۔۔؟“ وہ شدید حیرت زدہ تھی۔ اس سے پہلے کہ عمر اسے کوئی جواب دیتا اس نے اپنے پیلا کو اپنے دوستوں کے ہمراہ اندر آتے دیکھا۔
”میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں“ پہلے آرڈر لے لوں۔“ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ شخص سر ہلا کر رہ گئی۔

عمر اس سے ذرا دور ایسی ٹیبل پر آرڈر لینے لگا جہاں سے اس کے پیلا اور ان کے دوست اسے آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ عمر ٹیبل کے پاس کھڑا کچھ کہہ رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر حامد صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”لو کے میم۔“ وہ آرڈر لے چکا تھا۔ ابھی وہ اسی شاک سے باہر نہ نکلے تھے کہ لڑکی کے قریب سے گزرتے عمر نے جان بوجھ کر پانی کا گلاس اس پر انڈیل دیا تھا وہ لڑکی چیخ کر اٹھی تھی۔

وہ ”سوری میم۔ سوری میم“ کر رہا تھا اور وہ تازک اندام سی لڑکی اسے ذلیل کر رہی تھی۔ حامد صاحب کی

سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے اور کیوں ہوا ہے؟ عمر سر جھکائے سب سن رہا تھا۔ حامد صاحب کے برابر میں بیٹھے ان کے دوست سوالیہ نگاہوں سے حامد صاحب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

جبکہ عمر کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ لڑکی کسی طور چپ نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ہنگامہ مچانے پر مینیجر دوڑتا ہوا آیا تھا۔ عمر کی حیثیت سے واقف تھا۔ وہ اپنی جگہ پریشان کہہ کرے تو آخر کیا کرے جب ہی وہ خود اس کی ٹیبل پر آگئے تھے۔

ریحاب سے جب یہ برداشت نہ ہو تو وہ بھی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

”اسٹاپ دس ٹان سینس۔ تم جانتی بھی ہو کہ تم کس سے بات کر رہی ہو؟“ وہ لڑکی کے سر پر جا کر دھاڑے تھے۔

”یہ خاتون ایک میٹر سے بات کر رہی ہیں اور میٹرز کے ساتھ اسی طرح بات کی جاتی ہے۔“ عمر کا سرد انداز میں ادا کیا گیا جملہ انہیں سب سمجھا گیا تھا۔ وہ اچھے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ ان کا بیٹا تھا۔

”میٹرز کی کوئی عزت نہیں ہوتی کیونکہ وہ آپ جیسے لوگوں کی چاکری کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ نچلے درجے کے کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی گزارنے والوں کی کیا عزت ہے نا سر۔؟“ وہ لڑکی اب چپ ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی۔ حامد صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کچھ روز پہلے اسی ہوٹل میں عمران کے ساتھ تھا۔ اور میٹر سے پانی کا گلاس ان کے کپڑوں پر گر گیا تھا۔ وہ لڑکا ”سوری“ تک نہ کہہ سکا تھا کیونکہ حامد صاحب نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا تھا۔ عمر کے غصہ کرنے اور جھگڑا کرنے پر انہوں نے وہ الفاظ ادا کیے تھے جو عمر نے اب ان کے سامنے دہرائے تھے۔

”شکر کیجئے کہ انہوں نے مجھے اس غلطی پر تھپڑ نہیں مارا۔“ وہ سخت غصے سے کہتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ انہیں کیا سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ باپ تھے۔ عمران کی جان تھا۔ جب وہ لڑکی ان کے بیٹے کو التماسیدھا بول رہی تھی، اس وقت غصے سے انہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا

قصان نے ہمیں سڑک پر لاکھڑا کیا۔ ”عمر نے لہجے میں رقت پیدا کی۔
 ”اور آپ کی تعلیم؟“ وہ یونیورسٹی میں بہت قابل اسٹوڈنٹ ہوا کرتا تھا اس سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”اگر وہ کام آتی تو کیا میں آپ کو یہاں دکھائی دیتا۔ ہر کوئی تجربہ مانگتا ہے اور سفارش بھی۔ جو کہ میرے پاس نہیں۔ یہاں صرف اس کی اہمیت اور قدر ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔“ اس کا لہجہ آخر میں تلخ ہو گیا تھا۔ عمر نے حجاب کا یونیورسٹی فیلو اور ایک سال سینئر تھا۔ عمر کی ذہانت کے چرچے پوری یونیورسٹی میں تھے۔ لڑکیاں اس کی خوب صورت شخصیت پر مرتی تھیں۔ ذہانت پر جان دیتی تھیں۔ وہ بھی اسے کئی بار ان ”تیلیوں“ کے جھرمٹ میں دکھائی دیا تھا۔

وقت اور حالات انسان کو کس قدر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ وہ بھی مل بنا رہا تھا۔

”عمر!“ اس نے بے حد سوچ کر اسے پکارا۔ حجاب نے شاید پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں، مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس نے ایک چٹ پر اپنا نمبر لکھا اور اسے تھمایا۔

”آپ کو۔ اگر ضرورت پڑے تو مجھے اس نمبر پر فون کر دیجئے گا۔“ وہ جھجک کر بولی۔ کہنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اپنی سی وی اے دے دے، لیکن یہ بات سن کر عمر کو برا بھی لگ سکتا تھا۔ عمر نے پرچی لے لی۔

”شکریہ۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ حجاب بہ وقت مسکرائی۔ اس کا دل بے حد بو جھل ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھوں میں المٹی کی کو صاف کیا۔ عمر بغور اسے دیکھ رہا تھا اور پھر نگاہ موڑ لی۔

عمر نے اسے طول دیکھا تو اس کا جی چاہا وہ اسے سب سچ بتا دے۔ اس کے چہرے کی اداسی ختم کر دے، مگر وہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

حجاب کے نگاہوں سے او جھل ہونے کے بعد وہ

گلا ہی دبا دیں گے۔ انہیں اس کم عمر سے لڑکے کی سرخ آنکھیں اور جھکا چہرہ یاد آیا۔ اگر وہ ایک بیراثہ ہوتا اور کسی امیر آدمی کا بیٹا ہوتا اور اس کے ہاتھوں ان کے کپڑے کندے ہو جاتے تو کیا وہ یہی رویہ رکھتے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی، کسی اور کی عزت نفس کا احساس دلانے کے لیے وہ اپنے آپ کو بے عزت کروا رہا تھا۔ اتنا بڑا دل تھا عمر کا۔؟ وہ کچھ بول ہی نہ پائے۔

موسم بدل رہا تھا۔ سردیاں شروع ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ رش بڑھتا وہ خریداری کر لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے تحت وہ بازار آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ منال سے ملنے جائے گی تو ان سب گھر والوں کے لیے بھی گفٹ لے جائے گی۔ اس لیے وہ دل کھول کر خرچ کر رہی تھی۔ جب ایک جگہ ٹھنک کر رک گئی۔ وہ بلاشبہ عمر ہی تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑا دو خواتین کو ڈیل کر رہا تھا وہ اس سے چھ قدم کے فاصلے پر تھی۔ عمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں لے لے کر دیکھ رہی تھی۔ عمر مسکرایا۔

”پلیز میم۔ آئیے۔“ وہ دونوں خواتین کو فارغ کر چکا تھا اور اب اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ وہ حیران پریشان سی کاؤنٹر کے قریب آگئی۔

”آپ یہاں بھی۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ عمر نے اپنی مسکراہٹ دہرائی۔

”کیوں کیا میں یہاں نہیں ہو سکتا؟“ وہ بے حد سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ وہ میرا مطلب تھا کہ آپ اس دن ہوٹل میں۔ اور اب یہاں۔ آپ کو جاب سے نکال دیا گیا؟“ وہ حیرت زدہ سی پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے بھی اپنے لہجے میں اداسی بھری۔ ”لیکن آپ یہ معمولی معمولی سی نوکریاں کر کیوں رہے ہیں؟ آپ کے والد کا تو اپنا کاروبار ہے؟“ حجاب نے ذہن میں آئے سوال کو زبان دی۔

”تھا۔ لیکن اب نہیں ہے۔ بزنس میں شدید

ہاتھ میں پکڑے فون نمبر کو دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار ایک نرم سی مسکان نے اس کے ہونٹوں کو چھوا۔ اس نے نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور پرچی اپنے والٹ میں رکھ لی۔ وہ مستقل اسی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ ایک محبت کی ابتدا ہو رہی تھی۔ چپکے چپکے۔



رات اس نے بہت کچھ سوچتے اور منال سے ملنے کی خوشی محسوس کرتے گزاری تھی۔ صبح جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تو شکیل صاحب کے کمرے کا دروازہ اوکھٹا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو وہ ڈرنک ٹیبل کے سامنے کھڑے بال بنا رہے تھے۔ گہرے نیلے رنگ کی شرٹ اور گہرے پینٹ پہنے وہ عام دنوں سے کہیں زیادہ ہینڈ سم لگ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

”ایسا! کبھی کبھار میں سوچتی ہوں کہ دادی اماں نے آپ کی شادی کم عمری میں کروا کر کافی ٹیک کام کیا تھا اور عقل مندانہ بھی۔“ وہ شرارت سے بول رہی تھی۔ وہ ہلٹے۔

”عقل مندانہ وہ کیسے بھلا۔؟“ وہ مصنوعی حیرت سے بولے۔

”وہ ایسے کہ اگر آپ کسی کو یہ کہیں کہ آپ سنگل ہیں تو وہ بلا تردد مان لے گا اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ لڑکی رہنما میری بیٹی نہیں میری بہن ہے تو بھی آپ کی اس بات پر ہر کوئی یقین کر لے گا۔“ وہ بہت شرے لہجے میں بولی۔ انہیں ہنسی آگئی۔ ان کی عمر واقعی کم تھی۔ نو جوانی میں ہی ان کی شادی کروادی گئی تھی اور رہنما کی پیدائش شادی کے ایک سال بعد ہی ہو گئی۔ ان دنوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ باپ بیٹی ہیں۔

”اچھا۔“ مکھن بعد میں لگانا۔ پہلے ناشتا کر لو۔ پھر نکلنا بھی ہے۔“ وہ کلائی میں گھڑی باندھتے ہوئے بولے تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے منال کو نہیں بتایا تھا کہ وہ اس سے ملنے آرہی ہے۔ وہ اسے سربراہ زورنا چاہتی تھی۔ ناشتا کرتے ہی وہ حیدر آباد کے لیے نکل گئے وہاں پہنچ کر اس نے تیزی سے اتر کر دروازہ بجایا۔

دروازہ منال نے کھولا تھا۔ رہنما کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران تھی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ اس کی غیر متوقع آمد پر وہ منہ کھولے کھڑی تھی۔ رہنما اس کی حالت دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”منہ کھول کر کھڑی رہو گی کہ مجھ سے ملو گی بھی؟“ وہ بے حد خوشگوار انداز میں بولی تھی۔ منال اس سے لپٹ گئی۔ دونوں ہی آئیدہ تھیں۔ منال کی بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”کتنا روئیں گی آپ۔؟“ جانی پہچانی آواز پر وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا وہ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ ان پر نگاہیں جمائے کھڑی رہے۔ لیکن دل کو ڈانٹ کر وہ رہنما سے دور ہوئی اور نگاہیں جھکا لیں۔

”السلام علیکم!“ اس نے شرمندہ سے لہجے میں سلام کیا اور سائیڈ پر ہو گئی۔ وہ جواب دیتے اندر داخل ہوئے۔ تین کمروں اور مناسب صحن پر مشتمل چھوٹا سا گھر بے حد صاف ستھرا تھا۔

”آئیں۔ بیٹھیں۔“ اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر گھس کر لائٹ آن کی پینکھا چلایا تاکہ بند کمرے میں تازگی ہو۔ انہیں بٹھا کر وہ کچھ دیر کے لیے غائب ہوئی۔ آئی تو گلاسوں میں جوس تھا۔ انہیں گلاس تھما کر وہ سامنے بیٹھ گئی۔

”آئی! انکل کی طبیعت کیسی ہے؟“ رہنما نے بات کا آغاز کیا۔

”امی کے گھٹنوں میں درد تھا وہ اسپتال گئی ہیں جبکہ ابو کچھ دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ کافی بہتر طبیعت ہے۔ تم سناؤ کیسی ہو؟“ اس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا تھا۔ رہنما نے اس کی پریشانی محسوس کی تھی۔ شکیل صاحب کو بھی وہ بے چین سی لگی۔ اس کے مالی حالات جس طرح کے تھے اسے پریشان تو ہونا ہی تھا۔ مگر کچھ اور بھی تھا۔ منال بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ شکیل صاحب کے سامنے کھل کر کچھ بھی نہیں پوچھ سکتی تھی۔ اسی لیے اسے یونیورسٹی کے قصے سناتے لگی۔ اس کا آخری سمسٹر بھی مکمل ہو گیا تھا۔ وہ اب نیچے

131

کے انتظار میں تھی۔ منسل اس کی باتیں سنتی رہی پر توجہ کلیل صاحب پر تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے دھیان میں تھی۔



وہ جب سے ریحاب سے ملا تھا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے والٹ میں سے وہ پرچی نکالی اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ایک خوبصورت سا منظر اس کی نگاہوں میں آیا تھا۔ ریحاب اس کی جونیئر تھی۔ عمر نے نئے آنے والوں کی بہت رہینگ کی تھی۔ اسٹوڈنٹس کسی بھی ڈپارٹمنٹ کے ہوتے اس کی شرارتوں سے نہیں بچ پاتے تھے۔ جب ریحاب نے یونیورسٹی جوائن کی پہلے ہی دن اس کا ٹاکرا عمر سے ہوا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر عمر نے اس سے کوئی شرارت نہیں کی تھی۔ عمر کو خود اس کی وجہ معلوم نہیں تھی۔

شاید ریحاب کی بے تحاشا معصومیت نے اسے کسی بھی شرارت سے روک رکھا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی دلکشی اور طلسم تھا۔ جس نے عمر کو متوجہ کیا تھا۔ عمر سے اس نے ڈپارٹمنٹ کا پتا دریافت کیا تھا۔ اور عمر اسے پتا سمجھانے کے بجائے اسے خود ڈپارٹمنٹ تک چھوڑ آیا تھا۔ اس کی یہ حرکت اس کے دوستوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے دوست یہی سمجھے کہ یقیناً ”وہ دونوں پہلے سے ہی ایک دوسرے سے واقف ہیں اس لیے عمر نے اسے تنگ نہیں کیا۔ عمر نے اس الزام کی سخت لہجے میں نفی کی تھی۔

”ریحاب مجھے پہلی نگاہ میں معصوم اور سادہ لگی ہے اس لیے میں نے اسے تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ یہ بیان عمر کا تھا اور سچائی پر ہی مبنی تھا۔ مگر نیا آنے والا ہر طالب علم شروع کے دنوں میں اسی قدر معصوم اور سادہ دکھائی دیتا ہے جتنی کہ ریحاب تو پھر ان ”معصوموں“ کی رہینگ کیوں؟“ اعتبار نے اسے گھورتے ہوئے کافی اچھا پوائنٹ اٹھایا تھا، وہ عمر کی دوست تھی اور عمر کوئی جواب نہیں دے پایا۔

ان گزرے سالوں میں اسے معلوم تھا کہ ریحاب کے فادر کو تو وہ بہت اچھی طرح جانتا ہے، مگر وہ باری حلقے میں وہ کافی مشہور تھے۔ کئی پارٹیز میں ان کی ملاقات ہوئی تھی، لیکن ریحاب کو اس نے کبھی ان کے ہمراہ کسی پارٹی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جان نہیں پایا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا تو حیرت ہوئی۔ وہ اب تک یہ سمجھتا آیا تھا کہ ریحاب کی سادگی اور شرافت مل کلاس کے مذہبی گھرانے کی دین دگی حقیقت معلوم ہونے پر اسے اپنی سوچ پر افسوس ہوا۔ اسے اول روز سے وہ اچھی لگی تھی۔ اس نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے گریزاں تھی۔ بلکہ ہر اس لڑکے سے جس کے ایک افیر کا بھی اسے علم ہوتا اس سے دور بھاگتی۔ اس کی اس درجہ احتیاط پسندی پر وہ کئی بار ہنسا تھا، لیکن اس نے ریحاب کو کبھی تنگ بھی نہیں کیا۔

اس کی پرہیزی مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اس کا سامنا ریحاب سے مہینوں بعد ہوتا تھا، وہ بھی کسی شادی کے فنکشن میں۔ ہیلو ہائے کے بعد وہ یوں بیٹھ جاتی جیسے گونگی ہو۔ اور اب چھ ماہ بعد وہ اسے وہاں دکھائی دی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی انسلٹ کے وقت اٹھ کر یا ہر جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا حساس دل بھر آیا ہو گا اور وہ کھانا بھی نہ کھا سکی ہو گی۔

اور پھر وہ اسے شاپنگ مال میں دکھائی دی۔ وہ اسے کاؤنٹر پر کام کرتے دیکھ کر دکھی اور پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے بنا سوچے سمجھے جھوٹ بولا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ شاید اس کی توجہ کے حصول کے لیے کیونکہ پچھلے کئی دن سے ریحاب اس کے ذہن پر سوار تھی اور بار بار اسے یاد آرہی تھی۔

وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ اس کا ملازم کہیں گیا تھا تو اپنے دوست کے ساتھ وہ بھی تفریحاً ”کسٹمر فلو بھگتانا لگا۔ عمر کو کیا علم تھا کہ محض تفریح کے لیے جانے والے کام میں اسے ریحاب کا نمبر مل جائے گا۔ بغیر کسی کوشش کے۔

وہ کل سے اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اسے فون کرے نہ کرے۔ دل اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس نے تھک ہار کر دل کی بات مان لی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے ریحاب کا نمبر ڈائل کیا جو کہ اس نے ”سری“ کے نام سے محفوظ کیا تھا۔ نل جانے لگی۔ آخری گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا۔

”ہیلو۔“ نیند میں ڈوبی خمار آلود آواز نے اس کے کانوں کو چھوا۔

”ہیلو۔“ دوسری بار آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ چیپ رہا۔

”کس کا فون ہے؟“ ایک اور نسوانی نیند سے بھری دھیمی آواز بھی ابھری تھی۔

”پتا نہیں۔“ ریحاب نے شدید بے زار لہجے میں کہہ کر فون کٹ دیا۔ ریحاب کی بے خبری پر وہ افسرہ سا ہوا اور بیڈ پر گر گیا۔



ریحاب منال کے گھر میں کچھ دن کے لیے رک گئی تھی، شکیل صاحب کراچی واپس چلے گئے۔

ریحاب اور منال اسکول کے زمانے سے دوست تھیں۔ ریحاب شہر کے ہنگے ترین اسکول میں پڑھتی تھی۔ حامد صاحب وہاں کینٹین چلاتے تھے اور اسی وجہ سے منال کو وہاں داخلہ دے دیا گیا تھا۔ پرنسپل اچھے انسان تھے انہوں نے منال کی ذہانت سے متاثر ہو کر فیس معاف رکھی تھی۔ ورنہ ایک معمولی انسان کی بیٹی کا وہاں پڑھنا ناممکنات میں سے تھا۔ منال اور ریحاب کی عمروں میں تین سال کا فرق تھا۔ منال اس سے تین سال بڑی تھی۔ مگر دونوں کلاس فیلوز تھیں۔ ہم مزاج تھیں سو دونوں کی جلد ہی دوستی ہو گئی۔ میٹرک کے بعد دونوں نے ایک گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ حامد صاحب نے اسکول کی کینٹین حتم کر دی وہ اب اپنا کاروبار کرنا چاہتے تھے۔

حامد صاحب نے کاروبار شروع تو کر دیا تھا لیکن پھر بھی پیسہ کم پڑ گیا تھا تو انہیں اپنا گھر فروخت کرنا پڑا۔

حیدر آباد میں پھونسا سانی سہی پر ان کا آبائی گھر تھا۔ منال گھر فروخت ہو جانے کے دن افسردہ رہی تھی۔ حامد صاحب نے اپنی بیٹی کو یقین دلایا تھا کہ وہ جلد ہی اپنا گھر پھر سے خرید لیں گے، مگر حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ سب حق دق رہ گئے۔ جس کے ساتھ مل کر انہوں نے کاروبار کی بنیاد رکھی وہ شخص سب کچھ سمیٹ کر فرار ہو گیا۔ حامد صاحب کا دل یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس حادثے کے بعد وہ بیمار رہنے لگے۔ ان حالات میں منال اپنا کالج بھی جاری نہ رکھ سکی۔ ریحاب کے لاکھ روکنے پر بھی وہ کراچی میں نہیں رکی تھی۔ اور اپنی فیملی کے ساتھ حیدر آباد میں شفٹ ہو گئی۔ حامد صاحب نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور اب مزدوری کر کے پھر سے گھر کا خرچ چلانے لگے۔

ریحاب بے حد اداس تھی۔ وہ پرنسپل کو اس تمام واقعے کے بارے میں بتا چکی تھی اور گزارش کی تھی کہ حاضری نہ ہونے کی صورت میں منال کا ایڈمٹ کارڈ نہ روکا جائے۔

امتحانات میں جب ایک مہینہ رہ گیا تو ریحاب خود اسے لے کر کراچی آگئی تاکہ وہ مکمل توجہ کے ساتھ امتحانات دے سکے۔

لیکن منال کی توجہ بھٹک گئی تھی۔ اسے بالکل اچانک ہی شکیل صاحب اچھے لگنے لگے تھے اتنے کہ وہ خود سے گھبرا گئی تھی۔ ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔ پہلے بھی وہ ان سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی لیکن اب تو ان کی موجودگی میں وہ کمرے سے ہی نہ نکلتی۔

وہ اپنے آپ سے سخت شرمندہ تھی۔ خود کو لعنت ملامت کرتی۔ وہ اس کی دوست کے والد تھے اس لحاظ سے وہ اس کے انکل ہوئے۔ وہ جتنا سوچتی اسی قدر پشیمانی اور شرمندگی میں گھرتی جاتی۔ پردل پر کب کس کا زور چلا ہے۔ البتہ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ آئندہ کراچی نہیں آئے گی۔

امتحانات کے بعد اس نے ایک دن بھی وہاں رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ریحاب اس کی جلد بازی پر

اپنے پاپا کی ”دکان“ چلاتا ہوں۔“ وہ شرارت سے بولا تو وہ ہنس پڑے۔ ریحاب نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اصل بات کیا ہے؟ بتانا پسند کرو گے؟“ دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور پھر عمر نے ساری تفصیل انہیں بتا دی۔ حقیقت جان کر ریحاب کا تو غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے عمر کا سر پھاڑ دے۔ وہ تیزی سے ان کے آفس سے نکل آئی تھی۔ وہ پیچھے سے پکارتے رہ گئے۔

”آئی ایم ریلی سوری۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ایسے ری ایکٹ کریں گی۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔

”میری ریحاب بہت معصوم ہے۔ اس نے بنا سوچے تمہاری کہانی پر یقین کر لیا تھا حالانکہ اگر وہ ذرا توجہ دیتی تو تمہارا جھوٹ پکڑ لیتی لیکن اسے تمہاری کہانی نے افسردہ کر کے رکھ دیا تھا۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہے تھے۔ عمر بھی ہنس پڑا۔

اس کے بعد اس نے ریحاب کو پیسیوں فون کیے تھے مگر اس نے ایک بھی فون نہیں اٹھایا۔ اس نے پھولوں کا گلہ ستہ اور سوری کا کارڈ لی۔ سی۔ ایس کیا۔

”بیٹا! اس کا وہ مذاق اتنا بھی برا نہیں تھا کہ تم اسے معاف نہ کر سکو۔“ پاپا کے اتنا کہنے پر ہی اس نے عمر کو فوراً میسج کر دیا کہ وہ ناراض نہیں۔



اس واقعے کے ایک ہفتے بعد ہی عمر کے والدین اس کے گھر اس کا رشتہ مانگنے کو موجود تھے اور ضوفشاں بیگم نے جب شکیل صاحب کو دیکھا تو وہ شاکڈ رہ گئیں۔ ضوفشاں عمر کی سوتیلی ماں کسی زمانے میں وہ شکیل صاحب کے آفس میں جاب کرتی تھیں۔ لاکھ ڈورے ڈالے مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آئے۔ وہ دل سے انہیں پسند کرتی تھیں، لیکن ان کے جھڑکنے نے انہیں پاگل سا کر دیا تھا۔ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں سوائے جاب چھوڑنے کے سوانہوں نے جاب چھوڑ دی۔

ناراض ہو چکی تھی لیکن وہ کیا کرتی۔ مجبور ہو چکی تھی وہ۔ بعد میں اس نے ریحاب کو منالیا تھا۔ اگلے سال پھر اسے آتا پڑا اس بار اس نے امتحان سے بس ایک دن پہلے ہی اس شہر کا چہرہ دیکھا جس نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ دل بھی۔ حامد صاحب بیماری کے باوجود مزدوری پر جاتے تھے۔ اس نے پرائیویٹ لی اے میں داخلہ لے لیا اور ایک اسکول میں نوکری کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی پڑھانے لگی۔ جبکہ ریحاب یونیورسٹی میں پڑھنے لگی۔



ریحاب کو اس نے اپنے حالات کا نہیں بتایا تھا پھر بھی وہ سب جان گئی تھی۔ اس نے شکیل صاحب سے کہہ کر اپنے آفس میں اس کے لیے جگہ بنائی لیکن بھلا وہ یہ نوکری کیسے کر سکتی تھی وہ ان سے دور رہنا چاہتی تھی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی کہ وہ ان سے دور رہ کر انہیں بھول جائے گی۔ دل کی زمین پر جو محبت کی کوئیل پھولی ہے۔ وہ سیراب نہ ہونے کی صورت میں پھلے پھولے گی نہیں۔

عمر نے دوبارہ ریحاب کو فون کیا تو اس نے فوراً ”اس کی جاب کا پوچھا اس نے انکار کیا تو ریحاب نے ہمت کر کے عمر سے کہا کہ وہ اپنی سی۔ وی لے کر اس کے پاپا کے آفس آجائے۔ عمر نے فوراً ”وہاں پہنچنے کی ہائی بھری تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حقیقت جاننے کے بعد ریحاب کا کیا رد عمل ہو گا لیکن وہ اس مذاق کو مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس لڑکی کا دل کس قدر نازک ہے۔

جب عمر آفس پہنچا تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ جبکہ شکیل صاحب نے بہت حیرت میں گھر کر عمر سے مصافحہ کیا تھا۔

”برخوردار! یہ کیا چل رہا ہے۔ میں کیا سن رہا ہوں۔ عمر ذوالقرنین کے پاس نوکری نہیں۔“ ان کی بات پر وہ مسکرا اٹھا تھا۔

”سر! میرے پاس کب نوکری ہے بھلا۔؟ میں تو

اس کے بعد انہیں ذوالقرنین کے آفس میں نوکری مل گئی۔ وہ طرحدار اور حسین تھیں ذوالقرنین صاحب کو ایسی خواتین ہی پسند تھیں۔ دونوں کا دھواں دار افسر چلا اور نتیجہ شادی کی صورت برآمد ہوا۔ عمر نے انہیں قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کی اپنی ماں بھی اسی مزاج کی تھیں۔ وہ ایک بروکن فیملی کا لڑکا تھا۔ سالوں پہلے اس کے والدین الگ ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے اپنے اندر والدین کی کمی کو حسرت بنا کر پروان نہیں چڑھایا۔ اس نے اپنی دنیا بنالی تھی۔ ضوفشاں نے اس پر اپنا کنٹرول کرنا چاہا لیکن وہ ”عمر“ تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ضوفشاں کے دل میں شکیل صاحب کا انکار کسی نخبج کی طرح چبھارہ گیا۔ وہ اکثر انہیں مختلف پارٹیز میں دکھائی دیتے۔ ان کا پہلو ہمیشہ خالی ہوتا۔ وہ جل کر رہ جاتیں۔

عمر نے گھر میں کسی ریحاب نامی لڑکی کا ذکر کیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ذوالقرنین کو بھلا کیا اعتراض ہوتا تھا۔ وہ اس اشتیاق میں چلی آئی تھیں کہ عمر کی پسند دیکھیں گی؟ نہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریحاب ”شکیل“ کی بیٹی ہوگی۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ریحاب کو بہو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے اس بے تکے انکار کو بھلا کون اہمیت دیتا؟ ذوالقرنین کو وہ عزیز تھیں لیکن چونکہ ان کے انکار کی معقول وجہ نہیں تھی سو انہوں نے ضوفشاں کو خاموش رہنے کو کہا۔



ان کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس کا چیننا چلانا سب بیکار تھا۔ شکیل صاحب کا رویہ ریحاب کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ ساری غلطی ان کی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اسے کیوں صفائی نہیں دے رہے تھے۔ اس سے کیوں کچھ نہیں کہا۔؟ کچھ تو بولتے لیکن وہاں ایک گہری خاموشی اور تکلیف وہ لا تعلق تھی۔ وہ خود اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ منال الگ گم صمم تھی۔ پورے گھر میں ایسا سناٹا تھا جیسے کوئی مہرگ ہو گئی ہو۔

چاروں طرف وحشت مانتی پھرتی تھی۔ اسے اپنے پیارے فیصلے کا علم بھی ہو گیا تھا کہ وہ منال سے نکاح کر رہے ہیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے دل کو چین نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس نے جذباتی ہو کر بہت غلط کر دیا ہے۔ وہ یوں ہی بے قراری سے گھبرا کر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کے کمرے کے برابر ہی شکیل صاحب کا کمرہ تھا۔ اس نے منال کو اندر جاتے دیکھا۔ وہ وہیں رک گئی پھر کچھ سوچ کر دروازے پر آئی۔ اندر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں اس نے کان لگائے۔

”آپ نے ریحاب کو حقیقت کیوں نہیں بتائی؟“ کیوں اس کی غلط فہمی دور نہیں کی؟“ منال کی بھرائی ہوئی آواز نے اسے چونکا کر دیا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔“ شکیل صاحب کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ ریحاب کے اندر تک پھریری دوڑ گئی۔

”لیکن دیکھن کچھ نہیں۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میرے وجود کا حصہ۔ وہ مجھے ایسا گرا ہوا سمجھتی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس کی ماں کے مرنے کے بعد کبھی کسی عورت کے بارے میں نہیں سوچا۔ ریحاب کو اپنی زندگی کا محور بنایا۔ اس کی بہترین تربیت کی۔ اسے محبت دی اور اس نے مجھ پر بھروسہ تک نہ کیا۔ ایک بھروسہ بھی نہ دے سکی وہ مجھے؟ کیا ایسی ہوتی ہے اولاد ہاں۔ اولاد؟ ایسی ہی ہوتی ہے۔

وہ شدید اذیت بھرے لہجے میں بول رہے تھے۔ ریحاب میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ اسے لگا کہ وہ مرجائے گی۔ اس جیسی اولاد کا مرجانا ہی اچھا تھا۔ ایک ٹیپ شدہ فون سننے کے بعد اس نے اپنے باپ کے کردار پر کیسے شک کر لیا؟ اسے خود سے اپنے آپ سے گھن آرہی تھی۔ اس نے دعا کی کہ وہ مرجائے۔

منال کو جو نوکری ملی تھی وہ اس سے بے حد خوش

ذخانیہ ڈائجسٹ 135 مئی 2015

وہ روز کی طرح آفس آئی۔ ابھی اسے آفس آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کا موبائل بجا۔ فون سن کر وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ شارق اسے روٹا دیکھ کر اس کے پاس آیا تھا۔
”کیا ہوا منال۔ خیریت تو ہے نا؟“ وہ مصنوعی پریشانی سے بولا۔

اسپتال سے فون آیا ہے کہ ابا کا ایکسپلینٹ ہو گیا ہے۔ مجھے جانا ہے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”تم پریشان مت ہو۔ میں تمہیں اسپتال ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے آفر کی تھی اور منال نے بنا سوچے قبول کر لی۔ پورے راستے وہ روتی اور دعا میں کرتی رہی۔ چونکی تب جب شارق نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روکی۔

”آپ یہاں کیوں آگئے۔؟“ وہ حیران سی بولی۔
”تمہارے ابا اسپتال میں ہیں یقیناً“ پیسوں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ میں اپنا والٹ گھر بھول گیا تھا وہی لینے آیا ہوں۔“ اس نے اتنا معقول بہانہ پیش کیا تھا کہ اسے شک بھی نہ ہو سکا۔ اور فی الحال اس کے پاس بہت کم پیسے تھے، اپنی انا کو مار کا روہ چپ رہی۔
”تم بھی اندر آ جاؤ۔ پانی والی پی لو۔“ وہ چپ چاپ اتر آئی۔ دماغ حامد صاحب میں اڑکا تھا۔ اس نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ وہ ایک کمرے میں گھس گیا تھا۔ اسے لاؤنج میں بٹھا کر وہ والٹ ڈھونڈنے لگا۔ وہ پانی پینے لگی۔ ٹینشن سے اس کا دل شدید دھڑک رہا تھا۔ کھوڑی دیر بعد شارق اندر آیا۔

”چلیں۔“ اس نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر کہا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی ٹاک اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ شارق کی نگاہیں بدلی تھیں۔ اب ان میں صرف بدلہ نہیں تھا جذبات بھی تھے۔ وہ جذبات جو شدید انا نے دبا لیے تھے۔ وہ بے اختیار اس کے قریب آیا۔

”منال۔“ اس کی آواز اور لہجہ بدل گئے تھے۔ منال کا رنگ اڑ گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا اور اب آگے کیا ہو گا؟ وہ خوف زدہ سی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ شارق نے

تھی۔ اس کی تنخواہ اتنی تھی کہ وہ آسانی سے اپنی ضروریات پوری کر سکتی تھی۔ آفس میں بھی اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہاں کا ماحول بھی کافی سازگار تھا۔ البتہ شارق زمان جو کہ باس کا چچہ تھا۔ اکثر اسے تاڑتا۔ وہ کوفت میں مبتلا ہو جاتی۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔ شارق زمان اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ بظاہر وہ بے حد مہذب انسان تھا۔ لیکن منال چونکہ اس کی توجہ محسوس کر چکی تھی اس لیے اس سے دور رہتی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہی انسان تھا اور وہ اس کے علاوہ کسی اور کو وہ جگہ نہیں دے سکتی تھی۔

چند دن اور گزرے اور شارق زمان نے اسے شادی کے لیے پروپوز کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی اور اسے انکار کر دیا تھا۔ شارق زمان کا تار یک ہوتا چہرہ دیکھ کر اسے افسوس ہوا لیکن وہ بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

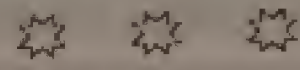
شارق زمان کا دن بدن بڑھتا اصرار اور پاگل بن اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ وہ جاب بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ کیا کرے، کیا نہ کرے کہ درمیان لٹکی رہتی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شارق زمان ایک بھر کا فلرٹی آدمی تھا لیکن چونکہ اسے اب شادی کرنی تھی اس لیے اسے منال پسند آئی۔ اس نے منال جیسی لڑکیاں بہت کم دیکھی تھیں۔ اسے با کردار لڑکی چاہیے تھی اسے منال نظر آئی۔ وہ سچ سچ اسے پسند کرنے لگا تھا لیکن اس کا مستقل انکار اس کا گریز اس کے اندر کے انا پرست مرد کو جگا رہا تھا بلکہ جگا چکا تھا۔

منال کے پیچھے وہ بہت خوار ہوا لیکن پھر بھی وہ نہ مانی۔ اس نے منال کے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ اسے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کیسے اپنے سامنے جھکائے گا۔ وہ خود اس کے پاس آئی اور اس کی منتیں کرتی کہ وہ اس سے شادی کر لے اور اس کے بعد وہ اپنا لیتا۔ اس کا بدلہ پورا ہو جاتا۔ اس نے پلان ترتیب دے دیا تھا۔ اور دن بھی منتخب کر لیا تھا۔

136 مئی 2015

اسے بے بس کر دیا۔ وہ چیختی رہی مگر اس نے اس کی ایک نہ سنی۔

اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اس نے منال کو بتایا تھا کہ اس نے وہ جھوٹا فون کروایا ہے۔ منال نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اسے کچھ کہہ پاتی۔ اسے اب تک قدرت کی اس ستم ظریفی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔



”میں منتظر ہوں کہ کب تم مجھ سے کہو گی شارق مجھے اپنا لیں۔“

اس روز اس نے کیسے خود کو سنبھالا تھا یہ وہی جانتی تھی۔ اگر وہ یہ بات اپنی ماں کو بتاتی تو وہ جیتے جی مرجاتیں۔ وہ خود تو بے موت مر چکی تھی اب کسی اور کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی تھی۔ شارق روز اسی قسم کے پیغامات اسے بھیجتا۔ وہ اب زندہ لاش تھی۔ جبکہ شارق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ مرجائے گی لیکن شارق جیسے گدھ کے سامنے جھکے گی نہیں۔ لیکن یہ شخص اس کی خام خیالی تھی۔ طبیعت خراب ہونے پر اس نے ٹیسٹ کروائے تھے اور تب اسے معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ سن رہی تھی۔ سالوں کی عزت مٹی میں مل چکی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ غم کی شدت سے مرجائے گی۔ وہ اپنے مرنے کی دعائیں مانگتی لیکن وہ بھی قبول نہ ہوتیں۔



ان ہی دنوں شکیل صاحب کسی کام کے سلسلے میں حیدر آباد گئے تھے۔ ایک سڑک پر گاڑی بے قابو ہو جانے کے باعث انہیں چوٹ لگی تھی۔ قریبی کلینک جا کر انہوں نے مرہم پٹی کروانے کا سوچا تھا اور وہاں انہوں نے منال کو دیکھا۔

وہ لیڈی ڈاکٹر سے روتے ہوئے جو کہہ رہی تھی، اس نے ان کو منجھ کر دیا۔ وہاں سے نکلتے منال نے

شکیل صاحب کو دیکھا تو اسے اس آخری صدمے سے بھی گزرنا پڑا۔ انہوں نے بے انتہا غصے سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور اسے باہر لے کر آئے تھے۔

”یہ کیا سن رہا ہوں میں؟“ غصے سے ان کی بری حالت تھی۔ اس نے روتے بلکتے ساری بات انہیں بتادی۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم رہے۔ ”بالکل ساکت اور

چپ۔“

”تم آج ہی میرے ساتھ کراچی چلو گی اور ہاں اس بارے میں ریجاب کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور اس شارق کو تو میں دیکھ لوں گا۔“ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اس شکاری کو قتل کر دیں۔

”میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟ اور رہی بات اس آدمی کی تو جو بھی ہوا اب میری عزت تو واپس نہیں آسکتی۔ میں اور بدنامی نہیں برداشت کر پاؤں گی۔ وہ مجھے بدنام کر دے گا وہ بہت گھٹیا آدمی ہے۔“ منال خوف زدہ تھی۔

”اب یہاں تو میں تمہیں نہیں رہنے دے سکتا۔ اور اس مسئلے کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں۔“ وہ خود بہت پریشان ہو گئے تھے لیکن اسے تسلی دے رہے تھے۔ وہ منال کو اس کے گھر لے گئے۔ وہ بیمار پڑے حامد صاحب کو ساتھ چلنے کے لیے منار ہے تھے اور وہ مان گئے۔ منال کا دن بدن پیلا پڑتا رنگ انہیں پریشان کرتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ باہر نوکری کرنا آسان کام نہیں لیکن انہیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ منال کیا کچھ برداشت کر چکی ہے۔

فون پر ہدایات دے کر وہ انیکسی ٹھیک کروا چکے تھے۔ ریجاب منال کی اچانک آمد پر جہاں حیران تھی وہاں بے تحاشا خوش بھی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ منال آچکی ہے۔



کراچی آ جانے کے بارے میں تو شارق نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے فون پر دھمکاتا لیکن اب وہ اس سے

کیوں ڈرتی؟ اس کے ساتھ ٹھیک تھا۔ وہ اسے اپنے ایک دوست کی لیڈی ڈاکٹر بیوی کے پاس چیک اپ کے لیے لے گئے تھے۔ یہ سب منال کو بے حد شرمندگی سے دوچار کرتا تھا لیکن وہ کیا کرنی؟ مجبور تھی وہ۔ یہ بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی ٹھیک صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے سختی سے منع کیا تھا، لیکن منال کی دن بدن بگڑتی حالت دیکھ کر وہ اسے خود ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر چونکہ ان کے قریبی دوست کی بیگم تھیں اس لیے وہ ان پر بھروسہ کرتے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو صوفشاں نے سن لی تھی۔ وہ اس ڈاکٹر سے ملنے آئی تھیں کہ ان کے ان سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہاں آکر انہیں جیسے خزانہ ہی تو مل گیا تھا۔ ان کی گفتگو کو انہوں نے نہ صرف ریکارڈ کیا تھا بلکہ ایڈٹ کر کے اسے رسد صاحب کو بھیج دیا تھا۔ رسد صاحب کے لیے یہ سب اس قدر حیران کن تھا کہ وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اور پھر رپورٹس بھی اس نے منال کے کمرے سے ڈھونڈ نکالی تھیں۔ اس سب نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ پاگل ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ صوفشاں اپنے اس کارنامے پر بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے بعد میں اسے فون کر کے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عمر سے شادی سے انکار کر دے کیونکہ وہ ایک بد کردار مرد کی بیٹی کو قبول نہیں کر سکتیں۔ اس نے ان کے فون آجانے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ عمر سے تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کرے گی۔ بقول اس کے اتنے نیک بابا بہک گئے تو عمر تو تھا بھی فلرٹ۔ اس نے بنا سوچے سمجھے وہ سب کیا تھا۔ اسے حقیقت کا علم نہیں تھا۔



وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے روتے روتے سراٹھایا اور منال سے بات کرنے کا سوچا۔ وہ اپنا موبائل اٹھا کر منال کے کمرے میں آگئی۔ منال کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے کمرے میں آنا دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ رسد صاحب کے چہرے پر اسے

شرمندگی دکھائی دے رہی تھی اسے حیرت ہوئی۔ رسد صاحب نے کچھ بھی کہے بغیر کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور موبائل میں موجود آڈیو چلائی۔ وہ بلاشبہ اس کی اور ٹھیک صاحب کی آواز تھی لیکن ان کی باتوں کو کاٹ پیٹ کر ایسے جوڑا گیا تھا کہ وہ بھی سن کر ششدر رہ گئی۔

”بتاؤ۔ میں کیا کرتی۔؟ مجھے معلوم ہے کہ میں نے بہت غلط کیا ہے۔ میں معافی کے بھی قابل نہیں لیکن تمہیں مجھے سچ بتانا چاہیے تھا۔ میرے عزیز ترین اور قریبی لوگوں کے بارے میں جب میں یہ سنوں گی اور تمہاری رپورٹس دیکھوں گی تو۔“ وہ رونے لگی۔ منال اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور سب سچ بتا دیا۔ حقیقت جان کر تو وہ اور بھی شرمندگی کے گڑھے میں گر گئی۔

”میں حیدر آباد شارق سے ملنے گئی تھی۔ اماں ابا سے بھی مل نہیں پائی۔ وہ کچھ دن بعد ہی حیدر آباد چلے گئے تھے تاکہ گھر پر رہ سکیں۔ شارق نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ میری اور اپنی وڈیو نیٹ پر اپ لوڈ کر دے گا۔ وہ ایسا کر بھی سکتا ہے۔ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ پھر ٹھیک صاحب کو بتایا تو انہوں نے اسے ذرائع استعمال کر کے اسے غائب ہی کر دیا۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں بول رہی تھی۔“

”شارق پولیس کی تحویل میں ہے اور سالوں کے لیے اندر چلا گیا ہے۔“

”میں اس قابل تو نہیں کہ معافی مانگ سکوں لیکن پھر بھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ منال نے اس کے ہاتھ پکڑے۔ جس قسم کا یہ آڈیو کلپ تھا اس کے بعد تمہارا ایسا سوچنا حیران کن نہیں۔“ منال نرمی سے بولی۔

”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری زندگی میں اتنا سب کچھ ہو گیا۔ میں غلط فہمیوں میں گھری اپنے رونے روٹی رہی۔“ وہ روتے ہوئے بولی منال نے اسے ساتھ لگایا۔

وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اور یہ سب جو بھی ہوا، منزل کو لگتا تھا کہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ ٹھیک اس کی مدد کرتے نہ ریحاب غلط فہمیوں میں پڑتی۔

ریحاب کی جان مشکل میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں اتنی آسانی سے اسے معاف نہیں کریں گے۔ اس کے پیپا کی دکھ بھری آواز، مان ٹوٹنے کا غم، کیا کچھ نہیں تھا ان کے لہجے میں۔ اور اس نے عمر کو بھی کتنا تنگ کیا تھا۔ دونوں ہی اسے بہت عزیز تھے اور دونوں ہی اب اس سے شدید ناراض بھی۔

وہ دن میں دس بار ان کے کمرے کے چکر کاٹتی، وہ اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے۔ اس کا دل کٹ جاتا۔ دن رات روتے ہوئے گزرتے تھے۔ دوسری طرف عمر بھی اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔

منزل کے والدین بھی آگئے تھے۔ اور ان سے رشتے کی بات بھی ریحاب نے ہی کی تھی۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ ٹھیک صاحب بھلے ہی اس کی دوست کے والد تھے لیکن اتنی بڑی عمر کے ہرگز نہیں تھے۔ اور جس قسم کی طبیعت خالد صاحب کی ان دنوں تھی، انہیں یہی بہتر لگا کہ وہ مل کر دیں۔

ٹھیک صاحب تو بالکل ہی اس سے لا تعلق تھے۔ ریحاب روتی رہتی۔ منزل اسے کب تک سنبھالتی۔ شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ وہ اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی لیکن شہر کے اس مہنگے ہال میں بھی روشنیاں اندھیرے کا مقابلہ کرتے اتری تھیں۔ منزل نے اپنے نکاح کا دن آگے بڑھا لیا تھا۔ وہ لوگوں کے اس ہجوم میں کیسے دلہن بن کر بیٹھتی وہ بھی ٹھیک صاحب کی۔ وہ بھی اس کی مشکل سمجھ گئے تھے۔ ریحاب دلہن بنی بے حد حسین لگ رہی تھی اتنی کہ عمر کی اس پر نگاہ پڑتے ہی ساری ناراضی اڑن چھو ہو گئی۔ جبکہ ٹھیک صاحب لاکھ کوشش کرتے پر آج کے دن وہ اپنے دل کو اداس ہونے سے روک نہیں پائے تھے۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں اور پھر اس کی رخصتی کا وقت بھی قریب آ گیا۔

ریحاب جب ان کے گلے لگی تو ساری ناراضی، آنسوؤں میں بہہ گئی۔ وہ رو رو کر ان سے معافی مانگ رہی تھی۔ ان کا دل اس کی طرف سے صاف ہو چکا تھا۔



ریحاب بھی سنوری چوروں کو بھی مات دیتی پلنگ کے عین وسط میں بیٹھی تھی۔ وہ عمر کی ناراضی کا سوچ سوچ کر پریشان تھی۔ تب ہی عمر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ سوچوں میں ابھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے قریب بیٹھنے پر وہ چونکی۔ فوراً ہی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

”تم پھر رونا شروع ہو گئیں۔“ عمر اچھٹے سے بولا۔
”آئی۔ ایم ریلی سوری عمر! میں نے آپ کو بہت ہرٹ کیا۔“ وہ سوں سوں کر کے کہہ رہی تھی۔ عمر نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں وہ ساری بری باتیں بھلا چکا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو ریحاب خوش ہو گئی۔

”میں اپنی اس نئی زندگی کی شروعات لڑائی جھگڑے یا ناراضی سے نہیں کرنا چاہتا۔ تم نے اس وقت جو کیا، وہ غلط نہیں کا نتیجہ تھا۔ چاہے غلط سہی لیکن پھر بھی۔ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی غلطیاں معاف کرنے کا ظرف بھی رکھا جاتا ہے۔ اور مجھے تم سے بے تحاشا محبت ہے۔ اور میں وہ سب بھول چکا ہوں۔ آج سے ہماری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ بولو اس نئی زندگی میں تم میرا ساتھ دو گی؟ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ ریحاب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ کر یقین دہانی کرائی تھی۔



نکاح

پھر وہاں پہنچا تو اس نے کہا کہ یہاں سے کبھی نہ دو نفاست
پسند تو ہوا کرتی ہے۔

”آئی ہے ہر وقت ہمیں نفاست پسندی کا لکچر دیتی
رہتی ہیں مجھے تو بے غصہ آتا ہے۔“ ناجیہ مہ کاہل سے
بولی ہو گئی تامل پڑھنے میں مصروف تھی، ہر نفاست
پسندی کا سن کر فوراً تامل بند کر کے ناجیہ کی طرف
پلٹی۔ آخر کو سوریہ کی نفاست پسندی پر برا بھلا اس نے
بھی تو کہنا تھا۔

”ہاں آئی ہمیں تو ایسے نفاست پسندی کا لکچر دیتی
ہیں جیسے شادی سے پہلے خود تو بڑی نفاست پسند تھیں۔
یاد ہے پہلے کیسے چاہتے پر سے ملائی اٹھا کر ٹرے پر رکھ
دیتی تھیں، اب کل جب یہی میں نے کیا تو نفاست
پسندی پر لکچر اشارتاً۔“ مہ کاہل نے سر جھٹکتے ہوئے
کہا۔ وہ سوریہ کی نفاست پسندی سے جی بھر کر بے زار
تھی۔

”اور تمہیں یاد نہیں آئی کی شادی سے پہلے کیسے
برتن جگہ جگہ پڑے رہتے تھے، تب تو کوئی خیال نہیں
ہوتا تھا اور اب ایک برتن ادھر ادھر پڑا ہو تو لکچر ار
نفاست پسند لکچر دینا شروع کر دیتی ہیں۔“ ناجیہ نے بھی
اپنی بھڑاس نکالنی چاہی اس کا دکھ کونسا مہ کاہل سے
مختلف تھا۔

”یہ دیکھو ذرا کتنی گرد جمی ہوئی ہے اس کرسی پر۔
صاف بھی کر لیا کرو، کبھی ہر وقت بیٹھی ہی رہتی ہو
دونوں۔“ سوریہ کمرے میں داخل ہوئی اور کرسی کی سطح
کو چھوتے ہوئے بولی جس پر ذرا سی گرد جمی بھی ناجیہ
اور مہ کاہل کے خیال میں۔ اور اب وہ دونوں جانتی
تھیں کہ ایک طویل لکچر شروع ہونے والا ہے، اس
لیے ان دونوں نے اپنے دونوں کان کھول لیے۔ ایک
کان سے سن کر سر ہلانے کے لیے اور دوسرے کان
سے باہر نکالنے کے لیے اور ویسے بھی سوریہ کی باتوں
پر ایک کان کے کام سے گزارا کرنا ذرا مشکل تھا۔

حد ہوتی ہے بھی، تم سے برتن تک جگہ پر نہیں
رکھے جاتے۔“ سوریہ نے اپنی چھوٹی بہنوں ناجیہ اور مہ
کاہل کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ناجیہ فوراً ”اٹھی
اور برتن کچن میں پہنچائے، کیونکہ وہ نفاست پسندی پر
لکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ جو سوریہ ہر وقت دینے
کو تیار رہتی تھی۔

”سسرال جاؤ گی تب پتا چلے گا کیسے کیڑے نکالتے
ہیں سسرال والے ہر کام میں۔“ سوریہ بینہ چکی تھی اور
لکچر دینے کو تیار تھی۔ مہ کاہل اور ناجیہ نے ایک
دوسرے کی طرف اکٹھاٹ بھری نگاہوں سے دیکھا۔
”میں تو اپنے گھر میں ایک چیز ادھر سے ادھر
برداشت نہیں کر سکتی۔“ سوریہ نے فخریہ انداز سے
کہا۔ اور ناجیہ اور مہ کاہل چپ کر کے سستی رہیں کہ
بول کر لکچر کو طوالت ضرور دینی ہے۔ جو ویسے ہی بہت
طویل ہوتا تھا۔

سوریہ کی شادی کو دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اور اب
تک وہ علیحدہ گھر میں منتقل بھی ہو چکی تھی۔ وہ جب
بھی میکے آتی تھی مہ کاہل اور ناجیہ کو نفاست پسندی پر
لکچر دیتی رہتی تھی۔ وہ دونوں ہی اس کا لکچر سننے سے
بچتی تھیں۔ ان دونوں نے سوریہ کا نام لکچر اور نفاست
پسند رکھا ہوا تھا۔ اس کی آمد پر دونوں کافی نفاست پسند
بن جاتی تھیں۔ چادر پر ایک بھی سلوٹ نہیں،
الماریاں ترتیب سے سیٹ برتن ہمیشہ ان کی جگہ پر اور
کچن ہر وقت چمکا کر رکھتی تھیں جو عام دنوں میں کرنا
دونوں ہی گناہ سمجھتی تھیں۔ ان کی اتنی محنت کے باوجود
بھی سوریہ کوئی نہ کوئی بات ڈھونڈ لیتی تھی اور انہیں
ایک طویل لکچر سناتی تھی۔ سوریہ کے آنے سے اور

بہت مشکل ہوتا ہے۔ ”مہ کامل نے ناگواری سے کہا۔
ناجیہ نے سر ہلا کر اس کی بات سے اکتفا کیا۔



”ناجیہ تم نے دیکھا؟“ مہ کامل نے صحن میں کھڑی
ناجیہ کے پاس آتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔
”نہیں کیا؟“ ناجیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے
سوال کیا۔

”آپی برتن دھوتے ہوئے لیکوئیڈ کا صرف ایک
قطرہ ڈالتی ہے اور سارے برتن دھو لیتی ہیں بالکل اس
اشتہار پر عمل کرتی ہیں کہ ایک قطرہ ڈالو اور سارے
برتن دھو ڈالو۔“

”ہاں اور اتنے گندے دھوتی ہیں‘ تو بے مجھے تو

مہ کامل اور ناجیہ ایک دوسرے کی طرف بے بسی
سے دیکھتے ہوئے کپڑے بیگ میں ڈال رہی تھیں۔
”مطلب اب ہم بذات خود چل کر لیکچر اور نفاست
پسند کے پاس جا رہے ہیں؟“ ناجیہ نے اپنی بڑی بہن مہ
کامل کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں مطلب تو یہی ہے۔ یہ امی بھی نا اگر عارف
بھائی (آپی کے شوہر) کچھ دن کے لیے اسلام آباد
جا رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور کہ ہم آپی کے پاس
جا کر رہیں۔“

”ہاں اب روز آپی کے نفاست پسندی پر لیکچر سننے
پڑیں گے اوہ گاڈ“

”جانا تو بڑے گا امی کا حکم جو ہے‘ تو ذرا کپڑے صحیح
طرح سیٹ کر کے رکھو کہ کہیں جاتے ہی لیکچر نفاست
پسند اس بات پر شروع نہ ہو جائیں کہ کپڑے بھی صحیح
طرح نہیں رکھے جاتے۔“ مہ کامل نے ناجیہ سے کہا
کیونکہ اب جانا تو تھا ہی‘ تو اب وہ یہی کر سکتی تھیں کہ
سویرا کو لیکچر دینے کا موقع کم سے کم دیں۔

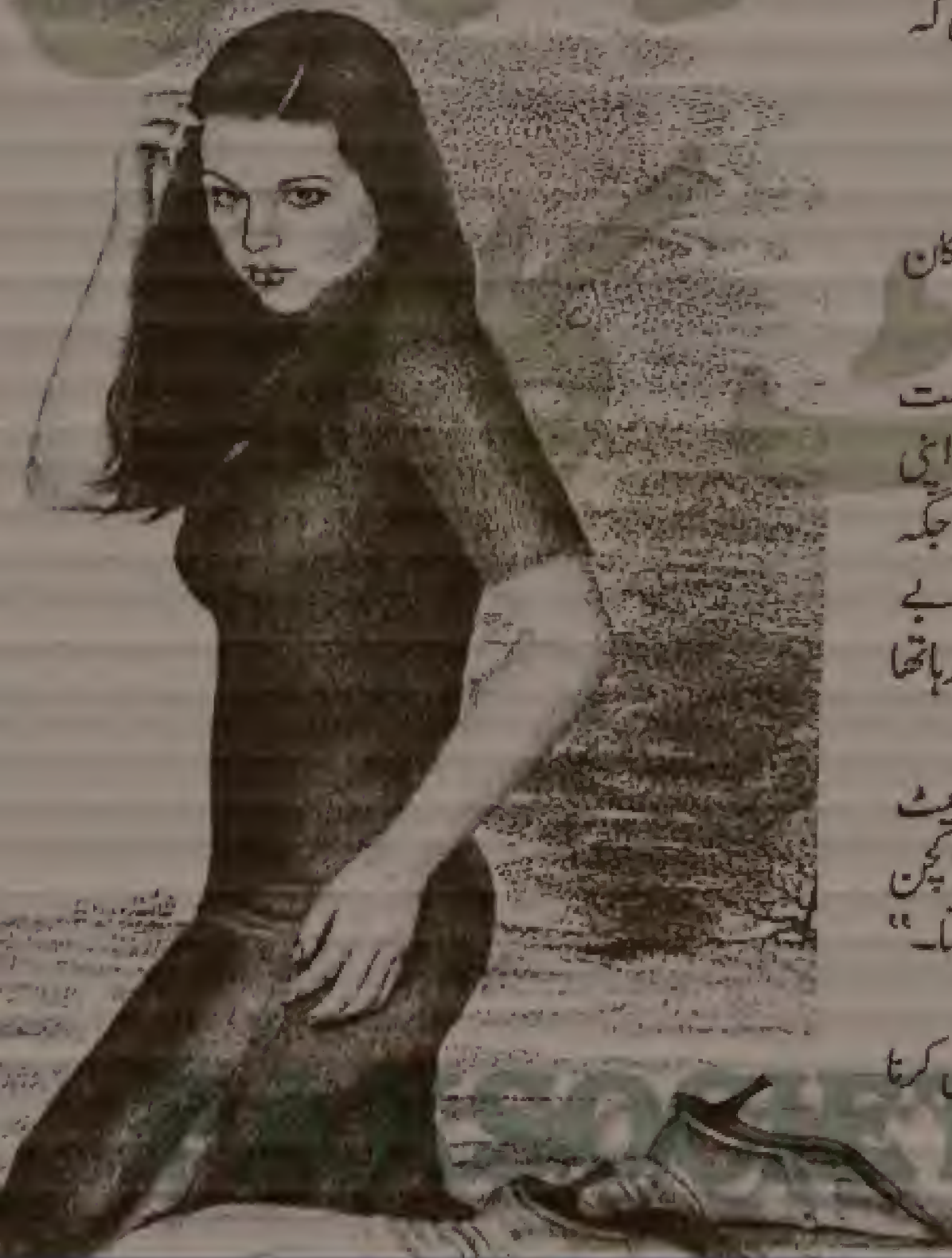


”کیا سوچا تھا اور کیا ملا۔“ ناجیہ نے مہ کامل کے کان
میں سرگوشی کی۔

”ہاں تو اور کیا“ میں نے تو سوچا تھا کہ بہت نفاست
سے سیٹ ہو گا آپی کا گھر پر یہ تو۔“ مہ کامل نے اپنی
بات ادھوری چھوڑ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ جگہ جگہ
فرش پر چیزوں کے کاغذ بکھرے ہوئے‘ چادر پر بے
تحاشا سلو میں پردے بلا کے میلے اور صفائی تو لگ رہا تھا
عرصے سے نہیں ہوئی۔

”ہمارے اتنے بڑے گھر کو نفاست سے سیٹ
کرنے کے درس دیتی ہیں اور اپنے ایک کمرے‘ کچن
اور واش روم کا گھر بھی صحیح طرح سیٹ نہیں ہوتا۔“
ناجیہ نے مہ کامل سے کہا۔

”ہاں‘ درس دینا ہی آسان ہوتا ہے خود عمل کرنا



استعمال کرنے سے پہلے دوبارہ دھونے پڑتے ہیں۔“
ناجیہ نے کہا۔

”ویسے اس میں لیکوئڈ کا قصور نہیں ہے، آپلی خود ٹھیک طرح نہیں دھوئیں ورنہ ہم بھی تو اسی سے اتنے اچھے دھو لیتے ہیں۔“ مہ کامل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہاں آکر مجھے ایک بات پتا چلی ہے کہ آپلی بس باتوں باتوں میں نفاست پسند ہیں۔ حقیقت میں خود نہیں ہیں۔“ ناجیہ نے اپنا تجربہ بیان کیا۔
”ہاں وہاں تو آپلی کہتی تھیں کہ ایک چیز بھی مجھے اس کی جگہ سے یہاں وہاں برداشت نہیں ہوتی، یہاں آکے پتا چلا کسی چیز کی کوئی جگہ ہو تو انہیں برداشت نہیں ہوتا۔“

”تم دونوں وہاں کھڑی کیا باتیں کر رہی ہو؟“ سویرا نے صحن میں دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر پوچھا۔
مہ کامل اور ناجیہ سویرا کی آواز سن کر مڑیں تو دیکھا وہ پردے سے اپنے کیلے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ ان دونوں کا دل چاہا پوچھیں کہ اب کہاں گئی نفاست پسندی پر وہ دونوں خاموش رہیں کہ وہ نفاست پسند اپنے آپ میں بہت بڑی نفاست پسند ہے، یہ بات وہ دونوں جانتی تھیں۔

”شکر ہے گھر آگئے ہیں ورنہ تو اس نفاست پسندی کی نفاست پسند مار دیتی۔“ مہ کامل نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں مہ کامل پر میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم ہی تنگ ہیں لیکچرار نفاست پسند سے، پر نہیں ہم اکیلے نہیں ہیں عارف بھائی بھی تنگ ہیں

ان کے لیکچرز سے، چلو ہمیں تو کبھی کبھار ملتا ہے پر عارف بھائی کو تو روز ملتا ہے بے چارے کیا کہہ رہے تھے۔“ ناجیہ نے بات ادھوری چھوڑی پوری جو مہ کامل نے کرنا تھا۔

”خوب لیکچر ملا ہو گا تم دونوں کو نفاست پسندی کا سچا کر لیکچر کے ساتھ ساتھ کام میں بھی نفاست پسندی کا عنصر ہو تا تو بندہ چپ کر کے سن بھی لے، پر جب صرف باتوں میں نفاست پسندی ہو تو بولنے کا دل چاہتا ہے کہ بندہ بتائے کہ نفاست پسندی ہوتی کیا ہے، پر بھی ہم تو لیکچر کو طوالت دینے سے ڈرتے ہیں۔“ مہ کامل نے ہو عارف کی بات دہرائی۔

”ویسے مہ کامل! تصور آپلی کا بھی نہیں ہے وہ واقعی سمجھتی ہیں کہ وہ بہت نفاست پسند ہیں نفاست پسند کا صحیح مطلب جو نہیں پتا انہیں۔“ ناجیہ نے اپنی بات مکمل کر کے قہقہہ لگایا جس میں مہ کامل کا قہقہہ بھی شامل ہو گیا۔

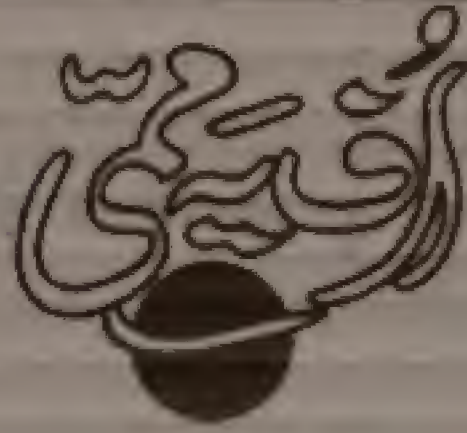
”حق ہا رضیہ بہن! میری سو تو ذرا بھی نفاست پسند نہیں ہے، برتن پورا پورا دن ایک ہی جگہ پر پڑے رہتے ہیں، لیکن اسے کوئی ہوش نہیں ہوتا۔“ ناجیہ وغیرہ کی ہمسائی ان کی ای کے پاس آئی بیٹھی تھیں مہ کامل اور ناجیہ بھی چائے سرو کرنے کے بعد ان کے دکھڑے سن رہی تھیں۔

”آپ کی بیٹیاں تو ماشاء اللہ بہت نفاست پسند ہیں۔“ ان کی ہمسائی نے محبت بھری نگاہوں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ دونوں محض مسکرا کر رہ گئیں۔

”جی بہن اللہ کا شکر ہے یہ دونوں تو اتنی نفاست پسند نہیں ہیں ابھی آپ میری بڑی بیٹی سویرا کو دیکھیں تو نفاست پسندی کا مطلب پتا چلے آپ کو اس کے جیسا نفاست پسند تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“ رضیہ خاتون نے محبت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اور مہ کامل اور ناجیہ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی

آنکھوں میں ایک واضح تحریر تھی جسے وہ دونوں بخوبی پڑھ سکتی تھیں۔

”خدا نہ کرے کہ سویرا آپلی جیسا نفاست پسند اس دنیا میں کوئی اور ہو۔“





مُکملِ تاویل

قالب میں رکھ کر وہ اپنا لہجہ سرسری بنایا۔
 ”ممی کبھی میرے بغیر تنہا نہیں رہیں ناں علی! تو
 میری جدائی کا سوچ سوچ کر انہوں نے دیکھو تو اپنا کیا
 حال کر لیا۔“ انشراح رو ہالسی ہو کر بولی، جبکہ ممی جی کی
 آنکھوں سے بھی آنسو جھرجھر بننے لگے۔ پڑ پڑ بولتی
 انشراح شاید بھول رہی تھی کہ وہ دلہن ہے اور آج ان
 کی شادی ہوئی ہے، اف یہ ممی۔ علی نے دل میں ایک
 بار پھر دہرایا اور ممی کے دوسری طرف آن بیٹھا۔
 ”آپ کی انشراح کو آپ سے دور نہ کروں اسی لیے تو
 میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا ہے ممی! پھر کس جدائی کا
 سوچ کر آپ نے یہ حال کر لیا ہے۔ آپ کا کمرہ ہے اور
 اس سے صرف دس قدم کے فاصلے پر ہمارا کمرہ ہے۔
 آپ کے اتنے قریب کہ آپ کی ایک پکار پر ہی ایک
 منٹ کی دیر کیے بغیر آپ کے پاس موجود ہوں۔“
 ”علی! میری انشراح کو بہت خوش رکھنا۔ کبھی کوئی

وہ بڑی ترنگ ہیں پھولوں سے سجے اس کمرے میں
 داخل ہوا تھا۔ جہاں اس کے خوابوں کی تعبیر انشراح اپنا
 پور پور اس کے لیے سجائے اس کی منتظر تھی۔ اس
 کمرے کو دونوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق سجایا اور
 ترتیب دیا تھا۔ آج اس کا شرمایا شرمایا سا روپ اسے
 بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی وہ اس کے سجے سنورے
 روپ کو نظر بھر کر دیکھ نہ پایا تھا کہ زوردار دستک پر وہ
 دونوں ہی چونک گئے۔

خوب صورت لمحوں کافسوں ٹوٹنے پر وہ جی بھر کر
 بد مزہ ہوا دروازہ کھولتے پر اسے اپنی ملازمہ شریفان کی
 گھبرائی صورت نظر آئی۔

”وہ۔ وہ علی بابا! انشراح بے بی کی ممی کی طبیعت بہت
 خراب ہو گئی ہے جی، وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔“
 اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے گھبرائی
 آواز میں کہا۔ اس کی آواز انشراح تک بھی پہنچی تھی،
 جب ہی لال رنگ کا بھاری لہنگا سنبھالتی انشراح تیزی
 سے بید سے اتر آئی۔

”کیا ہوا ممی کو۔ آؤ میرے ساتھ۔“ علی کو اس بل
 یکسر نظر انداز کرتی انشراح اس کے پاس سے گزر کر
 شریفان کو ساتھ لے کر ممی کے کمرے کی جانب بڑھ
 گئی۔

”اف یہ ممی!“ وہ کراہا۔ ممی نے ایک بار پھر اس کے
 ارمانوں پر شب خون مارا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ
 ڈھیلے قدموں سے چلتا ممی کے کمرے کی طرف بڑھ
 گیا۔ ممی اب ہوش میں تھیں۔ دلہن بنی انشراح ان
 کے بالکل پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ممی نے
 اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا
 جبکہ شریفان ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

”وہ دیکھیں وہ آگئے علی بھی۔ آپ ایسے ہی پریشان
 ہو رہی تھیں۔ علی بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے
 جتنی میں کرتی ہوں۔“ انشراح نے علی کو دیکھ کر ممی کی
 گویا تسلی کرانی چاہی، انہوں نے کچھ کے بغیر صرف
 آہستہ سے سر ہلا دیا۔

”کیا ہوا ہے ممی کو؟“ بمشکل اپنے اندر کے ابال کو

کی سوچتی رہی۔

بہنہ بہنہ بہنہ

علی کے ماں باپ بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ بچپن سے ہی وہ اپنے ماموں کے پاس رہا تھا۔ جو کہ مستقل مسقط میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے اپنے بھی دو بیٹے تھے علی کی بھی انہوں نے بیٹے کی طرح ہی پرورش کی تھی۔ پھر بچوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اپنا گھر کاروبار سب کچھ پاکستان منتقل کر دیا تھا۔ پھر دونوں بیٹوں کی اپنے رشتہ داروں میں شادی بھی کر دی تھی۔

ان ہی دنوں علی کی جاب ایک نجی کمپنی میں دوسرے شہر ہوئی تو ماموں نے اسے اپنے رشتہ کی ایک بہن کا ایڈریس دیا تھا کہ نیا شہر نئی جگہ ہے وہ بیوہ عورت ہیں تو پہلے ان سے جا کر ملے ساتھ ہی ایک خط بھی دیا تھا۔ انشراح اور اس کی مامی سے اس کا پہلا تعارف یہاں آکر ہوا تھا۔

انشراح کی مامی ماموں کی دُور پرے کی کزن تھیں۔ انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اپنے اوپر کے پورشن کو اس کی رہائش کے لیے صاف کر دیا تھا۔ علی

نے اسی شرط پر ان کی بات مانی تھی کہ وہ کرایہ دے کر رہے گا ورنہ نہیں۔ تھوڑے سے رد و کد کے بعد وہ بیان گئی تھیں ویسے بھی ان کی بیٹی کالج میں زیر تعلیم تھی اور اسی محلے میں تین دوکانیں ان کی اپنی ملکیت تھیں جو کہ کرایہ پر دی ہوئی تھیں ان ہی کے کرایہ کی رقم سے ان کے گھر کا گزارا ہوتا تھا۔

ویسے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا پر انشراح کی مامی انشراح کے حوالے سے بے حد شدت پسند تھیں۔ اتنی کہ عام طور پر والدین کی بچوں سے محبت تو دیکھنے کو ملتی ہے پر محبت کی ایسی قسم سے علی کا پہلی بار پالا پڑ رہا تھا۔ مامی نے پہلے دن ہی باور کرایا تھا کہ چونکہ علی کے ماموں ان کے دور کے رشتہ دار ہیں سو وہ ان کا بھی بیٹا ہوا اور منجھناشتا بھی ان کے ساتھ ہی کیا کرے اور شام

دکھ نہ دینا۔ اس کی سلی کے جواب میں انہوں نے وہی الفاظ دہرائے جو رشتہ ہونے سے لے کر آج تک بلا مبالغہ وہ سینکڑوں نہیں ہزاروں بار دہرا چکی تھیں۔
”اس کو میرے پاس رہنے دیں گی تب ہی کسی خوشی کا سوال پیدا ہوگا۔ دل ہی دل میں وہ بولا پر زبان سے کچھ اور الفاظ ہی ادا ہوئے۔

”جی جی مامی! آپ فکر ہی نہ کریں آپ کو زندگی بھر میری طرف سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔“

”دیکھا مامی! یہ مجھ سے زیادہ آپ کو چاہتے ہیں۔“ انشراح چکی۔ وہ بے بسی سے اپنی نئی نویلی دلہن کو اپنی ماں کے جاؤ پورے کرنا دکھاتا رہا۔

”شریف! جاؤ مامی کے لیے دودھ گرم کر کے لاؤ۔ اتنی سی دیر میں کیسے چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔“ انشراح کی تشویش پر علی ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”لو کے مامی! میں بہت تھک گیا ہوں صبح اٹھ کر ولیمہ کے انتظامات بھی دیکھنے ہیں چلتا ہوں۔“

اس سے برہم کر اس میں مامی کے ناز اٹھانے کی ہمت اور وقت تھا نہ ان کی بیٹی کے لیے کمرے میں آکر اس نے غصے میں پھولوں کی لڑیاں کھینچ ڈالیں۔ نیکیے اٹھا کر نیچے پھینک دے، جلتے کڑھتے نہ جانے تھکا ہوا جسم اور دماغ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پتا ہی نہ چلا۔

دوبچے کے بعد جا کر کہیں مامی کو سلا کر انشراح کو اپنے دولہا کا خیال آیا تھا وہ شریفان کو مامی کے پاس سونے کا کمرہ کر کئی ہدایات دے کر اپنے کمرے میں آئی تو کمرے کا حشر دیکھ کر علی کے غصے کا اندازہ ہوا۔ زیرو کا نیلگوں بلب اپنی کمزور روشنی میں بھی کمرے کی حشر سلامتیاں دکھا رہا تھا۔

”لوہ۔ میں نے شاید زیادتی کر دی۔ آج کے دن کے حوالے سے علی کے پاس میرے لیے بہت سے سربراہ تھے اور اس نے مجھے کوئی گفٹ بھی دینا تھا۔“
”اف میں نے ایک بار پھر اسے خفا کر دیا۔“

زیور اتار کر رکھتے۔ کپڑے تبدیل کرتے وہ مسلسل

کو کھانا بھی انہی کے ساتھ کھائے۔ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد وہ مان گیا تھا۔

پر مئی کے اپنی بیٹی سے محبت کے انوکھے مظاہرے اسے اکثر ہی حیران کر دیا کرتے۔ جیسے پہلے دن وہ ناشتے کے لیے نیچے آیا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب اس نے مئی کو انشراح کو چھوٹے بچوں کی طرح خود ہی ایک ایک نوالہ منہ میں دیتے دیکھا، پہلی بار اسے حیرت ہوئی پھر وہ عادی ہو گیا کہ محبتوں کے اس سے بھی بڑے مظاہرے اسے اپنی آئندہ زندگی میں بھی دیکھنے کو ملے تھے۔

صبح وہ ناشتا کر کے روانہ ہو رہا ہوتا تو اسی وقت انشراح کی دس بھی کالج کے لیے اسے لینے آئی ہوئی تھی۔ کمپنی کی طرف سے اسے بائیک بھی ملی تھی۔ جس کو اشارت کرتے ہوئے اسے مئی کی وہ ہدایات اور اقدامات دیکھنے کو ملے جو انہوں نے دس ڈرائیور اور ساتھ بیٹھی لڑکیوں کو دس یہی نہیں انہوں نے کئی لڑکیوں کی جگہ تبدیل کر کے انشراح کو بٹھایا پھر اٹھایا پھر بٹھایا پھر گاڑی چلانے کے حوالے سے ڈرائیور کی گوشامی بھی ہوئی۔

ان کے اس عمل کے پیچھے کیا رد عمل کار فرما تھا وہ نہیں جانتا تھا پر اس نے قصداً ”ویر ضرور لگائی اس دن کہ مئی کی محبت کے اس مظاہرے پر اس نے ڈرائیور اور لڑکیوں کے منہ کے بگڑتے زاویے بھی دیکھ لیے تھے۔ یقیناً وہ روزانہ ہی ایسا کرتی ہوں گی۔ عجیب سی کوفت محسوس کرتے ہوئے وہ آفس چلا گیا تھا شام کو واپسی پر وہ دونوں ماں بیٹی کھانے پر اسے اپنی منتظر ملی تھیں وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو گیا۔

”دیکھیں آنٹی۔ میرا کام کچھ اس قسم کا ہے کہ مجھے ویر سویر ہو جایا کرے گی۔ آپ ایسا کریں گی تو میں اچھا محسوس نہیں کروں گا۔ آپ اپنے معمولات میں میری وجہ سے کوئی فرق نہ آنے دیں پلیز۔ ایک دو دن میں کھانے کا آرینج ہو جائے گا میرا پلیز۔“

کرسی گھسیٹ کر بیٹھا وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔

”ارے نہیں بیٹا! کیسی بات کرتے ہو۔ احسان کے بیٹے ہو، سمجھو میرے بھی بیٹے ہو اور اپنے بچوں کا انتظار کرتے ماں میں تھکتی ہیں بھلا۔ بلکہ تم مجھے آنٹی کی بجائے مئی بلاؤ گے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“ انہوں نے کہا تو اس نے سوچ لیا کہ وہ ان کے خلوص کی قدر تو کرے گا پر کسی طریقے سے ان کی اہمیت بھی کر دیا کرے گا۔ ایسے کہ ان کو پتا بھی نہ چلے کہ وہ کھانے کا معاوضہ ادا کر رہا ہے بس وہ طریقہ اسے سوچنا تھا۔

”اور انشراح آپ کیا کرتی ہیں؟“ مئی کی بہت خوب صورت اور نٹ کھٹ سی بیٹی سے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔ جسے آنٹی اب پھر سے بچوں کی طرح ایک ایک چمچہ خود سے کھلا رہی تھیں۔

”میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ لی ایس سی کے فائنل ایر میں۔ پڑھائی کے بعد کاجو ٹائم ہوتا ہے وہ مئی کے ساتھ گزرنا ہے میرا۔“

”ہوں۔ آنٹی کھانا بہت مزے کا بنا ہے اور آپ۔ آپ خود کھا میں ناں۔“

لہجے کو انتہائی سرسری سا بناتے اس نے گویا انہیں چونکا دیا تھا۔

”کیسی بات کرتے ہو بیٹا! میں بھلا انٹی کو کھلانے سے پہلے کیسے کھانا کھا سکتی ہوں؟ بلکہ تم تو کیا کوئی بھی شاید اس بات پر یقین نہ کرے کہ انشراح کو کھلا کر بعض دفعہ میں ایسے محسوس کرتی ہوں کہ میرا پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔“ وہ ایک جذب کی سی کیفیت میں انشراح کے منہ میں چمچ دیتے ہوئے بولیں۔ ایک پل کو علی اپنا کھانا کھانا بھی بھول گیا۔

”لیکن آنٹی۔ انشراح ماشاء اللہ اب بڑی ہو گئی ہے۔

ماں باپ کی محبت اپنی جگہ، لیکن بہت زیادہ بھی بچوں کو اپنا عادی بنا لیتا بعض اوقات بچوں کی خود اعتمادی کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک کمی سی رہ جاتی ہے بچے کے اندر۔

کل آخر آپ انشراح کی شادی بھی کریں گی پھر یہ کیسے آپ کے بغیر اور آپ اس کے بغیر رہ پائیں گی۔“ اس نے نہ مکن سے ہاتھ پونچھے اور بے ساختہ اپنے خیال کا

قسم کا اعتبار ہے۔ لیکن الشرح کو سوائے کالج ٹائم کے، میں کہیں بھی نہ سنا نہیں چھوڑتی۔ سوچ سوچ کر میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے کہ میری بیٹی مجھ سے دور ہے۔ تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرو میں ایک طرف خاموش بیٹھی رہوں گی۔ بالکل بھی ڈسٹرب نہیں کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ علی طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اسے انشراح اب ایک جیتی جاگتی لڑکی نہیں، بلکہ ایک روبوٹ معلوم ہوتی جس کی زندگی کے ہر معاملے کی ڈور می کے ہاتھ میں تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ آج کل کی لڑکیوں والی تیزی و طراری اس میں مفقود تھی وہ اپنے ان معمولات پر راضی برضا تھی۔ پھر ایک دن پڑھانے کے بعد اس نے نیچے جاتی انشراح کو مخاطب کیا۔

”سنو انشراح۔ ایک کپ چائے بنا دو پلیز۔ آج آفس میں بہت کام تھا۔“ انشراح کے رد عمل کو تو اس نے دیکھا نہیں کہ اس کے پیچھے جاتی می جھٹکے سے مڑیں۔

”نہیں“ نہیں علی بیٹا! میں بنا کر دیتی ہوں ناں تمہیں چائے۔ انشراح کو میں کچن تو کیا کسی بھی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ خدا نخواستہ میری بچی کو کچھ ہونہ جائے۔“ علی کو پہلے صرف تھکاوٹ ہو رہی تھی پھر تو سر میں بھی درد ہونے لگا۔ ”اف یہ می“ وہ پہلا دن تھا جب اس کے دل سے بے ساختہ یہ پکار نکلی اور آنے والے دنوں میں یہ تین لفظ اس کی زندگی کے ساتھی بن گئے تھے گویا۔

اسے گھر گئے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے ماموں، ممانی سب گھر والوں کی یاد نے کچھ ایسے اس پر غلبہ پایا کہ تین دن کی چھٹی لے کر اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ سب بہت خوش ہوئے تھے۔ شام کو ماموں کے پاس بیٹھا وہ چائے پی رہا تھا جب ماموں کی بات سن کر وہ چونک گیا۔

”اور سناؤ بیٹا! ساجدہ اور اس کی بچی کیسی ہے! کیسی

اظہار بھی کر دیا۔“ شادی۔ ایک سرسراتی ہوئی آواز می کے حلق سے برآمد ہوئی۔ علی تو ان ماں بیٹی کے تاثرات سے ہی خائف ہو گیا، پھر ایک لمحہ کو اپنی کسی بات کو دل ہی دل میں دہرا کر دیکھا کہ آیا ایسی کو کسی سنگین بات اس کے منہ سے انجانے میں نکل گئی می کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔

”میں نے انٹی کی شادی بالکل نہیں کرنی اس کو ساری عمر اپنے پاس رکھنا ہے۔“ سرگوشی میں کہی اس بات نے علی کو جیسے کرنٹ سا لگا دیا۔

”ہاں علی بھائی! میں نے کوئی شادی وادی نہیں کرنی مجھے تو سسرال نام کی بلا سے بہت خوف آتا ہے۔“ انشراح نے اپنے مخصوص لائیو بالی پن سے کہا تو می کے چہرے کی رونق بحال ہوئی تھی۔ انہوں نے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔ علی ان کی طبیعت اور ایسی شدید محبت کے بارے میں سوچتا اور پرچلا آیا تھا۔



پھر ایک بار می کو پتا چلا کہ اس کے سبجیکٹس میں میٹھ بھی شامل رہا تھا، وہ میٹھس میں بہت اچھا تھا۔ انہوں نے درخواست کی تھی کہ انشراح کو میٹھس میں کچھ پراہلم درپیش ہے وہ اگر مدد کر دے گا تو مہربانی ہوگی۔ علی نے فوراً ”سے بیشتر ہائی بھری تھی کہ وہ ان کا بہت احسان مند تھا سوائے چند ایک باتوں کے اسے کسی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس نے می کو مہینہ مکمل ہونے پر مقررہ کرائے کی رقم سے پانچ ہزار اضافی دیے تھے جو کہ اس نے کہا تھا کہ اگر وہ کسی ہوٹل سے کھاتا تو یقیناً اس سے زیادہ ہی بل بھرتا، پھر وہ ایسے اچھا محسوس نہیں کرتا۔ تھوڑا متاثر ہونے کے بعد انہوں نے وہ رقم اس سے لے لی تھی۔ پھر اسی شام کتابیں سنبھالے انشراح اس کے پاس آگئی۔ می کو اس کے پیچھے آتا دیکھ کر وہ حیران ہی رہ گیا۔ ”وہ بیٹا برا مت باننا۔ تم میرے اپنے بچے ہو۔ ہر

گزر رہی ہے؟ میں تو جاننے کے باوجود چکر میں لگایا ہوں وہاں۔ ”پھر علی ان کو ممی اور انشرح کے عجیب و غریب تعلق کا بتا کر ان سے کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہو سکتا ہے ماموں کچھ ایسا بتائیں کہ جس سے ان کی ایسی شدت پسندی کا ماخذ پتہ چل سکے، ماما جی کے آنے سے ماموں نے بات بدل دی تھی شاید وہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے ان کے سامنے۔

تین بھر پور دن گھر گزار کر آتا تو جو بات اسے گنگ کر گئی۔ شام کو انشرح کا وہ معصوم سا اقرار تھا جسے سن کر دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا تھا۔

”سر بہت دن لگا دیئے آپ نے۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا۔ ہے ناں ممی۔“

انشرح کی کوئی بات اور ممی کے بغیر مکمل ہوتی، ممکن ہی کہاں تھا، ممی نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔ علی بھی کتاب کھولتے ہوئے مسکرا دیا۔

”اور بیٹا! گھر میں تو سب ٹھیک تھے ناں بھائی، بھابھی، بچے۔ زندگی نے مصروفیات ہی اتنی دی ہیں کہ بعض اوقات انسان چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بہت دل تھا میرا بھائی کے بچوں کی شادی میں شریک ہوتی، پر ان ہی دنوں پہلے انشرح کی بیماری نے ہاتھ پاؤں پھلادیے تھے پھر اس کے پیپرز شروع ہو گئے۔“

”آئی! انشرح کے نہ خیال دو خیال میں سے کوئی رشتہ دار آئی میں آپ اکیلی؟“ انشرح کو سوال کرنے کا کہہ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”سب سے بڑا سہارا اللہ کی ذات ہوتی ہے بچے! باقی سب تو ثانوی ہے۔ تعلق داریاں، رشتے سب کچھ۔ اس کے ابا کی وفات کے بعد اور کوئی رشتہ باقی ہی نہ رہا، پھر رہے میرے رشتہ دار تو جو کچھ انہوں نے میرے ساتھ کیا، اس کے بعد تو دعا کرتی ہوں کہ کبھی ان سے سامنا ہی نہ ہو سکے ہمارا۔“ طویل سانس لے کر انہوں نے مختصر سے الفاظ میں اپنی ساری داستان حیات کو سمیٹ دیا، جس کی بہر حال اسے کچھ خاص

سمجھ نہ آ سکی تھی۔ لیکن وہ چپ ضرور رہ گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ انشرح کی بھولی صورت کا جادو تھا یا اس کی معصومیت کہ دل نے آہستہ آہستہ اس کا اسیر ہونا شروع کر دیا۔ ایسا ہی حال دوسری طرف بھی تھا یقیناً جب ہی علی پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ گل رنگ ہو جاتا نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ ممی جتنا بھی اس کی زندگی کو اپنے طور گزارنے پر زور دیتیں، فطری تقاضوں پر بند باندھنے سے قاصر تھیں۔

ماموں نے بھی اس بار اس سے ذکر کیا تھا وہ اب اپنی اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں چونکہ اب وہ برسر روزگار بھی ہو گیا ہے تو اگر اس کی کوئی پسند ہے تو بتائے، نہیں تو وہ ماما کو اس مہم پر لگانے والے ہیں تب ہرگز بھی اس کی نگاہ میں ایسا کوئی نہیں تھا تاہم اس نے ماموں سے کچھ ماہ کی مہلت ضرور مانگ لی تھی۔

اب دل نے ہی پینتر بدل کر انشرح کی ہمراہی کے الاپ لانے شروع کر دیے تھے، پر گھر بسانے کے لیے بہت سی باتوں کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اسے سب سے پہلے تو ممی اور ان کی بیٹی کا کچھ دن قبل پیش کیا گیا سنہری قول یاد آیا تھا جو انہوں نے اس کے سامنے دہرایا تھا کہ وہ شادی نہیں کریں گی اپنی بیٹی کی اور بیٹی صاحبہ نے بھی تائید کی تھی۔ پھر کسی طرح ممی کو منا بھی لیتا تو انشرح سے شادی میں کئی قباحتیں تھیں، ممی نے انشرح کی تربیت ہرگز اس نہج پر نہیں کی تھی جس طرح عام لڑکیوں کی کی جاتی ہے۔ اس کو بتا نہیں تھا کہ کچن میں کام کس طرح ہوتا ہے۔ انڈا تک ابا نے سے

نابلد تھی وہ کلج جانے کے لیے کپڑے اسے ممی پر لیس کر کے دیتیں۔ ٹھیک ہے شادی کے بعد وہ ملازمہ بھی افورڈ کر سکتا تھا، پر شادی شدہ زندگی کو نبھانے کے لیے بے شمار تقاضے ہیں جن کو پورا کرنے کی ذمہ داری سو فیصد عورت پر عائد ہوتی ہے۔ جبکہ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو انشرح کی تربیت ایسی کی ہی نہیں گئی تھی کہ وہ گھر گرہستی کی ذمہ داریاں نبھا سکتی۔

دلغ سے سوچتا تو وہ انشرح کو فوراً سے بھرتا، کر دیتا کہ ایسی لڑکی جو ناشتا کھانا اپنی ماں کے ہاتھ سے کرتی ہو وہ کہاں ایک گھر کی ذمہ داری نبھاسکتی جبکہ اس کی موہنی صورت پر نظر پڑتے ہی دل دماغ کے سارے دلائل کو مسترد کر کے لہک لہک کر اس کی ہمراہی مانگتا۔

”ماموں میری شادی کرنا چاہتے ہیں بہت جلد۔“

آنٹی! کوئی لڑکی ہو نظر میں تو بتائیے گا۔“

ناشتے پر اس نے کن اکھیوں سے انشرح کو دیکھتے ہوئے مخاطب ممی کو کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ انشرح نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے بنی جانب دیکھتا پا کر حثٹ نکا ہیں جھکالی تھیں۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں چمکتی نمی اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ علی کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ ممی کا تاثر البتہ بیٹی سے یکسر جدا تھا انہوں نے خاصی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹا۔ لیکن ایسا ہے کہ میرا حلقہ احباب اتنا وسیع نہیں ہے نہ ہی اتنا ملنا جلنا ہے کسی سے ہم سے پہلے اور جو کرائے دار تھے ان کی بیٹی خاصی خوب صورت بھی تھی اور ان کو رشتہ کی تلاش بھی تھی۔ دیکھوں گی اگر فون پر ان سے رابطہ ہوا تو۔“

”اچھا۔ اچھا ٹھیک ہے آنٹی! ابھی آپ کسی سے کوئی بات مت کیجئے گا یہ تو میں نے ماموں کا ارادہ بتایا ہے نا۔ ابھی میں نے فی الحال ان سے کچھ ماہ کی مہلت طلب کی ہے۔ جاب میں تھوڑا مزید اسٹیبلیش ہو جاؤں پھر ہی دیکھوں گا۔“ وہ جلدی سے بولا تھا مبادا وہ اس کا رشتہ لے کر ہی نہ چل پڑیں دو تین دن کی سوچ بچار کے بعد آفس ہی کے ایک قابل اعتماد دوست کو اس نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا جو کبھی اس کا کلاس فیلو بھی رہا تھا اور بائے چانس جاب بھی دونوں کو ایک ہی آفس میں ملی تھی۔

”رقیب میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں پر ممی بھی رقیب کا کردار ادا کرتی ہیں یہ آج بتا چلا ہے تو ایسا کر ساجن سے پہلے ساجن کی ممی کو آرام کر اور مجھے تو

یہ لونی نہ بیاتی مسئلہ بھی لگتا ہے تیری، دے والی ساس کا وزنہ ما میں محبت بھی کرتی ہیں لاڈ بھی کرتی ہیں پر ایسی صورت حال پہلی دفعہ سنی ہے۔“ حسن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”یہ سب باتیں تو مجھے بھی پتا ہیں پر ان کا کوئی حل بھی تو ہو۔“ وہ بھنبھلا کر بولا۔

”اچھا تو ایسا کر۔“ حسن نے کچھ سوچا پھر دھیرے دھیرے اسے کچھ بتاتا چلا گیا۔ وہ بھی پر سوچ انداز میں سر کو اثبات میں ہلانے لگا۔



”پتا ہے انشرح! مجھے چاہئے بہت پسند ہے پر تب تو بہت اچھا لگے گا جب تم خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلاؤ“ آنٹی کو کیسے منانا ہے یہ تم پر چھوڑتا ہوں۔“ اس روز جب ممی ناشتا بنانے میں مصروف تھیں گھبرائی گھبرائی سی انشرح کو دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

”میں بنالوں گی سر۔ میں نے ممی کو بہت بار چاہئے بناتے ہوئے دیکھا ہے۔“ وہ جلدی سے بول اٹھی۔

”ممی آپ یہاں بیٹھیں۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“ انہوں نے جیسے ہی ناشتے کے لوازمات لا کر رکھنا شروع کیے انشرح اپنی کرسی چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔

”کیا چاہیے مجھے بتاؤ بیٹا!“ ممی بے چین ہو کر اس کے پیچھے چلی آئیں۔ علی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا جب اس نے سامنے موجود کچن میں انشرح کی آواز سنی۔

”ممی! آپ صرف پانچ منٹ کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ پلیز۔“ علی کی محبت نے اسے ممی سے

محبت کرنا بھی سکھا دیا تھا وہ آکر ممی کو علی کے مقابل بیٹھا کر چلی گئی۔

”آنٹی! آپ آرام سے ناشتا کریں انشرح ماشاء اللہ سمجھ دار ہے کالج کی اسٹوڈنٹ ہے آپ اسے ایک چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرنا چھوڑ دیں میوں اس میں

اعتماد آئے گا۔“ وہ بار بار ہاتھ ملتی، بے چینی سے چن کو دیکھتی مٹی کو نرمی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”وہ کتنی بھی بڑی ہو جائے میرے لیے بچی ہی رہے گی۔ میں دیکھ آؤں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کچھ بنانے ہی نہ لگ جائے اسے تو ہرگز تک آن کرنا نہیں آتا۔“

خود سے بولتی وہ اٹھی ہی تھیں کہ انشراح کی زوردار چیخ پر مٹی بے ساختہ زرد پڑ گئیں اور بے ساختہ کرسی کو تھام لیا۔ علی ہی فوراً ”اٹھ کر چن میں گیا تھا اس کے پیچھے مٹی بھی آگئی تھیں۔ انشراح اپنے بے تحاشا سرخ ہوتے ہاتھ کو تھامے جلن سے دوہری ہوئی جا رہی تھی، آنسو قطار در قطار اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔

بروز بھی جل گیا تھا، چائے بھی اس نے بنا ہی لی تھی۔ پہلے کبھی بنائی نہیں تھی، بار بار مٹی کو بنا تا تو دیکھ چکی تھی۔ چائے بن جانے کی خوشی میں اسے دھیان نہیں رہا تھا کہ ابلتی چائے والے گرم برتن کو وہ بغیر کسی کپڑے کے پکڑ رہی ہے، نتیجتاً ”ہاتھ تو جلا سو جلا تھا“ گرم چائے نیچے گر کر پاؤں بھی جھلسا گئی تھی۔

انشراح سے زیادہ مٹی کی حالت خراب تھی، جیسے اس کی تکلیف وہ اپنے وجود پر محسوس کر رہی ہوں۔ علی ہی انشراح کو بایک پر بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ مرہم پٹی کرواتا تھی۔ مٹی اس دوران مصلیٰ بچھائے وظائف میں مصروف رہی تھیں۔

”کیوں تم چن میں گئیں انٹی۔؟ مجھ سے کہہ دیتیں بیٹا۔ میں کس لیے ہوں۔ دیکھا اب کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ گیا تمہیں میری جان۔“ وہ بار بار اس کا ماتھا چومتیں۔ اس کے ہاتھ پکڑ لیتیں، علی کو چونکہ آفس کے لیے در ہو گئی تھی، سو وہ آئی کو کچھ کریمیں اور دوا میں جو ڈاکٹر نے دی تھیں، پکڑا کر بھاگم بھاگ آفس کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

”دیکھو انشراح۔ آئی تم سے بہت محبت کرتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اپنی محبت کی شدت میں انہوں نے بہت سی باتیں بہت سی چیزیں نظر انداز کر دی ہیں، دیے تو سر رٹنے پر ہر کوئی ذمہ داری سنبھال

ہی لیتا ہے خصوصاً لڑکیاں، مین لڑکیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری میں بھی ماہر ہونا چاہیے۔ پتا ہے میری مائی جی جنہوں نے ایک ماں کی طرح ہی میری پرورش کی ہے، اپنے بیٹوں کے ساتھ مجھے بھی بتاتی تھیں کہ انسان کو کبھی کسی کام کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنا تو بہت سی مشکلات سے بچا لیتا ہے انسان کو۔ ہم میں سے کوئی محنت بھی کرنا کہ ہم لڑکے ہیں تو ہم کیوں کوئی کام کریں مثلاً ”کبھی اکیلی ہونے کی بنا پر وہ ہم سے چن کے یا گھر کے دیگر کسی کام کے لیے کہتیں تو پتا ہے ان کا جواب کیا ہوتا۔ ہمارے نبی پاک آقائے دو جہاں جو اگر حکم کرتے تو کس کی مجال تھی جو ان کا حکم ٹال سکتی پر اپنے بہت سے کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر لیے۔

پاکستان میں تو مرد اس بات کو عیب سمجھتے ہیں، پر بہت سے دوسرے ممالک ترقی یافتہ کی صف میں اس لیے بھی شامل ہیں کہ ہر انسان اپنا کام خود کرنے کا عادی ہے، پھر یوں ہوا کہ تعلیم کی مصروفیات کے باوجود ہم تینوں مائی جی کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتے۔ کام بھی جلدی ہو جاتا اور ہم ان کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے۔ میری مائی جی کی جب شادی ہوئی وہ تیرہ سال کی تھیں، تم سے بھی سات سال چھوٹی، پر انہوں نے بہت چھوٹی سی عمر میں ایک بھرے پرے سسرال کی ذمہ داری بہت جلد سنبھال لی جس میں بیمار اور معذور سسر کی دیکھ بھال جیسی خدمت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ اپنے گھر میں بھی عادی تھیں اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنا۔ چن کے کام میں اپنی امی کا ہاتھ بٹانا، چھوٹے بہن بھائیوں کے ڈھیروں کام اور ذمہ داریاں سنبھالنے کا جو ہنرا انہوں نے اپنے گھر میں سیکھا تھا، وہ ہنران کی سسرال میں کام آیا اور آج بھی میری

مائی جی کا نام بہت عزت سے ان کی سسرال میں لیا جاتا ہے۔ میری مائی جی میرا آئیڈیل ہیں بہت سے حوالوں سے ان کا ایک سنہری قول تمہیں بتاؤں کہ وہ

کہتی ہیں گھر داری تو ایک عورت کا وہ گناہ ہے جس کے بغیر وہ بالکل ادھوری ہے۔ تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہر کام، ہر بات میں اپنی ممی کی طرف دیکھنا چھوڑ دو اور خود میں اعتماد پیدا کرو۔ ان سے کام کروانے کے بجائے ان کی مدد کرو۔“

بہت سی باتیں اور بہت سے اقوال اس دن اسپتال سے واپسی پر اس نے انشراح کو بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن سے ذرہ برابر بھی اس کی شخصیت میں تبدیلی آسکتی اور مزے کی بات یہ بھی کہ انشراح نے انتہائی توجہ سے ان تمام باتوں کو سن کر دل میں اتارا تھا اور اس کا ان پر عمل کرنے کا ارادہ بھی تھا۔ علی نے بتایا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور جلد ہی مامی جی اور ماموں اس کا رشتہ لے کر ممی جی کے پاس آئیں گے پھر مامی کی پسندیدہ ہو بننے کے لیے اسے اپنے اندر وہ خوبیاں پیدا کرنی ہوں گی جو ایک مشرقی لڑکی کا حسن ہیں اور انشراح کے چہرے کے کھلتے رنگ اسے یہ بتا گئے تھے کہ منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔

پھر اس نے یہ سارا احوال جا کر حسن کو بتایا تھا۔

”واہ میرے شہزادے! میں نے تو تجھے ممی کو سمجھانے کے لیے کچھ ٹریکس بتائے تھے تو ڈائریکٹ لڑکی کی تربیت پر آگیا بلکہ مشن امپاسیبل کو پاسیبل بنانے کے سلسلے میں پہلا کامیاب قدم بھی اٹھالیا۔“ حسن نے جس انداز میں کہا تھا۔ علی ہنس دیا تھا۔

جبکہ اس سے پہلے وہ دل ہی دل میں خود کو بہت ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے انشراح کو چائے بنانے کو بھیجا کہ اسے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ یقیناً یہ تکلیف اسے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی، لیکن حسن کے مخصوص تسلی دینے والے انداز نے اسے خاصا مطمئن کر دیا تھا۔ تین چار دن تو انشراح کے زخم مندمل ہونے میں لگ گئے، اس دوران وہ ممی کی سخت قسم کی نگرانی میں رہی تھی اور یہ چار دن وہ پڑھنے بھی

نہیں آئی۔ بس ناشتے یا رات کے کھانے پر ہی اسے دیکھ کر تسلی کر لیا کرتا تھا۔

پر اس واقعے کے چھ دن انشراح نے اپنے کپڑے خود پر لیس کرنے کی کوشش کر کے یقیناً ”ممی کے غضب کو آواز دی تھی“ ہوا کچھ یوں تھا کہ اس بار اس نے ہاتھ تو نہیں جلایا تھا پر شرٹ کو جلا کر اس کا ستیاناس ضرور کر دیا تھا۔ اصل شرمندگی اسے علی کے سامنے ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں ہر کام مجھ سے غلط کیوں ہو رہا ہے۔“ وہ یہ سوچ کر ہونٹ چبا رہی تھی جبکہ ممی اسے اڑے ہاتھوں لے رہی تھیں۔

”میں کہتی ہوں کیا ضرورت ہے انشراح! تمہیں ہر کام میں دخل اندازی کرنے کی۔ کیوں کر رہی ہو ایسا بچے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ کہتے کہتے انہوں نے شدید سے ناشتے میں مصروف علی پر بھی ایک مشکوک نظر ڈالی تھی۔

”تمہارے ہاتھ اور پاؤں کا زخم ابھی ہرا ہے اور تم نے استری فل پر کر کے کپڑے پر رکھ دی۔ میرا تو یہ سوچ کر جی ہول رہا ہے کہ اگر وہ گرم استری تمہارے ہاتھ کو لگ جاتی۔ اف میرے خدا! بس میں کہہ رہی ہوں آئندہ میں ایسی کوئی حماقت کرتے ہوئے تمہیں نہ دیکھوں۔ یہ ناشتا کرو اور آج بھی کلج جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھی ہے اپنی شکل کیسے زرد ہو رہی ہے۔ تم بس اپنی پرہیزی پر توجہ دو۔ بانی ہر کام کے لیے تمہاری ماں موجود ہے بیٹا۔“ انہوں نے پہلے ذرا ترشی اور بعد میں بے بسی سے کہا۔

”کچھ نہیں ہوتا ممی۔ کام کرنے سے ہی آتا ہے نا۔ جب تک میں کام کروں گی نہیں تو مجھے کام کیسے آئے گا۔ سچ ممی جب کلج میں لڑکیاں باتیں کرتی ہیں اپنے گھر کے روزمرہ کے احوال بتاتی ہیں تو میں یہ جان کر حیران رہ جاتی ہوں کہ اسٹڈیز کے باوجود تقریباً لڑکیاں کون سا ایسا کام ہے جو کرنا نہیں جانتیں اور پھر اس وقت شرمندہ بھی ہو جاتی ہوں جب وہ حیرانی کا اظہار کرتی ہیں کہ مجھے کچھ بھی کرنا نہیں آتا۔“

پتا ہے لاسٹ منتھ دن ڈش پارٹی میں سب نے ہی

طے کیا کہ ہر لڑکی اپنے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بنا کے لے آئے گی۔ پتا ہے میں نے اس دن چھٹی کیوں کی۔ کیوں کہ مجھے کچھ بنانا ہی نہیں آتا تھا۔ ”وہ منہ لٹکا کر بولی تھی۔ پہلے تو مئی حیران ہو کر اسے دیکھتی رہیں کہ ان کی انشراح اتنا بھی بول سکتی ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ پھر اچانک ہی بول اٹھی تھیں۔

”تو مجھے بتائیں بیٹا! چھٹی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی میری جان! میں آپ کو آپ کی پسند کی کوئی ڈش بنا دیتی۔“ وہ بے حد ہمارے بولیں۔

”کوئی بات نہیں آنٹی۔ یہ نارمل سی خواہشات ہیں جن کا اظہار انشراح کر رہی ہے۔ ہلکے پھلکے کام جو یہ کرنا چاہ رہی ہے وہ کرنے دیا کریں آپ اسے۔ آپ کی ہیلپ بھی ہو جائے گی اور انشراح کو کام کرنا بھی آجائے گا۔“ علی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا تو بول اٹھا۔ مئی کو اگرچہ اس کی بات سے بہت اختلاف تھا پھر بھی کچھ سوچ کر چپ رہ گئیں۔

”کل میری ماموں اور مائی جی سے فون پر بات ہوئی تھی۔ بہت سلام کہہ رہے تھے آپ کو اور جلد ہی آنے اور آپ سے ملنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔ جواباً اس نے انشراح کا سرخ پڑتا چہرہ بھی محسوس کر لیا تھا۔

”ہاں ہاں بیٹا کیوں نہیں ضرور تشریف لائیں ان کا اپنا گھر ہے۔“ مئی نے بھی جواباً ”خوش دلی کا مظاہرہ کیا کہ ماموں اور مائی جی کی آمد کا مقصد شاید سمجھی نہیں تھیں۔“

”انشراح! آپ اپنے کمرے میں جا کر پڑھو بیٹا۔ کل کلج بھی جانا ہے۔“ وہ رات کے کھانے کے بعد فارغ بیٹھے تھے جب مئی نے انشراح کو بہانے سے اٹھا دیا تھا۔ ”بیٹا آپ میرے بچوں کی طرح ہیں تو اس لیے آپ سے ایک مسئلہ ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔“ چند ہی لمحوں بعد جب انشراح اپنے کمرے میں جا چکی تو مئی نے بے حد جھجک کر کہا۔

”جی جی آنٹی۔ آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔“

فرمائیے کیا بات ہے؟“ وہ ہم تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔

”میں اس گھر میں بہت عرصے سے ہوں۔ شروع سے ہی اوپر والے پورشن میں جو لوگ رہائش پذیر تھے یقیناً انو تو رشتہ داروں سے بڑھ کر ساتھ دیا انہوں نے میرا۔ بزرگ تھے جو اس گھر کے انہوں نے مجھے بیٹی کہا ہی نہیں سمجھا بھی انشراح تو ان کو بتا سکتی تھی اور سمجھتی تھی جب تک وہ رہے مجھے کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوا۔ بجلی، فون، گیس کے بل سے لے کر پمپر تک کو بلانے کا کام وہی کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دکانوں کا کرایہ بھی ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو لا کر میری ہتھیلی پر دھر دیتے۔ پھر مہینہ کا سودا سلف جب اپنے گھر کا لینے جاتے مجھ سے بھی لسٹ لے جاتے۔ طویل عرصہ ایسے ہی گزرا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ باہر کی دنیا کے کیا مسائل ہوتے ہیں۔ یا کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے پھر آپ کے آنے سے دو ماہ پہلے ہی ان کا جو بیٹا بیرون ملک رہائش پذیر تھا اس نے اپنے گھر والوں کو بھی اپنے پاس ہی بلوا بھیجا وہ صاحب اپنی بیٹی کو لے کر بیٹے کے پاس چلے گئے۔ وہ اللہ بھلا کرے بھائی صاحب کا کہ تمہیں انہوں نے میرے پاس بھیجا تو اس بات کا یقین آگیا کہ میرا اللہ کسی بھی انسان کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔“

علی اس دوران منتظر نظروں سے ان کو دیکھتا رہا کہ اس سارے قصے میں براہ کرم کہاں تھی یہ سب تو ماموں اسے مختصراً بتا چکے تھے۔

”مہینے کا سودا سلف تو بیٹا میں کسی نہ کسی طرح لے ہی آتی ہوں۔ باقی چھوٹے چھوٹے مسائل تو زندگی کا حصہ ہیں لیکن کیا ہے کہ تینوں دکانوں کے دکاندار کرایہ دینے میں پس و پیش کر رہے ہیں میں تین بار پہلے بھی جا چکی ہوں ان کے پاس اور دو بار ملازمہ جو صفائی کے لیے آتی ہے اسے بھی بھیج چکی ہوں ہر بار کہ چکر پر ایک نئی تاریخ دے دیتے ہیں۔ شاید پتا چل گیا ہے ان کو کہ کسی مرد کا آسرا نہیں رہا اب بے سہارا عورت ہوں اس لیے۔“ ان کی آواز بھرا گئی

بہترین ڈائجسٹ 154 مئی 2015

تھی۔

نے صرف کہا ہی نہیں مئی کے ہاتھ میں پکڑا سلاکس ہاتھ میں لے کر کھانا بھی شروع کر دیا۔

”انشی کیا ہو گیا ہے بیٹا! میں اگر آپ کو کھلاتی ہوں تو اس میں خوشی محسوس کرتی ہوں ایسے سمجھ لو میری مامتا کی تسکین ہوتی ہے اس سے۔“

وہ چند لحظہ اسے دیکھتے رہنے کے بعد گویا ہوئیں۔ علی کو اگرچہ اس پل مئی کے چہرے کی بے بسی دیکھ کر ترس ضرور آیا تھا پر اس پل ان سے ہمدردی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔

”اچھا آنٹی اب میں چلتا ہوں۔“ ان ماں بیٹی کے بیچ دخل دیے بغیر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا کیوں کہ وہ محسوس کرتا تھا بہت سی باتیں جو وہ دونوں ایک دوسرے سے کرنا چاہتی تھیں، محض اس کی وجہ خاموشی اختیار کر جایا کرتی تھیں۔

”اور ہاں مئی! آپ بے شک مجھے کلج و سن تک چھوڑنے ضرور آیا کریں، لیکن ڈرائیور انکل اور لڑکیوں سے بحث مت کیا کریں کہ انشراح کو یہاں بٹھاؤ وہاں بٹھاؤ۔ گاڑی آہستہ چلانا۔ اس وقت تو سب چپ رہتے ہیں بعد میں ان ہی باتوں کی وجہ سے میرا مذاق بنتا ہے۔“ جاتے جاتے جو کچھ علی کے کانوں میں پڑا تھا۔ اس نے اسے خاصا سکون دیا تھا کہ انشراح کی سوچ میں تبدیلی آنے کی دیر تھی کہ اسے اب بات کرنا اور پوری کروانا آتا جا رہا تھا۔ بس تھوڑے دن اور لگنے تھے پھر اس کی منزل دور نہیں تھی۔ لگتا ہے جلد ہی ماموں سے بات کرنی پڑے گی۔

پھر ایک دن جب کچھ ضروری چیزیں لینے کے لیے آنٹی علی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں۔ انشراح نے نہ صرف مئی کے اور اپنے کپڑے دھوئے تھے بلکہ وال چاول بھی بنا لیے۔ مئی تو لگتا تھا بے ہوش ہونے کو تھیں۔

”ست۔ تم کیوں گئیں کچن میں انشی! اگر کچھ ہو جاتا۔“

”ارے مئی! میری خوشی کو ضائع مت کریں پلیز اور

علی تو جیسے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ تو کرایہ ادا کر کے خود کو ہر ذمہ داری سے بری الذمہ سمجھتا تھا، یہ جانے بغیر کہ بظاہر زندہ دل اور خوش باش نظر آتی آنٹی کو کتنے مسائل درپیش تھے۔ وہ بے حد شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جتنا وہ اس کا خیال کرتی تھی اس لحاظ سے گھر کا واحد مرد وہی تھا اسے خود ہی ان ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے تھا۔

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں آنٹی۔ خود ہی کہہ رہی ہیں آپ کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیا کرتا ہے۔ مجھے تو خود پر افسوس ہو رہا ہے کہ ایسی تمام نراکتوں کا مجھے خیال کیوں نہیں آیا، آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں اور آئندہ کرایہ کا مسئلہ ہو، پلمبر کا یا بل کی ادائیگی، آپ کو کسی بھی کام کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صرف ان دکانداروں کے نام مجھے بتادیں میں آگے میں جانوں اور میرا کام۔“

جس مضبوط لہجے میں اس نے کہا تھا اس سے مئی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کے بیشتر مسائل تو حل ہو جائیں گے کہ اللہ ایک در کے بند ہونے سے سودر اور کھول بھی دیتا ہے۔ کئی دنوں کی طاری پریشانی کو انہوں نے خود سے دور ہوتا محسوس کیا اور مطمئن ہو کر اٹھ گئیں۔ علی بھی اٹھ کر اپنے پورشن میں آگیا تھا۔ محض مین دن ہی لگے تھے اسے ان تمام مسائل کو حل کرنے میں بہن کے لیے مئی بے حد پریشان تھیں۔

پھر ایک دن علی تو علی، مئی بھی حیران رہ گئیں جب انشراح نے ان کے ہاتھ سے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

”پلیز مئی! مجھے بہت شرم آتی ہے آپ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے۔ میں بچی تو نہیں ہوں نا۔ ابھی آپ کو سارا ناشتا خود کر کے دکھاتی ہوں۔“ اس

کچھ کرتا میں کہ کیسا بنا سے کھانا پتا ہے میں یہ ترکیب ایک لڑکی سے کچھ دن پہلے ہی نوٹ کر کے لائی تھی موقع کے انتظار میں تھی آج آپ کے جاتے ہی میں نے وہ کاغذ اٹھایا اور پچن میں آگئی سب کچھ بہت ہی آسان تھا پر ایک دو دفعہ قاطرہ کو فون کرنا پڑ گیا اور سب ٹھیک ہو گیا۔ آپ کے پکائے سے کم اچھے لگ رہے ہیں چاول، لیکن پہلی دفعہ بنایا ہے تو ایسا ہی بننا تھا اگلی بار آپ دیکھیے گا۔ وہ خوشی خوشی ان کو پکڑ کر ٹیبل تک لے آئی۔

”پر بھائی میں تو بہت اچھی ہے انشراح آئی! اگر گھر داری میں بھی اچھا ہونا چاہتی ہے تو آپ اسے مت ٹوکیں، بلکہ جب بھی کوئی کام کریں اس کے سامنے کریں اور اگر وہ کوئی کام کرے تو ایسا رویہ اختیار کرنے کے بجائے اس کی تعریف کریں۔“ مٹی وال چاول کھاتے بار بار انشراح کو دیکھتیں جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو کہ یہ سب اس نے کیا ہے، تاہم علی کی اس بات کے جواب میں وہ کچھ بولیں نہیں بس پھیکا سا مسکرا دی تھیں۔

”کیا میں مامی کو بتا دوں کہ ان کی ہونے والی ہو ایک سکھ لڑکی بننے کی تیاری کر رہی ہے۔“ ایک دن موقع ملے ہی اس نے دھیرے سے کہا تو وہ مسکرا کر سر جھکا گئی۔

پھر یوں ہوا کہ مٹی نے اسے نوکنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کر کے اتنی خوش دکھائی دیتی کہ انہیں اسے نوکنا مناسب نہ لگتا ہاں کچھ حد بندیاں ضرور لگائی تھیں انہوں نے کہ وہ صرف شام کی چائے بنائے گی، چھٹی والے دن کھانا بنانے میں ان کی مدد کروائے گی اور ایک احسان یہ بھی کیا تھا کہ اپنے کپڑے خود استری کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

پھر ایک دن موسم بدلتے ہی مٹی کو فلو اور زکام نے ایسا جکڑا کہ وہ شدید بخار کی زد میں آ گئیں۔ نقاہت حد سے سوا تھی۔ انشراح کے ہاتھ پر پھول گئے تھے وہ علی کے ساتھ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ ان کی

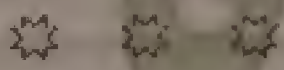
دوائی 'ناشتا' کھانا سب وہ خود بنا رہی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ علی پچن کے کاموں میں اس کی مدد کرا دیا کرتا تھا کہ بہت کچھ سیکھ جانے کے باوجود ابھی بہت سے کاموں میں نا بلد تھی وہ کلج سے بھی اس نے تین دن کی چھٹیاں لی تھیں اس دن جب مٹی کو بخار تو نہیں تھا، البتہ کمزوری وہ محسوس کر رہی تھیں۔ خود ہی آہستہ آہستہ چلتی ٹیبل تک آگئی تھیں۔

”ارے مٹی آپ۔ اپنے کمرے میں لیٹیں نا۔ میں کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو لاتا ہوں۔“ اپنی جھونک میں پچن سے نکلتی انشراح لپک کر ان کے پاس آئی۔

”بس بیٹا! لیٹ لیٹ کر برا حال ہو گیا میرا تو۔ یہیں بیٹھتی ہوں۔ علی کہاں ہے آج نیچے نہیں آیا؟ ناشتا نہیں کرنا اسے۔“ اتنا سا بولنے میں سانس پھول گیا ان کا۔

”لیجیے جناب آئی جی! آپ نے علی کو یاد کیا اور علی حاضر ہے یہ بتائے طبیعت کیسی ہے آپ کی۔“

وہ کرسی کھینٹ کر بیٹھتا ان کی طبیعت دریافت کرنے لگا، جبکہ دونوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر انشراح ایک بار پھر پچن کی طرف بڑھ گئی پھر مٹی نے دیکھا کہ اس نے ان ہی کے انداز میں ناشتا بنایا اور ان دونوں کو سرو کیا تھا۔ پر اس بار انہیں اس پر غصہ نہیں، پیار آیا تھا۔



اسی شام جب علی واپس لوٹا تو ماموں جی اور مامی جی کی اچانک آمد اسے خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ لپک کر ان سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ رات کو ماموں نے بڑے بھاد سے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا تو مٹی جو ابھی تک خوش باش بیٹھی ان کے ساتھ بول نہیں رہی تھیں، ایک دم چپ کر گئیں۔ انشراح چائے بنانے میں مصروف تھی جبکہ علی ماموں کے اشارے پر ابھی اٹھ کر اوپر گیا تھا۔

”دیکھیے بھائی صاحب۔ یقین مانیں تو کچھ دنوں پہلے تک میرا انشراح کی شادی عمر بھر کرنے کا کوئی ارادہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نہیں تھا کہ ساری عمر اپنی بیٹی کی حفاظت اور خدمت میں گزار دوں گی پر اسے شادی جیسے برنخ میں نہیں دھکیلوں گی کہ میں نے اپنی بچی کو بہت لاڈلوں سے زمانے کے گرم و سرد سے چھپا کر جیسے پالا ہے یا تو میں خود جانتی ہوں یا میرا خدا۔ پر اپنی اچانک بیماری پر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ اگرچہ معمولی سا بخار ہی تھا پر سوچ گو بد لئے کا محرک تو ایک نقطہ بھی بن سکتا ہے۔ رات اچانک ایک سوچ میرے ذہن میں در آئی کہ جس نے بقیہ کی ساری رات مجھے سونے نہیں دیا اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری بچی کا کیا ہو گا۔ کہاں جائے گی، کوئی سہارا تو ہو جینے کے لیے پھر مجھے اس کی شادی کا خیال آیا، جس نے اگرچہ کچھ دیر کے لیے میری سانسوں کو روک دیا۔ ہو سکتا ہے ہر ماں کی ایسی حالت نہ ہوتی ہو۔ ”مائی جی کے چہرے پر حیرت انگیز تاثرات دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”ہر والدین خصوصاً ”مائیں اپنی اولاد سے ایسی ہی محبت کرتی ہیں، لیکن ایک فرض ہے، ذمہ داری ہے پھر سب سے بڑھ کر حکم اللہ و رسول بھی تو ہے۔ بیٹیاں تو انبیاء کی بھی گھر نہیں بیٹھیں، پھر ہم جیسے ادنیٰ لوگ تو ان کے پیروں کی خاک بھی نہیں۔ بلکہ کچھ کام تو ایسے ہم پر فرض کر دیے گئے ہیں، جن میں تاخیر بھی گناہ کا باعث بنتی ہے، جن میں سے ایک حکم جوان ہونے کے بعد لڑکی کی شادی کر دینے کا ہے۔“ ماموں جی آہستہ آہستہ بولتے چلے گئے۔ ”مئی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن انشراح کو چائے لا تا دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

”شکریہ بیٹا! ایسا کرو۔ علی کو دیکھو کہاں ہے اسے بھی چائے دے دو۔“ مئی کے کہنے پر وہ اثبات میں سر ہلاتی واپس مڑ گئی تھی۔

”بویے بہن آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“ مائی جی سے مزید صبر نہ ہو سکا تو مئی کو چپ دیکھ کر واپس اسی موضوع کی طرف لائیں کہ لاڈلے بیٹے کا آرڈر تھا کہ مئی کو قائل کر کے ہر صورت رشتہ یہیں جوڑا جائے۔

”آپ نے جو کچھ کہا سب ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ میں بھی اپنی بچی کو محفوظ ہاتھوں میں دے کر

رنا چاہوں گی پر اس کے لیے میری ایک شرط ہے کہ علی کو گھر و اماں بننا پڑے گا۔“ اپنی بات کہہ کر وہ اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگیں۔

”لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ پہلے تو ایسا ممکن ہی نہیں ہے پھر اگر ہم ماں بھی جائیں تو علی کبھی بھی نہیں مانے گا۔“ مائی نے کچھ تیز لہجے میں کہا کہ ان کی باتیں انہیں اگر عجیب لگی تھیں تو شرط اس سے بھی عجیب تر تھی، تاہم ماموں جی نے آنکھ کے اشارے سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے بہن کہ شادی ہو جانے کے بعد آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیں۔ رشتے میں آپ میری بہن تو ہیں ہی، انشراح کی طرف سے جن خدشات کا آپ کو اندیشہ ہے، بیٹی کو سامنے دیکھ کر وہ بھی نہیں رہیں گے۔“ ماموں کے رساں سے کہنے پر مائی جی کے منہ کے زاویے بہر حال بگڑ گئے تھے کہ رشتے کی بھلے بہن تھیں، تھیں تو عورت نا اور حقیقی بہن بھی نہیں تھیں، وہ تو شکر ہوا کہ مئی جی نے یہ تجویز ماننے سے کھٹ انکار کر دیا تو مائی جی نے سکون کی سانس لی تھی۔

”نہیں بھائی صاحب ایسا ہرگز ممکن نہ نہیں ہے۔ آپ میرے انکار کو ہرگز بھی دل پر مست نہ جیجیے گا، اسے میری بیٹی سے محبت کی شدت جانیں یا خود غرضی میں اپنی بیٹی کو اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکتی، نہ ہی یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاسکتی ہوں۔“ مئی نے معذرتی لہجے میں کہا تو ان کی مجبوری جان کر ماموں چپ ہو گئے، البتہ مائی ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں، جیسے بمشکل خود کو بولنے سے باز رکھا ہو۔ کیوں کہ انشراح انہیں بے حد پسند آتی تھی پھر علی کا اصرار بھی تھا۔

”ٹھیک ہے بہن ہم سوچ کر علی سے مشورہ کر کے آپ کو بتا دیں گے۔“ تھوڑے سے توقف کے بعد ماموں نے معاملہ فہمی سے کہا کہ وہ اس بارے میں کچھ سوچنا چاہتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں علی کے پاس اوپر آگئے تھے، حسب توقع ان کی بات سن کر علی ہتھ سے

اکھڑ گیا۔
”یہ کیسی فضول قسم کی فرمائش ہے۔“ اف یہ
مئی۔ ”وہ ہاتھ پر مکامار کر بیڑیا۔
”گھر داماد میں بننا نہیں چاہتا اور انشراح سے دستبردار
ہونا بھی ناممکن ہے میرے لیے بتائیے نامی جی میں کیا
کروں۔“ بے بسی سے کتا وہ مای جی کے مقابل آکر
بیٹھا۔

”چی تو ہمیں بھی بہت پسند آئی ہے بیٹا، لیکن اس
کی مئی صاحبہ کی نامعقول قسم کی فرمائش کا کیا کریں۔“
”میری بات سنو علی! گھر تو تمہیں بسانا ہی ہے۔
بیوی کو بھی وہیں رکھتے جہاں تم رہتے ہو، مطلب جہاں
تمہاری جاب ہے، ایسی صورت میں ایک بے ضرر
عورت کے ساتھ رہنے میں کیسی قیاحت۔ ہاں کچھ
شرائط تم اپنی منوالینا۔ اوپر والے پورشن کا کرایہ تو دیتے
ہی ہو اب باقی کے اخراجات کا خرچ بھی تم خود اٹھانا کہ
نہ تو تم خود کو ان کے زیر دست محسوس کرو نہ وہ کسی قسم
کی احساس برتری کا شکار ہوں۔ باقی کچھ تم لوگ چکر
لگالیا کرنا کبھی ہم لوگ لگالیا کریں گے۔ پھر اگر اپنے شہر
واپس گھر آنے کا ارادہ ہے۔ تو اس سلسلے میں آہستہ
آہستہ تمہیں اپنی بیوی کو رام کرنا پڑے گا وہ مان گئی تو
اس کے لیے اپنی ماں کو منانا مشکل نہیں ہو گا کیوں کہ
وہ اپنی بیٹی سے بے تحاشا محبت کرتی ہیں۔

میرے پاس تو یہی حل ہے اگر یہ منظور ہے تو بتا دو
ہم ابھی جائے انشراح کو انگوٹھی پہنا کے شادی کی تاریخ
لے لیتے ہیں، ویسے بھی اگلے ہفتے اس کے امتحان
ہونے والے ہیں، امتحانوں کے بعد شادی رکھ لیں
گے۔“ ماموں جی نے نہ صرف حل پیش کیا بلکہ پورا
پروگرام بھی سامنے رکھ دیا۔

”پر میں ایسے نہیں چاہتا ماموں۔ یا میں ایسے
کرنا ہوں کوئی مکان کرائے پر دیکھتا ہوں پھر مئی کو بھی
ساتھ لے جائیں گے۔“ وہ اچانک پر جوش ہوا۔

”بات تو پھر بھی وہیں کی وہیں ہے وہ اپنا کھرچھوڑنے
کو تیار نہیں ہیں نہ ہی کہیں جانے کو تیار ہیں، یہ آپشن
میں پہلے ہی ان کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ ویسے اگر

دیکھا جائے اپنے حساب سے وہ کی ٹھیک ہی ہیں۔
ایک ہی بیٹی ہے اس کو کہیں بھیج کر وہ خود کیسے اگلی رہ
سکتی ہیں اور کہیں اور جا کر رہنا ان کی انا گوارا نہیں
کرے گی خصوصاً وہ بھی ایسی خوددار عورت کے لیے
جس نے ساری زندگی اپنے بل بوتے پر کسی کی مدد کے
بغیر اپنی بچی کو پالا ہو۔“

”اور۔ اور میری انا؟ وہ کچھ نہیں آپ کی نظر
میں۔“ ماموں کی بات کے جواب میں وہ ناراضگی سے
انہیں دیکھ کر بولا۔ ماموں نے اب ایک طرف خاموش
بیٹھی مای جی کو اشارہ کیا کہ وہ بھی کچھ بولیں۔

”دیکھو علی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ہر
انسان کو ہر چیز حسب منشا نہیں ملتی، یہاں لڑکی تمہیں
بھی پسند ہے، ہمیں بھی۔ تم ان کی ایک شرط مان کر
اس گھر میں زندگی تو لازمی نہیں ان کی مرضی سے
گزارو۔ اب اپنی بھابیوں کو دیکھ لو۔ بیمار باپ ہے
دونوں کا پندرہ دن وہ جا کر گزارتی ہے باپ کے گھر تو
دوسری پندرہ دن ہمارے پاس رہتی ہے پھر جب پہلی
واپس آتی ہے تو دوسری چلی جاتی ہے۔ انسان کے
ساتھ جڑے رشتے قربانیاں بھی مانگتے ہیں۔ آگے
زندگی تمہاری اپنی ہے، فیصلہ بھی تم نے کرنا ہے۔ اگر
دل مطمئن ہو تو جیسا چاہو گے، ہمیں خوشی ہوگی۔ خوب
اچھی طرح سے سوچ بچار کر لو پھر اپنے فیصلے سے ہمیں
آگاہ کرو۔“ ماموں اور مای جی تو اپنی کہہ اور سن کر
سو گئے تھے۔

وہ ساری رات سوچتا رہا تھا پھر فیصلہ انشراح کے حق
میں ہی کیا تھا اس کے دل نے۔ اگرچہ دماغ درمیان
میں آکر اپنے دلائل کے ساتھ کچھ نہ کچھ کتا رہا تھا،
لیکن جہاں بات محبت کی آجائے وہاں دل دماغ کو پچھاڑ
کر ایک دم آگے آ جاتا ہے۔

صبح ہی صبح واپسی کے لیے روانہ ہونے والے
ماموں اور مای جی شام کو ہی واپس جاسکے تھے کہ اس کا
فیصلہ سن کر انہوں نے مئی کو اپنی ہاں کا عندیہ دے کر
انشراح کو انگوٹھی پہنائی تھی اور اس کے امتحانات کے
بعد شادی کی تاریخ رکھنے کا کہہ کر لوٹ گئے تھے پھر یہ

دن کیسے پر لگا کر اڑ گئے ان دونوں کو پتا ہی نہ چل سکا۔
تاہم علی نے کچھ باتیں اپنی ضرورت سے منوالی
تھیں۔



انشراح کے پیپر ز بھی ہو گئے اور شادی کا دن آن
پہنچا۔ ماموں کی ساری فیملی پہنچ چکی تھی نکاح کے
وقت انشراح کی ہلکی سی سسکی پر ممی کی دھاڑیں نکلیں
پھر وہ بے ہوش بھی ہو گئیں اور تب سے لے کر ایک
دن میں یہ تیسری بار کی بے ہوشی تھی جو ممی پر طاری
ہوئی تھی شادی کے پہلے ہی دن علی کو اپنے بال نوچنے
پر مجبور کر دیا تھا۔ ولیم کے بعد ماموں اور ان کا
خاندان لوٹ گئے تھے بلکہ ان لوگوں کو بھی آنے کی
دعوت دے کر گئے تھے۔

علی نے نوٹ کیا تھا کہ شادی کی بات طے ہونے
کے بعد ممی نے انشراح سے پہلے والا برتاؤ ایک بار پھر
شروع کر دیا تھا۔ اوہ ناٹ اکیں۔ وہ بھنا گیا۔ کہ
شادی کی مصروفیات میں وہ اس سب کو نظر انداز کر گیا
تھا۔

”ممی!“ اس نے ناشتا بناتی ممی کو ہاتھ سے تھاما اور
لا کر کرسی پر بٹھا دیا۔

”انشراح! کہاں ہو بھئی“ کتنی غلط بات ہے اب یہ
صرف تمہاری ممی نہیں میری بھی ہیں۔ اب ان سے
کام کراؤ گی۔“ انشراح کے کمرے سے باہر آتے ہی وہ
مصنوعی خفگی سے بولا۔

”بہت دن سے ہم ماں بیٹے نے تمہارے ہاتھ کا
ناشتا نہیں کیا۔“

”میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے کچن کی
جانب برہ گئی کہ علی کی خفگی کا سوچ کر اس کی جان پر بن
آئی تھی ویسے بھی ابھی پچھلی بار کی ناراضی پر اس نے
مشکل سے اسے متایا تھا اس وعدہ پر کہ وہ اسے نظر
انداز نہیں کرے گی۔

ممی! ”ارے ارے سنو! علی بیٹا! انشراح!“ کرتی رہ
گئیں علی نے انہیں باتوں میں لگائے رکھا۔

”انشراح میری بچی!“ اس کے آفس سدھار جانے
کے بعد وہ لپک کر اس کے پاس آئیں۔

”وہ نہ ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ۔ تم خوش
تو ہونا؟ یہ۔ یہ رکھو سب میں خود کر لوں گی۔“ اسے
نیمبل سے برتن سمیٹا دیکھ انہوں نے اس کے ہاتھ
سے ڈش لے کر واپس نیمبل پر رکھی اور خود اسے کرسی
پر بٹھا کر بے چینی سے اس کے چہرے کو ٹوٹنے لگیں۔
انشراح ماں کی اس قدر محبت پر مسکرا دی تھی۔

”آف کورس۔ بہت خوش ہوں ممی۔ بہت ہی
خوش۔ علی جیسے مرد تو نصیب والیوں کا مقدر رہتے ہیں۔
وہ بہت اچھے ہیں بہت اچھے۔“ جذب سے اس نے کہا
تو اس دوران اس کے چہرے پر کھلتے رنگوں نے ممی کو
کچھ مطمئن کر دیا شریفاں اس دوران آکر کام کاج میں
لگ گئی تھی۔

”شریفاں تم ایسا کرو۔ یہ صفائی مکمل کر کے یہ کچھ
چیزیں لادو۔ آج صاحب کی پسند کا کھانا میں خود بناؤں
گی۔“ انشراح کے کہنے کی دیر تھی کہ ممی فوراً اس کی
مدد کو آئیں۔

”یا گل ہوئی ہو انشی! چھوٹے موٹے کام اگر تمہیں
کرنے کی اجازت دی ہے میں نے تو صرف تمہاری
خوشی کے لیے یہ نہیں کہ پورا کھر ہی اپنے کندھوں پر
اٹھا لو۔ بس رہنے دو یہ کھانا وانا بنانا۔ لوگ ہی کتنے
ہیں ہم۔ تین۔ تو پہلے بھی میں بنالیا کرتی تھی اب تو
شریفاں بھی اچھی خاصی مدد کرا دیتی ہے۔ تم جاؤ اپنے
کمرے میں شاباش۔“ وہ اسے کسی اگر مگر کی اجازت
دیے بغیر ہاتھ پکڑ کر اس کے کمرے میں لے گئیں اور
اسے بیڈ پر بٹھا کر خود اس کی الماری کھول کر گھڑی
ہو گئیں۔

”یہ لویہ والا سوٹ پہنو اور مجھے اچھا سا تیار ہو کر
دکھاؤ۔ ہاں زیور پہننا نہیں بھولنا۔“ ساتھ ہی میچنگ
جیولری بھی۔ انہوں نے خود ہی نکال کر دی۔ پھر جب
پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر باہر آئی تو ممی نے خوب لپٹا
لپٹا کر اسے پیار کیا اور بلا لیں۔

”بس یہاں آؤ۔ بیٹھو اور میری بات سنو!“ انہوں

نے اپنے بالکل پاس ہی اسے صوفے پر بٹھالیا۔

”جو باتیں میں آج تمہیں بتا رہی ہوں محض مفروضہ نہیں ہیں بلکہ اپنے تجربات کی بنیاد پر بتا رہی ہوں۔“ انشراح ان کے لمبے سے ٹھٹھک گئی پر کچھ بھی بولے بغیر صرف ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”دیکھو انشراح اعلیٰ بھلے تم سے جتنی بھی محبت کرتا ہو، کبھی بھی مرد کو اتنا سر پر مت چڑھاؤ کہ وہ تمہارے سر پر چڑھ کر ناخن لگے اور تمہیں پاؤں کی جوتی ہی بنا ڈالے۔ اس کی بات سنو ضرور، لیکن کرو وہی جو تمہارا دل چاہے۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم خود کو گھریلو کاموں میں خود زیادہ ہی انوالو کر رہی ہو۔ ابھی سے خود کو اور اس کو جس روٹین کا عادی بناؤ گی ویسے ہی سب سیٹ ہو گا، خود کو دوسرے کی مرضی کے مطابق اتنا بھی مت ڈھالو کہ خود ہی گم ہو جاؤ۔ یاد ہے تمہیں ہوٹلنگ کا کتنا شوق تھا، پر میں نے ہمیشہ تمہاری یہ خواہش نظر انداز کی کہ اکیلی عورتیں ہیں ہم لوگ، تو اکیلی عورتوں کو زندگی پھونک پھونک کر گزارنا پڑتی ہے۔ اب ماشاء اللہ سے شادی شدہ ہو۔ خوب گھومو پھرو۔ آؤ جاؤ اور ہاں سب سے بڑی اور اہم بات ابھی سے فیملی مت بنانے بیٹھ جانا، بہت عمر بڑی ہے ان اچھنوں کے لیے، ابھی صرف اسے اپنا بناؤ کہ بچے میں اس کی مصروفیات میں گھری عورت کو مرد جلدی فراموش کر دیتا ہے۔“

علی کی کال آنے پر ممی کے لیکچر کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ نہیں ویسے ہی ممی سے باتیں کر رہی تھی۔“

اچھا! پانچ دن کا دلہا اپنی دلہن کے فراق میں آفس میں بیٹھا آپس بھر رہا ہے، کسی کام میں دل نہیں لگ رہا۔ پاس ایک فائل اٹھائی ہے بج سے اسی کا کام مکمل نہیں ہو رہا۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے اتر کر پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ ہر صفحے ہر سطر پر محترمہ انشراح مسکراتے ہوئے براجمان ہو جاتی ہیں۔“ اس کا لہجہ اس قدر بے چارگی لیے ہوئے تھا کہ انشراح کھلکھلا کر

مس دی۔

”اچھا سنو اچھی طرح ڈریس اپ ہو جانا۔ وہ بلیک واٹ اسٹونز والا سوٹ پہن لینا۔ ڈنر یا ہر کریں گے اس کے بعد لانگ ڈرائیو۔“

”او کے اور کوئی حکم۔“ وہ مسکرائی۔

”وہ واپس آکر بتاؤں گا۔“ کہتے ساتھ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ انشراح کتنی دیر علی کی خوب صورت باتوں میں کھوئی رہی، وہ تو ممی نے آکر بلایا کہ وہ کھانا کھالے آکر کیونکہ علی دوپہر کا کھانا وہیں آفس میں کھالیا کرتا تھا۔

”زبردست ممی۔ بہت ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں۔ میں نے ایک دو دفعہ کوشش کی ہے آپ جیسا بنانے کی پر ذائقہ تو ذائقہ شکل میں بھی ویسا نہیں ہوتا جیسا آپ کے بنائے کھانے کا ہوتا ہے۔“

”تو تم بناؤ ہی کیوں؟ میری جان جس وقت جو چیز کھے گی ممی بنا دیں گی نا۔“ انشراح ہمیشہ اتنی محبت پر مغرور ہو جایا کرتی تھی۔

شام تک کا وقت اس نے سو کر گزارا تھا، پھر گھری دیکھ کر وہ جلدی سے فریش ہو کر تیار ہونے لگی کہ علی کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔

”ارے یہ کیا انشراح! یہ کیا پہن لیا تم نے۔ فوراً جاؤ اور اتار کر کوئی اور سوٹ پہنو۔ نئی نئی بیاہتا اور کلر دیکھو بلیک اوڑھ پہن کر کھڑی ہو گئی ہے، میں تو کالا رنگ بری میں بھی نہیں رکھنا چاہ رہی تھی۔ پر علی لے آیا تھا تو چپ ہو گئی تھی میں اس وقت، لیکن سوچ ضرور لیا تھا کہ آچکا ہے اب کچھ نہیں کہتی، لیکن پہننے نہیں دوں گی تمہیں، تمہیں نہیں پتا کہ یہ رنگ جب بھی تم نے پہنا، کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور کھڑا ہوا ایک بار سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہو گئیں، دوسری بار شدید بیمار ہو گئی تھیں۔“

ممی نے بولتے بولتے ہی خود اس کی وارڈروب سے دو سرا سوٹ نکھینچ کر اسے ڈریسنگ روم کی جانب ہاتھ پکڑ کر خود چھوڑ آئیں۔

”وہ ممی علی کو پسند۔“ اس نے منمناتے ہوئے

بہترین ڈائجسٹ 160 مئی 2015

ابھی بات پوری نہیں کی تھی کہ وہ یوں گویا ہوئیں۔
 ”وہ تو مرد ہے۔ مرد بھلا ایسی باتوں کی نزاکتوں کو کیا
 جانیں۔ اگر کبھی کہے بھی بلیک کلر کے لیے تو کہنا نہیں
 ہے پسند، بس جاؤ فوراً۔“ انشراح نے ڈھیلے ہاتھوں
 سے ان کے ہاتھ میں پکڑا پنک کلر کا سوٹ پکڑا اور
 تبدیل کرنے چل دی۔

”وعلیکم السلام! بہت ساری لگ رہی ہو، لیکن اگر
 یاد ہو تو ناچیز نے ایک فرمائش کی تھی اور خیالوں میں
 ویسے ہی دیکھتا آیا ہوں جناب کو۔“ اس کے سلام کا
 جواب دے کر وہ اس کے قریب آکر بولا۔

”وہ علی! ایسا ہے کہ بلیک کلر مجھے پسند ہی نہیں ہے
 تو۔“ اٹک اٹک کر کہی گئی اس بات نے علی کے
 مسکراتے لبوں کو سیکڑ دیا۔

”کوئی بات نہیں، یہ سوچ کر پسینے میں نہ
 کما ہے، مجھے پسند ہے اور میں بہت ارمانوں سے صرف
 تمہیں تصور میں رکھ کر لایا تھا۔“ اس کے نرمی سے
 کہنے پر انشراح بہت شرمندہ ہو گئی۔
 ”وہ علی!“

”اٹس اوکے یار! کوئی بات نہیں جلدی سے اپنے
 نازک ہاتھوں کو تکلیف دے کر چائے بنایسے۔ بندہ
 فریش ہو کر ابھی حاضر ہوتا ہے۔“ اس کے چہرے پر
 شرمندگی دیکھ کر وہ اس کے گال کو نرمی سے چھو تاواش
 روم کی جانب بڑھ گیا۔

”کیا تھا جو ممی، علی کی خواہش پوری کرنے دیتیں
 مجھے، وہ ڈھیلے قدموں سے چلتی ہوئی پنچن کی طرف جا ہی
 رہی تھی کہ ممی کے استفسار پر اس نے چائے کا کیا بتایا،
 ان کا موڈ بگڑ گیا۔“

”اتنے اچھے کپڑوں اور میک اپ کے ساتھ تم پنچن
 میں جاؤ گی؟ کوئی ضرورت نہیں ہے جاؤ میں چائے
 بھجوا لی ہوں۔“

”شریفاں!“ دو ٹوک اس کو کہہ کر انہوں نے چائے
 بنانے کے لیے شریفاں کو آواز دی۔

”کیا ہوا؟ بیگم صاحبہ آپ کو چائے بنانے بھیجا تھا
 غالباً،“ شیشے میں وہ بالوں کو کٹکھنی کر رہا تھا جب اس کے

ابھرتے عکس کو دیکھ کر اس کی طرف مڑا۔

”وہ ممی نے کہا کہ وہ شریفاں کے ہاتھ بھجوا رہی ہیں
 کہ میں کیا اب بن سنور کر پنچن میں جا کھڑی ہوں۔“
 انگلیاں چٹختاتے اس نے کہا تو علی کو اس پر بے اختیار
 پیار آگیا جو اس کے لیے اس کی مرضی کے لیے اپنے
 آپ کو بہت تبدیل کر چکی تھی۔ کر رہی تھی بس یہ ممی
 درمیان میں دخل اندازی نہ کرتیں ہر کام ہر بات میں
 تو وہ اس کو اپنی پسند میں ڈھال بھی چکا ہوتا، خیر اس کے
 لیے اتنا ہی بہت تھا۔

”اچھا بھئی یہ بتاؤ کہ دن کیسے گزرا کیا کیا آج کے
 دن؟“ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے صوفے تک لایا اور
 اپنے بالکل پاس بٹھا کر نرمی سے سوال کیا کہ انشراح کی
 جھجک اور شرم ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آ رہی
 تھی، جبکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ہر وہ بات شیر کرے
 جو اس کے دل میں ہے جو وہ چاہتی ہے۔

شریفاں چائے لے آئی تھی۔ چائے پی کر جس
 وقت وہ دونوں باہر آئے، علی ابھی سامنے کھڑی ممی کو
 کہنے ہی والا تھا کہ وہ اور شریفاں کھانا کھالیں، وہ دونوں
 باہر جا کر کھائیں گے کہ ممی کی ہدایات سن کر ٹھٹھک
 کر رک گیا، جو وہ شریفاں کو دے رہی تھیں کہ وہ سب
 ڈنر کے لیے باہر جا رہے ہیں، وہ کھانا کھا کے دروازے
 وغیرہ لاک کر کے سو جائے وہ آٹومٹک لاک سے خود ہی
 دروازہ کھول کر آجائیں گے اور جلدی آنے کی کوشش
 کریں گے۔

”آئی آپ۔ آپ بھی چل رہی ہیں ہمارے
 ساتھ۔“ وہ ہٹکا کر بولا تھا کہ اپنی نصف بہتر کی طرف
 سے جواب سن کر اسی کی جانب مڑا جو اسی کے پیچھے
 آ رہی تھی۔

”ہاں نا علی! ممی کبھی میرے بغیر اکیلی کہاں رہی ہیں
 گھر میں۔ میں نے ان کو کہا تھا چلنے کو۔“ بے نیازی
 حد سے سوا تھی۔ اسے اپنے انتہائی فیصلے کی سنگینی کا
 احساس پہلی بار ہوا۔

”آئی جانا چاہتی ہیں تو ضرور چلیں مجھے خوشی ہو گی،
 لیکن اگر صرف تنہائی سے گھبرا کر چل رہی ہیں تو بھی

161

شریفاں کو فل ٹائم ڈیوٹی پر رکھا ہی اسی لیے ہے کہ ایسی کوئی رابلم نہ ہو۔“ اس نے آنٹی کو روکنے کی ایک کوشش کرنی چاہی۔

”رابلم تو کوئی نہیں ہے۔ انٹی کے ساتھ بہت دن ہو گئے باہر گئے، لیکن اگر تم نہیں چاہ رہے تو میں رک جاتی ہوں۔“ آنٹی نے کچھ تیز لہجے میں کہا تو انشریح بجلی کی تیزی سے ماں کی طرف آگئی۔

”ارے مئی یہ کیوں ناراض ہوں گے یہ تو آپ کے آرام کی وجہ سے کہہ رہے ہیں۔“

”چلیں نا۔ میں باہر ہوں آجائیں آپ لوگ۔“ وہ ماں بیٹی کی محبت سے بے زار ہوتا باہر کی جانب چل دیا کہ ایک تو اس ماحول اور محبت کے مظاہرے کو مزید برداشت کرنے کی تاب نہیں تھی پھر اب باہر نکل کر کوئی ٹیکسی دیکھنی تھی کہ پہلے تو اس کا انشریح کو اپنی بائیک پر لے جانے کا ارادہ تھا۔

”مئی اور بیٹی دونوں ہی پاگل ہیں غالباً؟“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہوا ان دونوں کا انتظار کرنے لگا پھر انہوں نے صرف کھانا ہی کھایا تھا اور باتیں بھی برائے نام ہی کی تھیں کہ مئی کے سامنے چاہ کر بھی اپنی نئی نوکی دلہن کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لانگ ڈرائیو کا پروگرام ملتوی کرتے وہ گھر آگئے تھے۔ سب سے زیادہ گوشت علی کو اس وقت اٹھانی پڑتی جب رات کو کم از کم دو دفعہ مئی صاحبہ لاڈلی بیٹی کی خیریت دریافت کرنے تشریف لے آتیں کبھی ان کا دل گھبرا جاتا تو کبھی وہ کوئی التماسیدھا خواب دیکھ کر دوڑی آتیں۔

پہلے دن اور پہلی دفعہ تو ایسی ہی صورت حال پر وہ خود دروازہ کھولنے آیا تھا کہ شدید قسم کی دستک پر وہ دونوں ہی پریشان ہو کر غیند سے اٹھ گئے تھے، لیکن اب دستک سن کر علی جاگ بھی رہا ہوتا تو کروٹ بدل کر نیند میں ہونے کی ایکٹنگ کرنا کہ اسے پتا تھا۔ ایسی غیر مناسب حرکت پر یہ نہ ہو اس کے منہ سے کچھ التماسیدھا مئی کی شان میں نکل جائے اور مئی تو مئی بیگم صاحبہ کی ناراضگی کا سامنا بھی کرنا پڑے۔



اس کے دفتر کے جن لوگوں نے گھر میں یا ہوٹل میں اس کی دعوت کی تھی، مئی تب بھی ان کے ساتھ گئی تھیں اور وہاں انہوں نے اگر انشریح کو اپنے ہاتھ سے کھلایا نہیں تھا تو اس سے کم بھی نہیں کیا تھا انشریح کی ناز برداری میں اس حد تک بڑھ جاتیں کہ علی خواجواہ ہی کو فٹ محسوس کرتا تھا ایک دو دوستوں نے تو مذاق مذاق میں ایک دو باتیں بھی سنائیں۔ اب ایک بار پھر وہ اپنا مسئلہ لے کر حسن کے سامنے حاضر تھا۔

”یار عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب تو مئی نام سے نفرت ہو گئی ہے مجھے۔ مئی نہیں ایک مستقل عذاب ہے جو میں نے اپنے سر مول لے لیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی زندگی میں حد درجہ انوالوڈ تھیں پر اب انہیں خود سمجھنا چاہیے کہ شادی شدہ زندگی کے الگ ہی تقاضے ہوتے ہیں۔ ان کی بیٹی میری ہے۔ صبح صبح آکر وہ اپنی بیٹی کے کپڑے نکالیں گی۔ کپڑا، کالر، ہر چیز ان کی پسند کی ہوتی ہے۔ میں کچھ کہہ دوں تو مئی کی لاڈلی کامنہ اتر جاتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا جاؤں تو کہاں جاؤں؟ وہ ایک ساتھ پانی کے دو گلاس چڑھا گیا۔

”کول ڈاؤن یا۔ دنیا میں کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل نہ ہو۔“ پہلے پہل تو حسن اس کی روداد سن کر بے تحاشا ہنسا تھا پھر اس کے چہرے پر حقیقی بے چارگی دیکھ کر وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ہاں تو جتنا حل۔“ وہ اسے پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ ”آہستہ یا۔ میں تیرا دوست ہوں مئی نہیں جو غصہ مجھ پر اتار رہا ہے۔ تیری بیوی اگر چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔ دیکھ تو کچھ کہے گا تو تیری بات کو محسوس بھی کر سکتی ہیں پر اولاد کی بات کوئی بھی ماں باپ محسوس نہیں کرتے تو بھابھی کو آہستہ آہستہ سمجھا۔ وہی باتوں باتوں میں مئی کو احساس دلائیں کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور اس کی شادی شدہ زندگی میں ان کی حد درجہ دخل اندازی بہت سے مسائل کو جنم دے سکتی ہے۔“

”او بھائی میرے بات تو یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے کہ میری بیوی میری اگر ہر بات مانتی ہے تو ماں کی حکم عدولی

کو گناہ سمجھتی ہے۔ ان کے ہاتھ کی ایک ٹنگن اس کی راتوں کی نیند اڑا دیتی ہے، میں کچھ کہتا ہوں۔ مئی کچھ کہتی ہیں، مانتی دونوں کی ہے، پر جہاں ہمارے نظریات ٹکرا جاتیں وہ ہر اسماں ہو جاتی ہے۔ مجبوراً مجھے ہی پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے۔“ اس کا مسئلہ واقعی سیریس تھا۔ وہ بہت دیر بیٹھے رہے، پر کوئی حل سمجھ نہیں آیا، لیکن یہ تھا کہ علی جب حسن کے پاس سے اٹھا اس کے کشیدہ اعصاب آج نارمل تھے۔

اس دن کے بعد اس نے اپنا ہنی مون پروگرام خود ہی کینسل کر دیا کہ مئی کا کچھ بھروسہ نہیں تھا ساتھ ہی چل دیتیں۔

”تیری مئی کا بندوبست ہو گیا سمجھو۔“ اگلے دن حسن اس کے پاس آکر بولا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے کمپیوٹر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

”مطلب یہ کہ میرے انکل اس شہر کے ایک جانے مانے سائیکالٹرٹ ہیں، کل بالکل اچانک ہی ان سے ملاقات ہو گئی تو باتوں باتوں میں تمہارا مسئلہ بیان کرنے کی دیر تھی کہ انہوں نے کہا یہ تو کچھ بھی نہیں وہ تو ایسے ایسے مریضوں کو ٹھیک کر چکے ہیں مجنہیں ان کے گھروالے لا علاج قرار دے کر ان کے حال پر چھوڑ چکے تھے۔

تمہاری ساری بات سے تو میں بھی متفق ہوں بلکہ مجھے تو بہت پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی نفسیاتی گمراہ ہے ان کی شخصیت میں کہ ایسی شدت پسندی ہے ان کی ذات میں۔

”ان کو تو کوئی مسئلہ، کوئی بیماری ہی نہیں کہ جس کا بہانہ بنا کر میں ان کو انکل کے پاس لے جاؤں اور ڈاکٹر دے تو دیسے ہی ان کی جان جانی ہے۔“ وہ کچھ مایوسی سے بولا۔

”چھا چل تو پریشان نہیں ہو۔ اس کا بھی کوئی حل نکالتا ہوں۔“ حسن نے کچھ سوچ کر کہا۔

”انش! میں نے یہ والی میچنگ شرٹ استری

کرنے کو کہا۔ یہ کون سی کردی تم نے۔“ وہ وارڈ روب کھنگال کر بولا تو انشر اس کی مدد کو آئی۔

”لامیں میں یہ کر دیتی ہوں۔“ وہ کہتی باہر چلی گئی۔ وہ جو بھی کام انشر کو کہتا مئی پہلے تو خود کرنے کی کوشش کرتیں ورنہ شریفاں سے کروا دیتیں، جبکہ انشر اس کا کوئی بھی کام اپنے ہاتھوں سے کرے، یہ احساس اسے خوشی دیتا تھا اور یہی ہوا وہ صرف یہی دیکھنے باہر چلا آیا کہ انشر کو خود بھی احساس ہوتا ہے یا وہ بھی ذمہ داری سے جان چھڑا لیتی ہے۔

”شریفاں کو تو میں نے ایک کام سے باہر بھیجا ہے۔ لاؤ میں کر دیتی ہوں۔ تمہیں کہاں آتے ہیں کپڑے استری کرنے۔“ اخبار کا مطالعہ کرتی مئی اٹھ کے آئیں اور شرٹ انشر کے ہاتھ سے لے لی۔

”جب تک یہ کوئی کام کرے گی نہیں تو آئے گا کیسے آئی! لائیے میں خود ہی کر لیتا ہوں۔“ خاموش کھڑی انشر پر ایک ناراض سی نظر ڈال کر وہ ان کے ہاتھ سے شرٹ لے کر فوراً ہی اندر چلا گیا۔

”مئی میرے خیال میں علی ناراض ہو گئے ہیں۔“ انشر ہر اسماں ہو کر بولی۔

”ارے جاؤ بھی انشی! یہ مرد ایسے ہی اسٹی ٹیوڈ دکھاتے ہیں عورتوں کو نچا دکھانے کو۔ اسے اس بات سے کیا سروکار کہ کام کس کے ہاتھ سے ہو رہا ہے، اسے تو ہر چیز وقت پر مل رہی ہے نا، لیکن تم کیا جانو مردوں کی فطرت، عورتوں کو پاؤں کی جوتی بنا کے رکھنے میں ہی انا کی تسکین ہوتی ہے۔“

غصے میں وہ بغیر ناشتے کے ہی گیا تھا اس دن اور دن میں تین چار بار کال کر کے انشر کا حال احوال پوچھنے والے علی نے ایک دفعہ بھی نہ تو کال کی نہ کوئی مسیج کیا، وہ سارا دن بے کل، بے کل سی پھرتی رہی۔ اوپر سے مئی کے فرمودات الگ اسے بے زار کرتے رہے۔

شام کو ابھی علی نے آکر کپڑے ہی تبدیل کیے تھے کہ حسن کسی مہمان کو لے کر ساتھ چلا آیا۔ علی کو خوش گواری سی حیرت ہوئی کہ بہت زیادہ دوستی کے باوجود

حسن کبھی ان کے گھر نہیں آیا تھا، ہاں وہ ایک آدھ بار ان کے ہاں جا چکا تھا، بلکہ حسن نے تو ان کی ہوٹل میں دعوت بھی کی تھی جس میں انشراح اور علی کے ساتھ می بھی شریک ہوئی تھیں۔

”حسن کی زبانی سنا تھا کہ کیسے آپ نے تنہا ہو کر ایک بچی کے ساتھ دنیا میں سروا سو کیا۔“ چائے پینے کے دوران ہی وہ اچانک خاموش بیٹھی مئی سے مخاطب ہوئے۔ جہاں انشراح ہوتی تو یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ می وہاں نہ ہوتیں۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئیں۔

”میں رشتے میں حسن کا انکل ہوتا ہوں، لیکن یہ مجھے اپنے والد کی طرح ماننا اور عزت دیتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ میرا بیٹا ہے۔ علی کالیسٹ فرینڈ ہونے کے ناطے اس نے مجھے بتایا تھا آپ کے بارے میں۔ یوں سمجھیں عابدانہ تعارف رکھتا ہوں میں آپ لوگوں کا۔“ وہ ایک سائیکالوجسٹ تھے اور جانتے تھے کہ کہاں، کیسے، کس طرح اور کیسی بات کرنی ہے، اکثر مریض ان کے پاس لائے جاتے پر کچھ پیچیدہ مریض ایسے بھی ہوتے جو خود کو بیمار سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے، ایسے میں اگر ضرورت پڑتی تو ان کو خود بھی جانا پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا۔ حسن نے ایک دو بار سرسری ان سے ذکر کیا تھا علی کی مئی کا انہوں نے کہا تھا وہ ایسے کیسے کسی پشٹ کو ملے اور دیکھے بغیر کچھ کہہ سکتے ہیں، اس بار حسن پوری سنجیدگی کے ساتھ ان کے پاس آیا تھا کہ علی منہ مانگی فیس ادا کرنے کو تیار ہے، وہ کوئی حل نکالیں ورنہ ان کی ازدواجی زندگی ہمیشہ اسی تناؤ کا شکار رہے گی۔

اس کا کہنا تھا کہ علی کی ساس ایک ایسی ہی مریضہ ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیٹی کی زندگی کو ڈسٹرب کرنے کا باعث بن رہی ہیں۔ پھر اپنے شیڈول سے فارغ وقت دیکھ کر انہوں نے حسن کو ایک تاریخ دے دی تھی۔

”میں خواتین کی بہبود کے لیے کام کرنے والی ایک کمیٹی سے بھی منسلک ہوں میڈم۔ بہت سا کام کیا ہے ہم نے مظلوم خواتین کی فلاح کے حوالے سے

بہت سے منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ آپ جیسی بہادر اور باہمت خاتون اگر ہماری کمیٹی سے منسلک ہو جائے تو ہمارے ادارہ کی خوش نصیبی ہوگی۔ دیکھیے نا بہت سی خواتین جو کسی مسئلے کی وجہ سے اکیلی رہ جاتی ہیں۔ ماں باپ نہ ہونے کی وجہ سے شوہر کی طلاق یا شوہر کی خدا نخواستہ ڈیٹھ کے بعد یہ معاشرہ ایسی خواتین کے لیے کوئی جگہ یا مقام نہیں رکھتا، نتیجتاً وہ ہمت ہار کر زندگی کے تلخ حقائق کی نظر ہو جاتی ہیں۔ آپ جیسی خواتین کو ہم ان خواتین کے لیے رول ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ آپ کیوں تنہا ہیں اب تک۔ آپ کی فیملی کہاں ہے، لیکن جس ہمت اور حوصلے سے آپ نے اپنی بچی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، اپنے کردار کی حفاظت کے ساتھ وہ قابل تحسین ہے۔“

وہ اپنے شعبے میں ایک ماہر ڈاکٹر تسلیم کیے جاتے تھے اور اس کا ثبوت آج انہوں نے آدھے پونے گھنٹے کی اس میٹنگ میں دے دیا تھا۔ ان کے آنے کے بعد سے ایک طرف بیٹھی مئی ان کے جانے کے بعد ان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے یتیم اور بے سہارا عورتوں کے ادارہ والی بات بھی غلط نہیں کی تھی، یہ ادارہ ان ہی کا قائم کردہ تھا تاہم اس کی ایڈمنسٹریشن کے لیے انہوں نے قابل بھروسہ لوگ رکھے ہوئے تھے کہ ان کی بے تحاشا مصروفیات انہیں فل ٹائم اس ادارہ کی دیکھ بھال کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

پھر اگلی بار ڈاکٹر صاحب اپنے ادارہ کے کچھ پمفلٹس اور تصاویر کے ہمراہ اکیلے ہی حاضر ہوئے تھے، اس بار حسن ان کے ہمراہ نہیں تھا اور حسن کی حسب ہدایت علی نے انشراح کو بھی وہاں سے ہٹا دیا تھا کہ وہ دونوں مل کر کچن میں شریفاں کی ہیلپ کرا سکیں۔ مئی کسی عقیدت مند کی طرح انہیں سننے جا رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار شاید انشراح ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور انہیں احساس تک نہ ہوسکا تھا۔ مئی نے باقاعدہ ممبر شپ کارڈ پر سائن کر دیے اور ہفتے میں

ایک دفعہ اس پروگرام میں شرکت کی حامی بھی بھری ہو
ادارہ میں بے سہارا خواتین کے لیے منعقد کیا جاتا تھا۔
پھر علی کے لیے وہ دن گویا عید کا دن تھا جب ممی کو وہ
اس ادارہ میں چھوڑ کر آیا تھا۔

ممی نے تو انشراح کو بھی ساتھ لے جانے پر خاص
زور دیا تھا، پر علی نے رات کو ہی انشراح کو سختی سے تاکید
کر دی تھی کہ ممی اسے لے جانے کی ضرورت کو شش
کرپس کی تاہم اس نے ہرگز بھی جانے کی حامی نہیں
بھری۔

”نہیں ممی میں نہیں جا رہی۔ اصل میں رات
نیند پوری نہیں ہوئی تو دن کو تھوڑا ریسٹ کا ارادہ ہے
میرا۔“

”کیوں کیا ہوا؟ نیند کیوں پوری نہیں ہوئی؟ کیا ہوا
میری جان؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

اف یہ ممی اور ان کی بیٹی۔ میری جان لے کر
چھوڑیں گی۔ اس نے دل میں بے حد کوفت محسوس
کرتے ہوئے اپنی نازک سی بیوی کو دیکھا جواب ممی کو
اپنی طبیعت کی طرف سے خوب تسلیاں کر رہی تھی
مبادا وہ جانے کا ارادہ ہی نہ ملتوی کر دیں۔

”ارے آنٹی بے فکر رہیں۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ
کر تھوڑی دیر کے لیے ہی آفس جاؤں گا، پھر ہاف لیو
لے کر آجاؤں گا۔ انشراح کی طرف سے بے فکر رہیں
پھر شریفاں تو ہے ہی نا۔“ لہجے میں شہد بھرتے اس نے
کہا تو اسے اور شریفاں کو ہزار ہدایات انشراح کے
حوالے سے دیتی۔ وہ علی کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

علی کا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ ممی کے سخت آرڈرز
کے باعث وہ کبھی اپنی شادی شدہ زندگی کی چھوٹی موٹی
خوشیوں کو محسوس ہی نہیں کر پایا تھا کہ ممی جی ایک سنگی
تلوار کی مانند ہر مل لنگتی دکھائی دیتی۔ ہاف لیو کا تو اس
نے ممی کو کہا تھا، ورنہ اس کا ارادہ آج پورا دن بھر پور
طریقے سے انشراح کے ساتھ گزارنے کا تھا۔ اس نے
حسن کو بھی فون کر کے آفس میں اپنا کام سنبھال لینے کی
ذمہ داری سونپ دی تھی۔

☆ ☆ ☆

ممی نے خود کو بہت دنوں بعد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا
کسی بھی ذمہ داری کے احساس کے بغیر۔ وہ بہت سی
عورتوں سے ملیں۔ انہیں بھرپور تسلی دیتے ہوئے اپنی
ہر قسم کی مدد اور تعاون کا بھی یقین دلایا۔ وہ ادارہ ان کی
توقع سے کہیں زیادہ بڑا اور منظم تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو
پروگرام میں شریک دیکھ کر انہیں خوش گواری سی حیرت
ہوئی اور ان کی طرف سے دیا گیا پچاس ہزار کا چیک
ڈاکٹر صاحب کو حقیقی خوشی دے گیا کہ وہ خالی خولی
دعوے کرنے والی خاتون نہیں تھیں بلکہ اپنے دل میں
انسانیت کا درد بھی رکھتی تھیں۔

وہ علی کو فون کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ انہیں
آکر لے جائے کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں ڈراپ
کرنے کی ذمہ داری بخوشی اٹھالی۔

”اب آپ آہی گئی ہیں تو میرے چھوٹے سے
کلینک کو بھی تشریف آوری کا شرف بخشی جائے۔“ ڈاکٹر
صاحب باتوں باتوں میں انہیں بتا چکے تھے کہ وہ مسیحائی
کی فیلڈ سے منسلک ہیں تاہم ان کا طریقہ کار عام ڈاکٹرز
سے مختلف ہے۔

”دو مرلے کے اس چھوٹے سے گھر میں جہاں آٹھ
بچے پہلے ہی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے، ہرگز
ایک اور بچی کی آمد کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا، پر قدرت
کو جس روح کو دنیا میں بھیجنا ہوتا ہے وہ بھیج ہی دیتی
ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے دو کمروں پر مشتمل اس گھر
میں جب میں پیدا ہوئی تو میرے والدین کو ہرگز میری
ضرورت نہیں تھی کہ وہ غریب لوگ تو پہلے سے موجود
آٹھ جانوں کے پیٹ کا ایندھن پورا کرنے کی تک دو دو
میں بری طرح سے مصروف تھے۔“

ڈاکٹر صاحب کا ان کو یہاں لانے کا مقصد ہی ان کی
ذات کی ان گریہوں کو سلجھانا تھا جو ابھی ہونے کے
باعث کئی لوگوں کے لیے آزار کا باعث بن رہی تھیں،
سو باتوں ہی باتوں میں اپنے مخصوص طریقے سے اپنی
ذات کے بند دروازے کھولنے کے لیے کمک فراہم کی
اور وہ کسی خوبی کیفیت میں بولتی چلی گئیں۔

”لاڈ پیار، محبت، قربانیاں سب بھرے پیٹ کے

جو نچلے ہیں، جہاں لوگ دو چھوڑا ایک وقت کی روٹی کو ترستے ہوں، وہاں بھوک ہی سب سے بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔ مجھے تو آج تک سمجھ نہیں آسکی تھی کہ میں زندہ کیسے رہ گئی تھی کہ آکسیجن کی فراہمی ہی مجھ تک آسانی سے ممکن ہو پاتی تھی ورنہ ڈاکٹر صاحب آپ یقین بھی نہیں کریں گے میری بڑی بہن بتاتی تھیں کہ چار ماہ تک میری ماں کے پاس مجھے پہنانے کے لیے کپڑے تک موجود نہیں تھے، ان چاہی وہ نومولود کسی میلے کپڑے میں لپیٹی ایک طرف لیٹی انگوٹھا چوستی رہتی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے نا آنکھوں پر میں کوئی ایک پل فراغت کا میسر ہونے پر بھوک کی بجلی کو چھاتی سے لپٹا کر اس کی بھوک کا مداوا کر ہی دیا کرتی تھی۔ ایک سال کی عمر تک یہی رابطہ میری ماں کا، مجھ سے واحد واسطہ تھا، پھر کھانے کے لیے جو کچھ بھی نصیب ہوتا۔ مٹھی بھر چاول یا تین چار روٹیوں میں سے کوئی بڑی بہن ایک آدھ نوالہ میرے پیٹ کا نصیب بنا ہی دیا کرتی تھی۔ کچی بستی میں رہنے والے ان ٹیکنوں کے لیے بھوک ہی ان کا مسئلہ تھا، بھوک ہی تعلیم اور بھوک ہی روح۔

پانچ سال کا ہونے پر میں نے گھر میں کچھ آسانی دیکھی کہ میری بڑی بہن کو محض چند ٹکوں کے عوض بڑے شہر کی ایک بڑی فیملی اپنی کسی بیمار بزرگ کی خدمت کے لیے لے گئی، پھر میرے ماں باپ کو بیٹی کی کبھی یاد نہ آئی، بلکہ ہر مہینے اس کی خدمت کا معقول معاوضہ ہی بیٹی کی محبت پر پردہ ڈال دیتا۔ دوسرے اور تیسرے نمبر کے بھائی موٹر مکینک کے پاس بٹھادیے گئے۔ پھر یہ ہوا کہ میرے ماں باپ کو اپنے بچوں کو بیچ کر کمانے کی بری لت نے گھیر لیا۔ بڑی بیٹی کو ملازمت کے نام پر بیچا تھا انہوں نے، پھر بعد کی بیٹیوں کو شادی کے نام پر بیچتے چلے گئے۔ ان ہی دنوں بڑی کی طرف سے پیسے آنے بند ہو گئے۔ اماں ابا پریشان تو ہوئے پر بیٹی کے لیے نہیں پیسے کے لیے بہترے فون کیے، اماں تو ایک دو چکر بھی ان کے گھر کا لگا آتا تھا۔ نہ وہ گھر وہاں پر تھا نہ مکین وہی تھے پتا چلا کہ چند ماہ قبل ہی یہ فیملی کمریج

باج کر غیر ملک سہیل ہو گئے تھے۔ ہمارا واسطہ یا تعلق اپنے ماں باپ سے ایک اولاد والدین کا نہیں تھا وکاندار اور مال کا سا تھا۔

بھائی دونوں آوارہ چری ہو گئے تھے۔ وہ بھی اب اس گھناؤنے کھیل میں ماں باپ کے برابر کے شریک تھے، جو بیٹیوں کے پیو پار کا تھا۔ پہلی بیٹی کو ماں باپ کا لالچ نبھانے کہاں لے گیا تھا کہ چوتھے نمبر والے والی کی اچانک موت کا پتا چلا۔ آج تک یہ معرہ حل نہیں ہو سکا کہ تین ماہ کی وہ بیاہی خود مجلس کر مر گئی کہ غریب ہونے کی وجہ سے اسے مار دیا گیا۔ شادی، گھر، مرد، سسرال میرے لیے ایسی بڑی بڑی عفریت کے نام تھے جو لوگوں کو زندہ نکل جاتے ہیں۔ پھر ایک دن مجھ سے بڑی گھر سے اچانک ہی چلی گئی تھی کہ اس کا جو سودا میرے ماں باپ نے کیا تھا شاید وہ اسے منظور نہ تھا کہ وہ تیرہ برس کی معصوم بچی اور وہ ستر سالہ تین بیویاں بھگتا چکا ایک گھاگ مرد۔

افیت کی یہ داستان سناتے سناتے ہی ممی کی حالت غیر ہونے لگی وہ گھرے گھرے سانس لینے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب سمجھتے تھے مریض کی ایسی حالت کو کہ اپنی ذات کی کھوج کے سفر میں انسان یونہی تڑھال ہو جایا کرتا ہے۔ انہوں نے انہیں پانی پلایا تھا۔

”پھر میں تھی جس کو اپنے نام کی صحیح پہچان ہی نہ تھی کہ نویں ان چاہے بچے کا کون نام رکھتا ہے، بس پیدائش کے تیسرے دن کسی نے نمٹی بلایا تو بارہ سال تک منی ہی رہی۔ پھر منی کی باری بھی آئی گئی تھی۔ ماں باپ بھائی اس کی اور اپنی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ اسے خریدنے والا کوئی عام شخص نہ تھا۔ اچھا خاصا امیر تھا، پر اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اس کی امارت اس کی اپنی محنت کا شاخسانہ نہیں بلکہ اس کی بیوی کی — ماں باپ کی طرف سے دی گئی مارکیٹ میں نین چلتی ہوئی دکانیں تھیں۔ اس کی بیوی کی ہی خواہش تھی کہ صرف اولاد کے لیے نکاح کا ڈرامہ رچانے کے لیے کوئی میرے جیسی غریب اور مسکین لڑکی ہی ڈھونڈی جائے جس کو فارغ کرنے کے

بعد کوئی دلی وارث پوچھ گچھ کرتا نہ آن پہنچے میں ان کی مطلوبہ خصوصیات پر بدرجہ اتم پوری اتاری اور قرعہ فال میرے نام نکل آیا۔ میرا نام نہاد شوہر ایک جنم سے نکال کر مجھے دوسرے برنخ میں لے گیا جہاں میرا مقام ایک فل ٹائم ملازمہ کا شرا تھا کہ میرے جاتے ہی ایک جزوقتی ایک کل وقتی ملازمہ کو کام سے فارغ کر دیا گیا۔ ضرورت کے تحت باندھے گئے اس رشتے نے آخر مجھے اس مرتبے پر فائز بھی کر دیا کہ جس کے لیے میں لائی گئی تھی۔ وہ ظالم عورت اور مرد بار بار میری اوقات اور حیثیت یاد دلاتے ہوئے بتاتے کہ انہوں نے ایک معقول رقم میرے ماں باپ کو دے کر فقط اسی مقصد کے لیے خریدا تھا اور اس کے بعد مجھے طلاق دے کر فارغ کر دیا جائے گا ان کی بلا سے میں جہاں جاتی۔

اوپر والے پورشن میں انشرح کے باپ کے چچا رہائش پذیر تھے وہی خاندان تھا جو انہیں اس ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ ”بیٹا! بیوی نہ سہی تمہاری اولاد کی ماں تو ہوگی ناں یہ بچی۔ پورے حقوق نہ بھی دے سکو تب بھی گھر کی چھت نہ چھینو کسی مظلوم کی آہ اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ بہت سخت پکڑ ہے اس کے ہاں حقوق العباد سے نفی کرنے والوں کی۔“ جب بھی مجھے روٹا دیکھتے وہ اس شخص کو ضرور تلقین کرتے جو بد قسمتی سے میرے شوہر کے مرتبے پر فائز تھا۔ پھر اذیت و درد کے طویل صحرا کو عبور کر کے میں نے انشرح کو جنم دیا تھا اسپتال میں۔ پھر شاید اس شخص کے دل میں خدا نے رحم ڈالا تھا یا اس کے چچا کی باتوں نے دل پر اثر کیا تھا کہ اس نے فی الحال مجھے طلاق جیسے کلنک سے بچالیا تھا پر اصل ظلم کی داستان تو یہیں سے شروع ہوئی۔ اس عورت نے انشرح کو جھپٹ کر میری گود سے لیا تھا اور مجھے دھکیل کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، میری مستانہ تڑپتی اسے دیکھنے کو، پر مجھے اجازت نہیں تھی بچی کو اٹھانا تو ایک طرف دیکھ بھی سکوں۔

پھر جس دن میرے دودھ نے میری بچی کو پکارا وہی عورت اس بار بھی آڑے آئی تھی۔ ”ارے جاؤ تم

جیسی کی مین کا دودھ پیے کی میری بچی اس بھول میں کبھی مست نہ بنا اور نہ ہی آئندہ ایسی جرات لے کر میرے پاس آتا اور نہ اس گھر میں تمہارا آخری دن ہوگا۔“

سارا دن گھر کے کچھینوں میں ابھی میں اپنی بچی کو دیکھنے اٹھانے اور سینے سے لگانے کو ترستی رہتی اس شقی القلب عورت کو پھر بھی رحم نہ آتا۔ مٹی کا مادھو میرا مرد یہ سب دیکھتا اور چپ رہتا۔ جس عورت کے دودھ کو بچ کھا تھا اس عورت نے اس عورت کی کوکھ بنے بچے کو کیوں سینے سے لگائے پھرتی تھی یہ بات میری کبھی سمجھ میں نہ آسکی

پھر ایک دن جب میری انشرح چھ ماہ کی تھی پہلی بار مجھے اپنی بیٹی کے لمس کو محسوس کرنے کا شرف حاصل ہوا کہ وہ سولی ہوئی تھی بہت گہری نیند جب ہی بچی کے اٹھ کر رونے نے بھی اس کی نیند میں خلل نہ ڈالا میں بھاگ کر بچی کے پاس گئی اور لپک کر سینے سے لگالیا اور ابھی محبت کی ماری متا نسکیں نہ لے پائی تھی کہ وہ ظالم ہاتھوں نے بچی کو جھپٹ لیا۔ ”کم بخت نامراد کھا بھی تھا میری بچی کو ٹپاک ہاتھ مت لگا۔“ وہ عورت چیخ رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس مرد کا آنا میری بد قسمتی میں مزید اضافہ کر گیا تھا۔

”آج اس نے بچی کو ہاتھ لگانے کی جرات کی۔ کل اس کو پیار کرے گی۔ برسوں میرے خلاف کر کے اسے میرے مقابل کھڑا کر دے گی۔ اسے طلاق دو فوراً۔“ میں کہتی ہوں فوراً اسے منع کرو۔“

پھر اس مرد نے مجھ پر ایک نظر بھی ڈالے بغیر تین الفاظ کہہ کر اس عورت کے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی اور میرے کلیجے کو آگ بنا دیا۔

”شام جب میں اس گھر میں لوٹوں تو تم اس گھر سے اپنی منحوس صورت لے کر جا چکی ہو۔“ نہ صرف یہ بلکہ اس نے میرے کچھ کپڑے اٹھا کر بیگ میں رکھے، رقم بھی رکھی اور میاں اور میری بچی کو لے کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے اپنی ماں کے گھر نکل گئی تھی شاید۔ غم کی شدت نے اور اپنے آنے والے کل کے خوف نے

مجھے میرے پیروں پر کھڑا رکھنے سے انکار کر دیا اور میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر ہوش میں آنے پر اس بزرگ اور اس کی بیٹی کو خود کے پاس پا کر یہ زخمی داستان سنائی ہی تھی کہ باہر اٹھتا شور اور ان کی سرگوشی میں کسی بات مجھے خاموش کرا گئی تھی۔

”بس اب اپنی طلاق کا ذکر کبھی زبان پر مت لانا۔ رازوں کو رکھنے والا وہ مالک ان ہستیوں کو سنبھال چکا ہے جنہوں نے ظلم کی حد کرتے وقت خدا کی لاکھی کو نظر انداز کر دیا تھا۔“

”میری بچی! میں تڑپ کرا تھی۔“

”وہ بچ گئی ہے شاید خدا مزید تمہیں آزمانا نہیں چاہتا تھا۔“ ایسے شدید ایکسیڈنٹ میں جب دونوں میاں بیوی جان سے گزر گئے تھے اس بچی کا بچ جانا معجزہ ہی تھا۔

”وہ دن اور آج کا دن وہی میرے باپ بھی تھے سرپرست بھی، بڑے بھی اور رہنما بھی۔ دو سال پہلے ہی ان کے بیٹے نے انہیں اپنے پاس بلوایا۔ علی کے ماموں ان ہی کے بھانجے تھے تب ہی میں نے اس کو کرایہ دار کے طور پر منتخب کیا اور آج وہ انشراح کا خاوند ہے۔“

بے حد ابھرتے درد کو دباتی وہ پھیکا سا مسکرا کر بولیں۔

”ڈاکٹر صاحب میں نے اپنی زندگی کی اس تلخ کتاب کو اپنی بیٹی سے بھی پوشیدہ رکھا آج تک۔ نجانے کیسے آج پرت پرت آپ کے سامنے خود کو کھول کر رکھ دیا کہ اپنا غم بانٹنے کے لیے انسان کو کسی بھی موڑ پر کسی ایسے انسان کی ضرورت پڑتی ہے جب وہ اپنے اندر کا بوجھ بانٹ کر اس گھٹن کو کم کرنا چاہتا ہے جو اس کی زندگی کو گھٹن کی طرح کھا گئی ہو۔“



”انشراح۔ انشراح۔! علی نے جس طرح دھاڑ کر آواز دی تھی اس سے اس کے غصے کا اندازہ ہوتا تھا۔ انشراح اٹھ کر مہانگے کو تھی کہ می نے اس کا ہاتھ پکڑ

لیا۔“ بینھو تم میں خود جاتی ہوں۔ کیا ہو گیا ایسا جو اس طرح سے بلارہا ہے وہ۔“ وہ اسے وہیں لاؤنج میں بٹھاتی خود اس کے کمرے کی طرف چل دیں۔

”کیا بات ہے علی۔! بات کرنے کا بلانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے یہ کیا کہ بندہ اگلے کو بوکھلا کے رکھ دے، باہر جا کے دیکھو تو کیسے زرد پڑ گئی ہے میری بچی۔“

ناگواری سے بولتے ہوئے وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں یہ دیکھے بغیر کہ وہ کس قدر غصے میں تھا اور انشراح کی جگہ ان کو دیکھ کر اس کا پارہ مزید بڑھ گیا تھا۔

”بس آئی بہت ہو گیا تماشا اور بہت کر لیا میں نے ضبط۔ انشراح!۔“

وہ ایک بار پھر زور سے بولا کہ می خود سہم گئیں۔ گرتی پڑتی انشراح بھی آگئی تھی۔ پھر جس پل اس نے ہاتھ میں پکڑی وہ گولیاں لہرا پس جو ابھی ابھی اس کی نظر سے گزری تھیں دونوں ماں بیٹی کے چہرے فق ہو گئے۔

”میں نے ہمیشہ آپ دونوں کی ایک دوسرے سے محبت کی قدر کی، برداشت کیا۔ ضبط کیا پر آج کے بعد ان سب جذباتوں پر ایک ہی جذبہ غالب رہے گا نفرت کا۔ مجھے آئی جی! آج تک آپ کی بیٹی سے محبت سمجھ ہی نہ آسکی، ارے اس سے بڑھ کر دشمن بھی ہو گا انی اولاد کا جو بیٹی کا گھر نہ بنے دے۔ اس کی اولاد نہ ہو سکے اس کے لیے ایسے اوتھے ہتھکنڈے اپنائے۔“

اس نے وہ گولیاں ان کے پاؤں میں پھینک دیں۔

”علی میری بات۔“

”بس مجھے اپنی بیوی سے بات کرنے دیں۔ تم کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہو کہ اچھی بری جس راہ پر چلایا جائے چل پڑتی ہو۔ میں نے تمہیں اپنی ماں کا حکم ماننے سے کبھی نہیں روکا ایسے کہ بہت بار اپنی ماں کی مرضی نہ ہونے پر تم نے میرے جذبات کا خون کیا پر ایسی غلط بات۔“

وہ میاں وہاں شل کر گویا اپنے ابلتے غصے کو قابو

اور شادی کے دن سے لے کر آج تک کی کتنا سنا ڈالی۔
دونوں بے حد حیرت اور دکھ میں گھرے اسے دیکھتے اور
منتے رہے۔

”غضب خدا کا میرا بچہ ایسی مشکل زندگی بسر کرتا رہا
اور یہاں ہم خوش رہے کہ ہمارا بیٹائی شادی شدہ زندگی
میں اتنا مکن ہے کہ ایک بھی چکر بیوی کے ساتھ نہ لگا
سکا ماں باپ کے پاس۔ ارے کیا پتا تھا کہ اس عورت
نے خوار کر دیا تھا اس کو۔ بس دفع کرو ان سکی اور عجیب
و غریب لوگوں کو۔ دو لفظ دے کر جان چھڑاؤ۔ میں اپنے
بیٹے کے لیے خوب چھان پھٹک کر لاؤں گی ہو جو اس
کی اجڑی زندگی میں بہار لے آئے گی۔“

جوں ہی وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹا وہ اس کے سر
میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے گئیں۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا۔ اس وقت بھی تمہیں اور
تمہارے بیٹے کو جلدی تھی کسی بھی شرط کے اسباب و
نتائج کا خیال کیے بغیر ہتھیلی پر سرسوں جمائی تھی جبکہ
میں نے بار بار کہا تھا کہ خوب سوچ سمجھ لو اور اب بھی
وہی غلطی پھر دہرانے چلے ہو تم لوگ۔ بیٹا ہے تو بیوی کو
چھوڑ کے آگیا اور ماں الٹی پٹی پڑھا رہی ہے کہ فوراً
چھوڑ دو اسے۔ ارے ایسا کب ہوتا ہے شریف لوگوں
میں۔ مسئلے مسائل کون سے گھر میں نہیں ہوتے۔
انہیں بیٹھ کر سلجھایا جاتا ہے نہ کہ رشتے توڑ دیے
جاتے ہیں۔ گھر بنانے میں برسوں لگ جاتے ہیں اور
بگڑنے پہ آئے تو لمحہ بھی نہیں لگتا۔“

ماموں تو بہت سی جذباتی ہو گئے۔
”ہاں تو آپ بتادیں حل۔“ مامی جی نے طنز لہجے
میں کہا۔

”میں فون کروں گا۔ بہن جی کو۔“
”بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں اب اس عورت
سے کسی قسم کا رابطہ پسند نہیں کرتا نہ اپنا نہ آپ کا۔
اور اگر آپ نے ایسا کیا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سنجیدگی سے ماموں سے کہا۔



کرنے لگا۔
”علی مجھے معاف کر دیں پلیز! مامی کا کوئی غلط مطلب
نہیں تھا، یقین کریں وہ چاہتی تھیں کہ میں اتنی جلدی
ان ذمہ داریوں میں نہ پڑوں۔“

وہ زور زور سے روتے ہوئے بولی۔ مامی نے بھی
اثبات میں سر ہلایا۔

”بہر حال میں اب مزید ایک بل بھی یہاں رکنے
کے حق میں نہیں ہوں۔ تمہیں بھی آخری موقع دے
رہا ہوں کہ ابھی کے ابھی میرے ساتھ تم یہ گھر چھوڑ کر
چل رہی ہو۔“ اس کے ایسے سنگین الفاظ و لہجے پر وہ
دونوں زرد پڑ گئیں۔

”علی! بس کہہ رہی ہوں ناں کہ مامی۔“

”مامی، مامی، مامی۔ اجیرن کر کے رکھ دیا اس لفظ اور
اس عورت نے میری زندگی کو۔ میں اس کی موجودگی
میں ایک بل بھی زندگی کی کوئی خوشی محسوس نہیں
کر سکتا، تمہیں چلنا ہے تو بتاؤ۔“

انشرح نے ایک نظر علی اور دوسری ساکت کھڑی
مامی کے چہرے پر ڈالی بجن کے چہرے پر کھنڈا دکھ اس
قدر واضح تھا کہ وہ بے ساختہ ان کے پاس آئی۔

”مامی! آپ ہی کچھ بولیں ناں۔ علی کو سمجھائیں کہ
وہ جیسا سمجھ رہے ہیں ویسا نہیں ہے۔“

علی سے اس سے زیادہ برواشت کرنا ناممکن نہ تھا
سو وہ ایک نظر ان دونوں کے جذباتی مظاہرے پر ڈال کر
گھر سے باہر نکل آیا۔ حسن کو اس نے ایمر جیسی کا بتا کر
اپنی پندرہ دن کی چھٹی منظور کرانے کا کہہ کر فون آف
کر دیا تھا اور خود بس اسٹاپ تک آگیا۔

اس بل اسے صرف ایک جذباتی سہارے کی
ضرورت تھی جو یقیناً اسے ماموں اور مامی جی کی
پر شفقت پناہ میں ہی مل سکتا تھا۔ چار گھنٹے کے تھکا
دینے والے سفر کے بعد وہ گھر پہنچا تھا۔ سب ہی اس
سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بھائی دونوں اپنے
آفس میں تھے۔ ایک بھابھی گھر پر اور ایک اپنی ماں کے
گھر پر تھیں۔

ماموں، مامی جی کو سامنے دیکھ کر وہ بری طرح بکھر گیا
اصل دکھ اسے انشرح کے رویے اور رد عمل پر ہوا

تھا، ہر بار اس نے اپنی مٹی کو علی پر ترجیح دی تھی اور جب اس نے اسے ساتھ چلنے کو کہا تھا اسے تو کچھ سوچے بغیر اس کے ساتھ چل پڑنا چاہیے تھا۔ کیسے وہ اپنی مٹی کے پہلو میں جا کر گڑ گڑانے لگی تھی مٹی گویا علی کی اہمیت اس کے نزدیک بالکل بھی نہ ہو۔ وہ منظر بار بار اس کی نظر میں آکر اس کی ناراضگی کی شدت کو بڑھا جاتا۔

ماموں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ چلتے ہیں اور دونوں فریقین کی سن کر فیصلہ کریں گے کہ مل بیٹھ کر معاملے سلجھائے جاسکتے ہیں پروماتھ کے آلے کی طرح اکر گیا تھا۔

”نہیں ماموں! اس نے میری انا کو چوٹ پہنچائی ہے میں اب بھی اسے زندگی میں لانے کو تیار ہوں پر اب کی بار وہ مجھے پکارے گی۔“

اس نے ماموں سے کہہ کر۔ بھاگ دوڑ کر کے ایک ماہ کے اندر اندر اپنا ٹرانسفر اس شہر کی برانچ میں کرالیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ حسن سے بھی گریزاں تھا اور اس نے وہ نمبر بھی تبدیل کر دیا تھا کہ اس شہر سے صرف دو گھر اور بے زاری کا رشتہ تھا اس کا۔ مامی اس کی بے زاری گم صدمہ انداز دیکھ کر روزانہ ماموں سے بحث کرتیں۔ اس کی منتیں کرتیں کہ وہ اس کو ایسا نہیں دیکھ سکتیں اگر وہ انشراح کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے تو اسی کو جا کر لے آئے یا انہیں ہی جانے دے یا اس سے رشتہ توڑ کر جینا چاہتا ہے تو وہ کسی دوسری جگہ اس کی شادی کر لوں گی پر ان کی بات سنتے ہی وہ وہاں سے اٹھ کر چل دیتا۔

پھر وہ بھی ایسا ہی بے زار دن تھا جب وہ آفس کے کالم میں مصروف تھا کہ ٹیبل بجا کر اسے کسی نے متوجہ کیا تھا۔

”حسن۔ تو۔!“ کتنی در حیرت سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کے گلے لگ گیا کہ اس کو یہاں دیکھنے کی توقع نہیں تھی۔

”بس بس رہنے دے میری یہ منہ دیکھ کی محبت۔ تیرے گھر لو جھکڑے اپنی جگہ پر میں تو دوست تھا ناں

تیرا۔“ وہ سخت ناراض تھا۔

”بس یار میں اس شہر کی ہواؤں سے بھی خفا ہو گیا ہوں یوں سمجھ دو نہ تیرے سوا کون ہمدرد تھا میرا وہاں۔“ اس نے یاسیت سے کہا۔

”اسی لیے مجھے بناتائے چلا آیا۔“ وہ طنزاً گویا ہوا۔ چل باقی گلے شکوے گھر چل کر کر لیں گے۔“ وہ سامان سمیٹتا ہوا بولا، پھر ایڈمن کو بتا کر حسن کو گھر لیے چلا آیا۔ پھر اسے ٹھنک کر وہیں رک جانا پڑا تھا کہ وہ دیکھن جان سامنے ہی مامی جی کے پہلو سے چپکی بیٹھی تھی۔ دل میں موجود ساری خفگی کہیں ہوا بن کر اڑ گئی پر دوسرے صوفے پر نظر پڑتے ہی مٹی کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ”چل آگے چل، ابھی اور بڑے بڑے جھٹکے لگنے ہیں تجھے۔“ حسن نے ٹھوکا دیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”تم یہ سب کیا ہے؟“ وہ الجھ گیا اسی اثناء میں ماموں جی کی نظر ان پر پڑ چکی تھی۔

”حسن! لے آؤ بھی ناراض ہیرو کو۔ اس کی بیگم سے زیادہ اس کے ساس سسر اس سے ملنے کو بے چین ہیں۔“

ماموں خوش دلی سے بولے تو ان کے جملے پر الجھتا وہ اندر چلا آیا۔ واقعی حیرت کے جھٹکے اتنے شدید تھے کہ اسے مٹی کی سائیڈ میں بیٹھے ڈاکٹر صاحب تو نظر ہی نہ آئے تھے پھر مٹی کا نسبتاً سجا سنورا روپ۔ وہ آہستہ سے سب کو مشترکہ سلام کرنا ماموں کے پاس آ بیٹھا جبکہ حسن نے ڈاکٹر صاحب کے پاس جگہ بنالی۔ اچانک اس کی نگاہ انشراح پر پڑی وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظر ملنے پر۔۔۔ اس نے ان آنکھوں میں پانی کی چمک محسوس کی جو اسے بہت پیاری تھیں۔

”علی بیٹا!“ مٹی کی نرم آواز پر وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ ”دانتہ یا نادانتہ مجھ سے بہت سی غلطیاں ہو میں پر انسان کے ہر عمل کے پیچھے کچھ اسباب ہوا کرتے ہیں جو اگر تم جان جاتے تو ہو سکتا ہے میری انٹی سے محبت کو صحیح جج کہاتے پر خدا گواہ ہے میرا مقصد اپنی بیٹی کا گھر اجاڑنا ہرگز نہیں تھا۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”ہاں بیٹا! اب یہ تمہاری صرف ساس ہی نہیں چچی بھی ہیں اور ہم سب اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ کسی جھمی ناخوشگوار واقعے کے بغیر سب ٹھیک ہونے کو ہے اور اس سب کو ٹھیک کرتے کرتے بھی تین ماہ تو لگ ہی گئے۔ تمہاری آنٹی اور میں عمرہ کی نیک سعادت کے لیے جارہے ہیں۔ تمہاری امانت بھی ہمارے پاس وہی لوٹانے آئے تھے اور تمہاری خوشیوں کی نوید دینے۔ ہمارے حق میں دعا کرنا کہ زندگی کے اس سفر میں انسانوں سے ڈسے دو لوگوں نے تھک کر جہاں پڑا وہ ڈالا ہے وہاں ان کے لیے خوشی اور سکون ہو۔“

انکل اس کے ایک طرف اور می دوسری طرف بیٹھ گئی تھیں۔ وہ سر کو جھکائے بیٹھا تھا۔

”تم نے مجھے معاف نہیں کیا ناں علی!“ می ایک دم ہی رونے لگیں۔ وہ بری طرح سے بوکھلا گیا۔

”ارے نہیں، نہیں آنٹی! بخدا میں تو اپنے اس دن کے الفاظ اور لہجے پر پچھتا رہا ہوں جو غصے میں میرے منہ سے نکلے۔ میں سوچ سکتا ہوں کہ آپ کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔“ وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔

”مائیں تو اولاد کی بڑی بڑی لغزش معاف کر دیتی ہیں۔ تم نے جو کہا اس میں ہر حال کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں۔ شدت پسندی ہر چیز میں نقصان دیتی ہے۔ رشتوں میں ہو یا رویوں میں یہ بات میں نے جان لی ہے۔“ ان کے کہنے پر علی کو جیسے کرنٹ سا لگا یا اللہ یہ کایا پلٹ کسے ہو گئی۔

”اور علی! مجھے اگر انشراح کی طرح پاپا کہو گے تو زیادہ خوشی ہوگی کہ ہم دونوں ہی رشتوں کے ترسے لوگ ہیں۔“ انکل نے اس کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا۔

پھر حسن نے ہی موقع پا کر اس کو بتایا کہ اس کے گھر چھوڑ کر چلے آنے پر انشراح نے مذمہ دار اپنی می کو ٹھہرایا تھا جس سے وہ بے حد بیمار پڑ گئی، تھیں پھر ایسے مشکل وقت میں انکل ہی تھے جنہوں نے دونوں طرف کا محاذ سنبھالا تھا۔ می میرا مطلب ہے آنٹی اور ان کے حالات سے متاثر تو پہلے ہی ہو چکے تھے، شدت سے ان کی بیماری کے ساتھ نفسیاتی علاج بھی شروع کیا آنٹی کا

علاج ابھی بھی جاری ہے، جس روز ان کی پہلی نفسیاتی گھر کھلی انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا کہ واقعی ان کی شدت پسندی اور بے جا دخل اندازی ان کی بیٹی کے گھر کو خراب کر رہی تھی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد انکل نے آنٹی کو پروپوز کیا پھر ان کو قائل کرنے کا ایک کڑا مرحلہ تھا، جو میں نے اور انشراح بھابھی نے سر کیا کہ انکل کی زبانی ان کی ذات کی تشنگی کے کئی پہلو سامنے آئے تھے۔ انہیں حقیقت میں کوئی ایسا سہارا چاہیے تھا جو ان کی ساری محرومیاں مٹا کر ان کا دامن خوشیوں سے بھر دے، ایسا بھلا انکل کے سوا کون ہو سکتا تھا کہ آنٹی کی زندگی میں جو لوگ آئے انہوں نے ان سے صرف دکھ ہی اٹھایا تھا، کچھ ہی حال انکل کا تھا، ایسی عورت کا ساتھ ملا تھا انہیں کہ جو ان سے زیادہ دولت مند دیکھ کر اسی پر رعبہ گئی تھی، پھر اس نے انکل سے خود طلاق لے لی تھی۔ بہت سی قدریں مشترک نہ ہوتے ہوئے بھی مشترک تھیں۔ آنٹی جی ہرگز نہ مانتیں پر انشراح بھابھی کی دودن کی بھوک ہڑتال نے ان کی ناں کوہاں میں بدل دیا۔“ پھر می جی کے چہرے پر شہری مدہم سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ سب جان گئے تھے کہ اب خوشیاں انہیں اپنے بروں میں سمیٹ لینے کو تھیں۔ اسی شام کو ڈاکٹر انکل اور می کو ایئر پورٹ چھوڑ کر وہ اور حسن واپس آ گئے۔ ڈاکٹر انکل اور می عمرہ کی ادائیگی کے لیے جارہے تھے۔ نکاح کے بعد وہ می کو مستقل اپنے گھر لے گئے تھے انشراح بھی کچھ دن ان کے ساتھ رہی تھی پھر ان دونوں ماں بیٹی نے جانا تھا کہ گھر کا سکون کیا ہوتا ہے اور انشراح نے جو باب کی شفقت اور محبت کے قصے کتابوں میں پڑھ رکھے تھے ان کو حقیقی زندگی میں برت لیا تھا۔

حسن کو بس اسٹاپ برڈراب کر کے وہ سیٹی پر شوخ سی دھن بجاتا ہوا ڈرائیو گر رہا تھا کہ آج واپسی کے سفر میں اس کے لیے اداسی نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کی ناراض انشراح اس کی مختصر تھی۔ جسے — مٹا کر اس نے زندگی سے وہ خوشیاں

کشید کرنی تھیں جو اپنی اپنی نادانیوں کے سبب وہ کھو چکے تھے۔



سعدی

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔ سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ خنین اور اسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی کی پھوپھی ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گروہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے جس کی بنا پر زمر اپنے بچے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بست بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی ہاشم کی پھوپھی کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

مکمل ناول





والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا رڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی، ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نو شیراں سے جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے، بھانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا کی سالگرہ دے دیتی ہے۔ پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پر فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نو شیراں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے اباز مرکویہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گروہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔ نو شیراں ایک بار پھر ڈرگزلینے لگتا ہے اس بات پر جو اہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پر فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیماج ہو جاتی ہیں۔ سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر ”آئس ایور آفٹر“ لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے درجینیا ہے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کمالی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس، زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لا پرواہی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بد تمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی، ہاشم کے خلاف مٹی لاندزنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا پاس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم، خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سکٹلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم، خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث، فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم، فارس پر ڈلواتا ہے۔

زمر تاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زمر تاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی، زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوتی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً ”بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔ حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زمر تاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ مگر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں، جس کی بنا پر زمر کو

دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات 'زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے اسی وقت زمر کا منگیترا اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیترا کو اپنی گاڑی میں بٹھالتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی 'فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکا لرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر رہنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گروہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گروہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی 'علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گروہ زمر کو دے رہی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گروہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گروہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کا رددار تنگ پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم 'علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایک سیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات 'زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیترا حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چر کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات 'زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوا دیا تھا جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر جواہرات کے اکسائے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تادان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم اگر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئیے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اٹھانے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔

سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

”مثلاً“ کون؟“ زمر نے پوچھا۔

”مثلاً“... مثلاً“ ہاشم کا دروازہ۔“ سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن ہی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کا دروازہ کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی، زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلیجی کا نام دیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین، علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد دیتی ہے۔

ریحان خلیجی عدالت میں زمر کو جواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا، حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب، نوشیرواں کو علاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جو اہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

دسویں قسط

”عقد“

زندہ! میں!

بڑا ہی لالہ بلی وقت تھا
جی ہو گیا ایک مشتعل بچہ!

وہ خائن وقت کی کچھ بددیانت ساعتیں ہوں گی
میرے اندر کا ”میں“ محبوس کر ڈالا گیا، پُر ہول

پاکستان ڈائجسٹ 176 مئی 2015ء

درِ زنداں میں مقفل کر کے چابی قلم لولاک میں پھینکی
کیس تو وسعتِ افلاک میں پھینکی
وہ چابی اب نہیں ملتی!
مقفل در نہیں کھلتا!
مجھے تو خود سے ملنا تھا۔

میں کب تک وسعتِ افلاک چھانوں گا؟
کہاں تک دھند میں کھوئے ہوئے آفاق چھانوں گا؟
(سید نصیر شاہ)

سبزہ زار پہ میری اینجیو کھڑی ابھی تک سعدی
سے بات کر رہی تھی۔ جواہرات سینے پہ بازو لپیٹے چلتی
قریب آئی تو آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔
”میرا خیال ہے“ بلکہ جتنا تمہارے بیٹے کے کینسر کو
میں نے ریسرچ کیا ہے، وہ آپریشن کے بعد ٹھیک ہو
جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ بیماری کا جلد علم ہو جاتا تو
اچھی بات۔“ وہ اسے تسلی دیتے مڑا تو جواہرات اور
شیرد آتے دکھائی دیے۔ سعدی نری سے مسکرایا اور
سر کو خم دے کر سلام کیا۔

”مسز کاردار! آپ کو پہلے سے بہتر دیکھ کر خوشی
ہوئی۔“

”ان دنوں میں اتنی دفعہ دیکھ چکے ہو، فرق تو نظر آیا
ہو گا۔“ وہ بظاہر مسکرائی اور عین اس کے سامنے آ
رکی۔ سعدی کو۔۔۔ کچھ محسوس ہوا۔ نگاہیں جواہرات
کے کندھے کے پیچھے شیرد تک گئیں، جو شفر سے اسے
گھور رہا تھا۔

”پوچھ سکتی ہوں میری ملازمہ سے کیا بات ہو رہی

تھی؟“ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی مگر آنکھوں سے
شعلوں کی لپٹیں اٹھ اٹھ کر باہر کو آتی تھیں۔

”میری نے مجھے بتایا تھا اپنے بیٹے کے کینسر کے
بارے میں۔ میں نے اس کو انٹرنیٹ پہ سرچ کیا تو۔۔۔“

”یہ ہاشم کو بتانے والے مسئلے ہیں میری اینجیو، یا
گھر آنے والے ہر دوسرے شخص کو؟“ مسکراتی مگر

سلگتی آنکھوں سے میری کو گھورا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑا۔
وہ سوری کہتی، ندامت سے سر جھکائے اٹھے قدموں مڑ
گئی۔ سعدی کی مسکراہٹ سمٹی۔ اچنبھے سے
جواہرات کو دیکھا۔

”آئی ایم سوری مسز کاردار! میں آپ کی خیریت
پوچھنے آیا تھا اور۔۔۔“

”خیریت پوچھنے یا یہ معلوم کرنے کہ اورنگ وصیت
میں تمہاری بہن کے نام کچھ چھوڑ کر تو نہیں گئے؟“
سعدی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”جی؟“ اس نے
بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھا۔

”میرے بیٹے کے خلاف اس کے باپ کے کان
بھرتے وقت تمہاری بہن نے ذرا احساس نہیں کیا کہ
یہ صدمہ اورنگ زیب کی جان لے سکتا ہے؟ بلکہ
صرف وہی کیوں، تم دونوں شامل تھے نا اس ڈرامے
میں! کیا سوچا تھا؟ اپنے بیٹے کو دس اون کر کے اپنی
جائیداد تم لوگوں کے نام لکھ جائے گا وہ؟“ مسکراہٹ
ہنوز لبوں پہ تھی، مگر آواز غصے سے بلند ہو رہی تھی۔

”مسز کاردار! آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کیا
کہہ رہی ہیں۔“ سعدی نے ناگواری سے انہیں ٹوکا۔
جواہرات کی آنکھوں کی رگیں گلابی پڑنے لگیں۔ سینے
پہ باندھ پیٹے وہ دو قدم مزید آگے آئی۔

”کیا تھا اگر تم دونوں اورنگ زیب کے بجائے مجھے یا
ہاشم کو تنہائی میں وہ سب بتا دیتے، مگر تم نے ذرا اس
شخص کا احساس نہیں کیا؟ اس کو اندر ہی اندر یہ غم کھا
گیا سعدی! اور وہ اس حالت میں مرا کہ اپنے بیٹے سے
ناراض تھا اور اس سب کے ذمہ دار تم ہو۔“ اس بات
پہ سعدی نے فوراً ”سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”جی ہاں بالکل“ اپنے آپ کو اغوا بھی میں نے کیا تھا

اور جھوٹ بول کر باپ سے پیسے بھی میں نے مانگے تھے
نا۔“ وہ تنے ابرو کے ساتھ ناگواری سے بولا تو جواہرات
لمحے بھر کو چپ ہوئی۔

”اے۔۔۔ میرے باپ کا نام بھی نہ لینا۔“ نوشیرواں
نے سرخ ریتے چہرے کے ساتھ انگلی اٹھا کر تنبیہ

کی۔ ”تم لوگوں نے ان کو میرے خلاف درغلایا تھا“ اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”میں معافی مانگ بھی نہیں رہا۔ میں صرف مسز کاردار کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔“ وہ بمشکل ضبط کر پایا۔

”میری طبیعت دیکھ لی تم نے؟ میرا شوہر اس حالت میں مرا کہ وہ شیرو کو ڈس اون کرنے والا تھا۔ دیکھ لیا ہم کتنی اذیت میں ہیں؟“

نو شیرواں نے قدرے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ سعدی کو دیکھتی تکلیف اور برہمی سے کہہ رہی تھی۔

”اس سے پہلے بھی تم شیرو کی زندگی تنگ کرتے رہے ہو، مگر اس دفعہ تم لوگوں نے حد کر دی سعدی!“

یہ آخری فقرہ شیرو کو دیکھ کر ادا کیا، جس پہ اس کا غصہ مزید بڑھا اور اس نے نفرت سے (ہونہ) سر جھٹکا۔

سعدی نے ایک ناپسندیدہ نظردوئوں پہ ڈالی۔ سر کو خم دیا (بہت اچھا)۔ دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر نو شیرواں کو مخاطب کیا۔

”تم نے کبھی وہ کچرے کے ڈبے دیکھے ہیں نو شیرواں! جو سڑک کنارے نصب ہوتے ہیں۔ ان پہ لکھا ہوتا ہے ‘Use Me’۔ تم نے بھی خود پہ کی حروف لکھوا رکھے ہیں۔ جو بھی آئے اپنا کچرا صاف کرنے کے لیے تمہیں استعمال کرے (جواہرات پہ تیز نظر ڈالی) اور چلا جائے۔ سو میں مزید آپ کے ان گیمز کا حصہ نہیں بن سکتا۔ اللہ حافظ۔“

وہ مڑا اور مخالف سمت چلتا گیا، اور جب تک نو شیرواں کو اس کا طنز سمجھ آیا وہ دور جا چکا تھا۔

”الو کا۔۔۔“ وہ مٹھیاں بچھینچ کر رہ گیا۔ ”اگر یہ دوبارہ ادھر آیا نامی تو۔۔۔“

”اگر غیرت ہوگی تو دوبارہ اس گھر میں داخل نہیں

ہوگا“ اور اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ غیرت والوں میں سب سے زیادہ غیرت والا ہے۔“

جواہرات اذیت سے مسکراتی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ نو شیرواں کے اندر کی آگ ٹھنڈی ہونے

لگی۔ ڈھیلے پڑتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور مڑنے لگا، پھر ایک رکا۔

”وہ آپ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا تھا نا؟ ڈیڈ مجھے ڈس اون تو نہیں کرنے لگے تھے نا؟“

جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا جو قدرے تذبذب، مگر امید سے اسے دیکھ رہا تھا۔

جواہرات کی مسکراہٹ پھسکی پڑی، آنکھوں کی سفیدی گلابی ہوئی۔ نم گلابی۔

”نہیں، وہ تمہیں۔۔۔ نہیں کبھی ڈس اون نہیں کر سکتے تھے۔ یہ میں نے صرف۔۔۔ بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا تھا۔“

اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔ بہت سے آنسو اندر اٹارے۔ نو شیرواں پر سکون سا ہو کر آگے بڑھ گیا۔ جواہرات نے ہاتھوں کی نمی چھپانے کے لیے مٹھیاں بند کر لیں۔ پھر گردن موڑ کر برآمدے میں کھڑی میری کو دیکھا۔ اس کا کیا کرے؟ اصل گواہ جو خود بھی اپنی گواہی سے لاعلم تھا، وہ تو ابھی ادھر ہی تھا۔



ترک تعلقات کوئی مسئلہ نہیں یہ تو وہ راستہ ہے کہ بس چل پڑے کوئی سعدی سرخ کانوں اور تنے تاثرات کے ساتھ قصر کاردار کے داخلی گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا، تاکہ اپنی کار تک جائے کہ سامنے سے زمر کی کار آتی دکھائی دی۔ وہ قدم قدم چلتا سڑک پہ جا کھڑا ہوا۔ پہاڑی پہ مل کھاتی سڑک ویران تھی۔ ارد گرد کو سوں کے فاصلے پہ اونچے محلات تھے، جو کاردار ز کے قصر کی مانند وسیع سبزہ زار میں گھرے تھے، سو اس سڑک سے آس پاس کی محض دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ زمر نے کار وہیں روک دی۔ اسے اشارہ کیا۔ وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آ بیٹھا۔

”آپ ادھر کیسے؟“

”جنازے کے بعد دوبارہ آ نہیں سکی، سواب مسز کاردار کے لیے آئی تھی۔ وہ ہسپتال میں مجھے وزٹ

کرنے اکثر آتی تھیں، میرا آنا بنتا ہے۔ "خشک" سپاٹ انداز میں، دندا سکرین کے پار دیکھتے وضاحت دی۔ سعدی نے ڈیش بورڈ پہ نظریں جمائے انتظار کیا کہ وہ شاید کہے (جب تم میرے پاس نہیں تھے تب وہ آتی تھیں) مگر وہ گلہ ہی تو نہیں کرتی تھی۔

"اور تم ادھر کیسے؟" چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تو سعدی نے بھی اس کی جانب گردن پھیری۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے عہد کر رکھا تھا کہ دل کی بات نہیں کہنی۔

"مسز کاردار کو دیکھنے آیا تھا اور اب اچھے سے دیکھ چکا ہوں۔ سو واپسی کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔"

زمر چند لمحے خاموش رہی۔ پھر نرمی سے کہنے لگی۔ "میں نے معلوم کیا تھا، ہاشم اس کیس میں ملوث نہیں ہے۔ کم از کم بظاہر تو نہیں ہے۔"

"خود معلوم کیا یا کسی اور نے کر کے دیا؟ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا، کیونکہ اس کے نزدیک دونوں میں اتنا فرق تھا جتنا پہلے اور ساتویں آسمان میں۔"

"خود نہیں کیا مگر۔" وہ رکی "بصیرت صاحب نے اسے چیک کیا تھا، اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اس معاملے سے، مگر تم بتاؤ، تمہیں ایسا کیوں لگا کہ ہاشم اس میں ملوث ہو سکتا ہے؟"

"مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگا۔ بس جس کا نام منہ میں آیا بول گیا۔ آئی ایم سوری، مجھے یوں کسی پہ الزام نہیں لگانا چاہیے تھا۔" اس نے سادگی سے معذرت کر لی۔ زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

"تم نے اس کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی، میں اتنے دن اس کی پوچھ گچھ کرواتی پھر رہی تھی اور اب تم کہہ رہے ہو کہ تم نے یونہی کہہ دیا تھا؟" شدید غصے کو بمشکل اس نے ضبط کیا۔ تو وہ سارے دن جو اس نے فارس کے حق میں کوئی بھی بات ڈھونڈنے میں صرف کیے وہ سب ایک مذاق تھا؟

"میری سمجھ میں نہیں آیا کس کا نام لوں۔ بس ان کا لے لیا۔ یہ لوگ۔" انگلی سے قصر کاردار کی جانب اشارہ کیا "اب میرے ساتھ پہلے کی طرح برتاؤ نہیں

کرتے۔ مجھے شاید اسی بات کا غصہ تھا۔" وہ بمشکل ضبط کرتی اسے گھورتی رہی۔ اس نے ندامت سے سر جھکا دیا۔ آہستہ سے بولا۔ "سوری!"

"اور تم نے ہاشم سے یہ کیوں کہا کہ وہ آڈیو میں نے نکلوا کر دی تھی؟" سعدی نے جھٹکے سے سراٹھایا۔

"یعنی انہوں نے آپ سے پوچھا؟" تو پھر کیا کہا آپ نے؟

"جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔"

"معلوم ہے۔ تب ہی یہ کہا تھا۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے اس نے سوچا تھا۔

"میں ان سے خفا تھا، کیونکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح فارس ماموں کو قاتل خیال کرتے ہیں، اور اب چونکہ میں ماموں کے لیے کوشش کر رہا ہوں، تو وہ مجھ سے خفا ہیں۔ مگر مجھے اچھا لگا کہ آپ نے میرا مان رکھا۔ اور آپ ماموں سے ملنے جیل گئیں، اس کے لیے شکریہ۔"

"کیا تمہارے ماموں نے تمہیں یہ بتایا کہ اس نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑنے کی کوشش کی؟"

سعدی کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ "کیا مطلب؟"

زمر نے محض چند فقرے تفصیل بتانے سے ضائع کیے، جس کے بعد سعدی کی رنگت زرد پڑتی چلی گئی۔

"آئی ایم شیور پھیپھو! کوئی غلط فہمی ہو گی ورنہ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ میں ان سے۔"

"سعدی! میں تھک گئی ہوں!" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کو بولنے سے روکا۔ "میں نے اس کیس سے بھی خود کو الگ کر لیا ہے۔ میں مزید فارس کے مسللوں میں نہیں الجھنا چاہتی۔ پھر بھی میں دوبارہ ابھی۔ اتنے دن میں نے پہلی دفعہ فرض کرنا شروع کیا

کہ وہ بے گناہ ہو سکتا ہے، مگر اس نے پھر وہی کام کیا۔

مجھے مزید مت سمجھاؤ۔ اپنے ماموں کو سمجھاؤ کہ خدا را

اپنے اور دوسروں کے اوپر رحم کرے۔ مجھے مزید مت

ستائے۔ میں نے اس کا کیس خود پر اسکیوٹ نہیں کیا،

میں اب کوئی بھی دائیں لے سکتی ہوں اور کیا چاہتے ہو
میں لوگ مجھ سے اب میرا دل کتنا ہے کہ وہی میرا مجرم
ہو تو مجھ کو زیادتی اس کو بے گناہ کہنے پہ مجبور مت
کر۔ میں نے کوئی بھی نہیں ہر چیز ایک طرف
رہ کر اس کے پاس گئی۔ اس کے لیے ہاسم کو بھی مشتبہ
نہ لایا۔ مگر اس نے پھر وہی کیا۔

وہ کتنی ہی دیر چپ بیٹھا رہا۔ سر ہٹا کئے۔ پھر آہستہ
سے ہٹا۔

”آئی ایم سوری۔ مجھے آپ کو ان کے پاس جانے
کے لیے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ آپ کی تکلیف ہم میں
سب سے زیادہ ہے۔ وہ جیل سے چھوٹ جائیں
تب بھی نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں“ آپ نہیں شروع
کر سکتیں۔ کم از کم اتنے آرام سے نہیں۔ آئی ایم
سوری۔ اب ہم اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔
لیکن۔“ اس نے چہرہ اٹھا کر امید سے زمر کو دیکھا۔
”مجھ سے ایک وعدہ کریں۔ ایک دن میں آؤں گا آپ
کے پاس ثبوت لے کر“ تب آپ کا مجھے سننا ہو گا اور
اگر وہ ثبوت قابل قبول ہوا تو اسے ماننا بھی ہو گا۔“

”شیوور!“ اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”میں
تو تم سے ہمیشہ کہتی رہی ہوں“ مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جو
میں مان بھی سکوں۔ تو میں ضرور مان لوں گی۔“ پھر وہ
چپ ہو گئی۔ ”سعدی میں تم سے پھر کہہ رہی ہوں“ اگر
کوئی ایسی بات ہے جو فارس کے حق میں جاتی ہو تو مجھے
بتاؤ۔ میں ایک دفعہ پھر اس کی یہ حرکت بھی نظر انداز کر
کے اس کے لیے کوشش کرنے کو تیار ہوں۔ اگر کوئی
تیسرا شخص ملوث ہے تو مجھے بتاؤ۔“

”نہیں پھپھو۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی
ایسی بات نہیں ہے۔ آپ جو سوچتی ہیں“ ابھی وہی
سوچتی رہیں۔ کچھ ملا مجھے تو آپ کے پاس ضرور آؤں
گا۔ آپ بس اپنا خیال رکھیں۔“

”میرے لیے افسردہ مت ہو بیٹا! میں ٹھیک
ہوں۔“ اس سے نگاہ ملائے بنا وہ ونڈا سکرین کے پار
دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ تکتا رہا۔

”آپ کی برتھ ڈے ہے اگلے مہینے میں نے ایک
کتاب آپ کے لیے رکھی ہے۔ ابھی وقت ملے تو
اسے پڑھیے گا۔ اس میں دل کی بیماریوں کی شفا ہے۔“
خاموشی دوبارہ دونوں کے بیچ چھائی ہو گئی۔ پھر زمر نے
اسے دیکھا وہ ہنوز اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ زمر کی نگاہیں
اس کے چہرے سے ہاتھوں پہ پھسلیں اور سیاہ کی چین
پہ آنکھیں جو اس نے انگلیوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ اس پہ
سنہرے حروف میں لکھا تھا۔

”Ants Everafter“

”نئی لی ہے؟“ کو کہ اب وہ تعلق نہیں رہا تھا نہ بے
تکلفی، نہ وہ بوجھ بیٹھتی۔ اس نے جواباً ”گردن جھکا کر کی
چین کو دیکھا“ نفی میں سر ہلادیا۔

”اونہوں۔ علیشائے حنین کو دی تھی۔ حنین کے
لیے اس کے ساتھ تکلیف دہ یادیں جڑی ہیں سو یہ
میں نے رکھ لی۔ آج صبح گھر سے نکلنے سے پہلے یونہی
حنہ کے کمرے میں گیا اور اٹھا لایا۔“ سیاہ ہیرے نما پتھر
انگلی پھیرتے وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔
بالخصوص یہ عبارت۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ اس کی آواز میں قدرے
زری در آئی تھی۔ پوچھتے ہوئے وہ اس کے چہرے کو
دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی بچہ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ
کر چلنا سکھایا تھا؟

”جب میں چھوٹا تھا پھپھو تو ابو کے ساتھ فجر پڑھنے
مسجد جایا کرتا تھا۔ تب وہاں مسجد کی دیوار پہ چھت سے
فرش تک چیونٹیوں کی قطار ہوتی تھی۔ ہر موسم میں
ہر گھڑی میں۔ تب ابو کہا کرتے تھے“ اگر مجھے کچھ ہو
جائے سعدی تو تم اپنے خاندان کا خیال رکھنا۔ بڑے ابا
ایک کمزور مرد ہیں مگر تمہیں بہادر بننا ہے۔ تم سعدی!
میرے بعد اس خاندان کے بڑے مرد ہو گے۔ اور
تمہارے خاندان کی عورتیں بوڑھے اور بچے یہ سب
چیونٹیوں کی طرح ہیں“ کمزور اور نازک۔ اور وہ یہ بھی

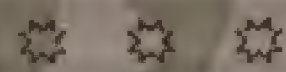
کہتے تھے کہ دنیا میں وہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں
بادشاہ اور چیونٹیاں۔ تم سعدی اپنی چیونٹیوں کو جوڑ کر

رکھنا۔ تم سعدی! میرے بعد اپنے خاندان کے سربراہ ہو گے۔" کی چین سے نظریں اٹھا کر اس نے اس مسراہٹ سے زمر کو دیکھا۔ "اور میں پچھلے کئی برس سے یہی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں" اور کرتا رہوں گا۔ آپ، 'حنہ'، امی، 'سب' ایک جیسی ہیں۔ چوئیاں اور معلوم ہے پھپھو، چوئیاں میں کیا قدر مشترک ہوتی ہے؟"

وہ کتنا پیارا بولتا تھا، معصوم اور سادہ۔ نگاہیں اس پہ جمائے زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس کی جانب جھکا اور آہستہ سے بولا۔

"وہ یہ کہ۔۔۔ ساری چوئیاں اندھی ہوتی ہیں۔" اور پھر اس نے لاک کھولا، دروازہ داکیا اور سلام کر کے باہر نکل گیا۔ زمر اس شیزنگ پہ ہاتھ رکھے کتنی دیر وہیں بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ لمحے بھر کو اس کا دل چاہا کہ اسے روک لے، مگر روکنے کے لیے کوئی بہانا نہیں تھا۔

اگلے ڈیڑھ سال تک اس نے سعدی کو نہیں دیکھا۔ نہ وہ اس کی موجودگی میں آیا، نہ وہ ان کے گھر گئی۔ یہاں تک کہ ہاشم نے ایک روز آکر اس سے کہا کہ وہ سعدی کو سوئی کی سالگرہ کا کارڈ دے آئے۔ اور چار سال بعد زمر کو یہ بہانہ مل گیا جس کی لاشعوری طور پہ اسے تلاش تھی۔



شوق اپنے بھی کیا نزلے ہیں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں
جس وقت زمر اور سعدی باہر کار میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، قصر کے اندر انے کمرے میں ادنیٰ کرسی پہ بیٹھی جواہرات، انگلی کی انگوٹھی گھماتے، سوچ میں محو تھی۔ کمرے کے کھلے دروازے سے لاؤنج میں نئی فلمینو لڑکی فیوٹابکٹ اور موپ لیے سیڑھیاں صاف کرتی نظر آرہی تھی۔

دفعتا "جواہرات نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملا

کرا بھی دروازہ بند کیا اور پھر فون کان سے لگایا۔
"جی ڈاکٹر آفتاب۔ کیا حال ہیں؟ فیملی کیسی ہے آپ کی؟"

"سب۔ ٹھیک ہیں مسز کاردار۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ پھیکا سا مسکرا کر بولے۔

"ہوں۔ ایم فائن۔" نخوت سے بولی، ذرا وقفہ دیا۔
"پوسٹ مارٹم رپورٹ بڑھ لی تھی میں نے۔ میں مطمئن ہوں۔ اب آپ مجھے بتائیں، کیا کوئی اور غیر مطمئن تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ لمحے بھر کو رکے۔ "ہاشم۔ اور ان کے سیکورٹی آفیسر خاور۔" ان دونوں نے مجھ سے پوچھا تھا، اور نگ زیب صاحب کے چہرے کے بارے میں۔

"کیا پوچھا تھا؟" اس کا سانس رک گیا۔
"کاردار صاحب کی موت سرکی چوٹ کی وجہ سے نہیں ہوئی، دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسموڈرنگ کے باعث ناک اور اس کے اطراف کا حصہ کافی سفید سا رہ گیا تھا۔"

"تو آپ نے کیا کہا؟" وہ جلدی سے بولی۔
"یہی کہ کاردار صاحب کا ایسٹھما بگڑا تھا، وہ اسی وجہ سے گرے تھے، اور چوٹ لگی، موت بھی اسی وجہ سے ہوئی۔ وہ دونوں ڈاکٹرز نہیں ہیں، مطمئن ہو گئے تھے، کیونکہ بہر حال کاردار صاحب کو شدید دمہ تو تھا ہی۔ ویسے بھی homicidal smothering کی تشخیص بہت مشکل سے ہو پاتی ہے۔ سو میں نے وہ بات سنبھال لی تھی۔ یہ ایک طبیعتی موت تھی۔"

جواہرات کی انگلی سانس بچال ہوئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند معمول کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔ پھر اٹھ کر دروازہ کھولا۔ فینوٹا صفائی کرتی اب آخری زینے تک آچکی تھی۔ جواہرات نے اسے ہلکے سے آواز دی۔ وہ چیزیں رکھ کر مووب سی جلی آئی۔

"ٹھنڈی ہوا آرہی ہے، دروازہ بند کر دو۔" وہ واپس کرسی پہ آن بیٹھی اور مسکراتی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ فینوٹا

182 مئی 2015

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY

اسی پوسٹ پر رہے گی اور آپ اسے نکال بھی نہیں سکتیں۔" قدرے مایوسی اور بے دلی سے کہتے اس کی آنکھیں پھر جھکیں۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اسے نکال نہیں سکتی۔ چاہوں تو ابھی نکال دوں۔ کھڑے کھڑے۔ مگر اس کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے۔"

"وجہ؟" فہنوٹا نے چونک کر اسے دیکھا۔ الجھن سے ابرو سکیڑے۔

"ہاں، جیسے چوری۔" بندے کو دو انگلیوں سے مسلتے وہ مسکرائی۔

"جس دن اس نے چوری کی وہ ڈی پورٹ کر دی جائے گی۔ اور مجھے معلوم ہے وہ جلد یا بدیر چوری ضرور کرے گی۔ اسے اپنے بچے کے علاج کے لیے پیسے درکار ہیں، تنخواہ سے بھی کئی گناہ زیادہ۔ جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ یہ پاکس۔" سنگھار میز پر رکھے ننھے سے جیولری پاکس کی جانب اشارہ کیا۔ "جس کا کوڈ میری تاریخ پیدائش سے کھلتا ہے اور اس میں میرا ایک قیمتی نیکلیس رکھا ہے تو کیا وہ خود کو روک پائے گی؟ اسے اس بارے میں سوچنا چاہیے، ہے نا۔ فی اوٹا؟" ٹھہر ٹھہر کر مسکرا کر اس کا نام ادا کیا۔

زمر کے آنے سے جب فہنوٹا مسز کاردار کے کمرے سے نکلی تو اس کی آنکھیں ایک انوکھے خیال سے چمک رہی تھیں۔



جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے
ہاشم کاردار کا آفس جس فلور پر تھا اس کی راہداری
اسپاٹ لائینس سے جگمگا رہی تھی، جب سعدی کی
لفٹ کا دروازہ کھلا۔ نکلنے سے قبل اس نے لفٹ کے
آئینے میں اپنا عکس دیکھا، ذرا کار کا گریبان کا اوپری بٹن
کھولا، سویٹر کے آستین اوپر چڑھائے، ماتھے پر ہاتھ مار
کر بال ذرا بکھیرے، پھر باہر نکلا۔ تیز قدموں سے
راہداری پار کی۔ لمحے بھر کو ہاشم کے آفس کے باہر بنے

سبک رفتاری سے دروازہ بند کر کے اس کے سامنے آ
کھڑی ہوئی۔ جواہرات نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ
سیاہ بالوں کی یونی بنائے۔ چینی نقوش والی خوش
شکل اور کم عمر لڑکی تھی۔

"کام میں دل لگ گیا ہے تمہارا؟"
"جی۔ میری اینجیو نے سب سکھا دیا ہے مجھے۔"
قدرے شرما کر بولی۔

"ہوں۔ پیچھے گھر میں کون ہوتا ہے تمہارے؟"
"ماں اور چار بہنیں، ایک بھائی۔ میں سب سے
بڑی ہوں۔" سر جھکائے اس نے لب کچلے آنکھوں
میں نمی آئی۔

"تمہاری تنخواہ سے ان کا گزر بسر اچھا ہوتا ہو گا مگر
بھائی کو پڑھانا، عزت دار نوکری دلوانا، یہ سب تو مشکل
ہو گا۔ ہوں؟" وہ اپنے کان کے بندے۔ انگلی پھیرتی
غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فہنوٹا نے جھکے سر کو
اثبات میں جنبش دی۔
"یہ تو ہے۔"

"کاش میں تمہاری تنخواہ برہا سکتی، مگر میری
انجیو ہیڈ اسٹاف ہے اور تم صرف ایک ماتحت میڈ۔
ہاں اگر تم میری اینجیو کی جگہ ہوتیں تو لاکھوں میں
کھیلتیں، لیکن۔" فہنوٹا نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔
امید اور خوف کے ملے جلے تاثر سے اسے دیکھا۔
"لیکن؟"

"اس کی پوزیشن پہ بچنے میں تو تمہیں سات آٹھ
سال لگ جائیں گے۔ اس کا اگلے تین سال تک کا
معائدہ رہتا ہے ہمارے خاندان سے۔ اور اس کی رو
سے میں اسے بے وجہ نکال نہیں سکتی۔" وہ رکی۔
فہنوٹا نے تابعداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی، وہ
بہت اچھا کام کرتی ہے۔"

"مگر وہ تمہاری طرح تیز اور پھرتلی نہیں ہے۔ اس
کو اپنے بچے کی فکر کھائے جاتی ہے، جس کو وہ فلیائن
میں چھوڑ آئی ہے۔ تم اس سے بہتر ہیڈ اسٹاف بن سکتی
ہو۔"

"مگر۔ یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ اگلے کئی سال تک

ڈیسک پر رکھا۔

”ہاشم اندر ہیں مس حلیمہ؟“ ڈیسک پر گلی نیم پلیٹ پر نظر ڈال کر سنجیدگی سے پوچھا۔ خوب صورت سی سیکرٹری نے ٹائپ کرتے ہاتھ روکے اور نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جی، مگر وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس لپاٹمنٹ ہے؟“

”ضرورت نہیں۔“ تلخی سے کہہ کر وہ آفس ڈور تک آیا اور دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہو گیا۔ حلیمہ ہڑبڑا کر پیچھے لپکی۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ بہت غصے سے وہ اس کی میز تک جا پہنچا۔ ہاشم، جو کوٹ پیچھے لٹکائے، شرٹ اور ویسٹ میں ملبوس بیٹھا فائل پر تجھے لکھ رہا تھا، اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر پیچھے آلی حلیمہ کو اور آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ رکی اور پھر پلٹ گئی۔ کرسی پر پیچھے کو ٹیک لگاتے، اس نے اب سنجیدگی سے سعدی کو دیکھا جو غصیلی آنکھوں اور سرخ کانوں کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ بنا کسی غصے یا تلخی کے ہاشم بولا تو آواز سخت تھی۔ اسے سعدی کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔

”یہ تو آپ بتائیں گے۔“ دونوں ہاتھ میز پر رکھے وہ سامنے کو جھکا۔ ”زمر کو کیوں بتایا جو حسین نے آپ کو بتایا تھا؟“

”کیا اتنی بڑی قیامت آگئی ہے سعدی کہ تم اپنے مہنر ز بھول گئے ہو؟“ اب کے اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ قلم میز پر رکھا۔ ٹالی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ٹیک لگاتے اس لڑکے کو دیکھا۔

”لعنت بھیجتا ہوں میں مہنر ز پر۔ مگر آپ کے مہنر ز کیا ہوئے جب حنا اور میرا اعتماد توڑا؟“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ زمر تم لوگوں کے لیے غیر ہے۔ بتانے کا شکریہ۔ اب میں کام کر لوں؟“ تلخی سے اس کو گھورتے سامنے فائلوں کے ڈھیر کی جانب اشارہ کیا۔ ”اور تم بھول گئے ہو تو یاد دلا دوں کہ میں اہم

معاملات میں الجھا ہوں اور اپنی تمام کمپنیز اور کارٹیل کی ان دنوں سربراہی کر رہا ہوں، کیونکہ میرا باپ سات دن پہلے مرا ہے۔“

”میرا باپ دس سال پہلے مرا تھا، اس لیے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم باپوں کو درمیان سے نکال کر بات کریں۔“ اس انداز پر ہاشم نے لب ”اوہ“ میں سکپٹرے، تعجب سے ابرو اٹھائے۔

”تو تم مجھ سے لڑنے آئے ہو؟“ اس نے زور سے فائل بند کر کے رے کی اور ڈھیروں غصہ ضبط کیا۔ سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔

”میری کیا مجال کہ میں آپ سے لڑوں؟ میں صرف آپ کو کنفرنٹ کرنے آیا ہوں اور کنفرنٹ کرنے کے لیے آپ کے آفس سے بہتر جگہ کوئی نہیں تھی۔ سو مجھے بتائیں، کیوں بات کی آپ نے زمر سے؟ انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا تھا اب کیسے دوبارہ کریں گی؟“ وہ کافی بدتمیزی سے کھڑا بول رہا تھا۔

”کیا میں نے تم سے جواب مانگا تھا جب تم نے میرے کیے وکیل کو فار کیا تھا؟“ وہ تلخی مگر ضبط سے بولا تو سعدی مزید بھڑک اٹھا۔

”مانگیں جواب۔ میں دوں گا ہر جواب۔“ ساتھ ہی میز پر زور سے ہاتھ مارا وہ انتہائی غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

”تو کیوں کیا میرے وکیل کو فار؟“

”کیوں کہ وہ وکیل بھی آپ جیسا تھا ہاشم بھائی۔ آپ کی طرح اسے بھی فارس غازی کی بے گناہی کا یقین نہیں تھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے، میں بچہ ہوں؟ انہوں!“ نفرت سے اسے دیکھتے سر نفی میں ہلایا۔

”میری سب سمجھ میں آگیا ہے۔“

”پھر؟ کیا کرو گے تم؟“ وہ اب بھی برہداشت کر رہا تھا۔

”میں آپ سب پر ثابت کروں گا کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیے تھے۔ آپ، زمر سب ایک جیسے ہیں۔ آپ سب نے ان کو اکیلا کر دیا ہے۔ اتنے سال میں آپ ایک دفعہ ان سے ملنے جیل نہیں گئے۔ لوگوں کی

خواتین ڈائجسٹ 184 مئی 2015

باتیں آپ کے دل میں بھی بیٹھ گئی ہیں اور آپ بھی۔
آپ بھی باقیوں کی طرح ہی ہیں۔ "نہتے ہوئے وہ بے
حد ہرٹ اور دکھی سا لگتا پیچھے ہٹا۔ ہاشم سختی اور
نا پسندیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وکیل کے بدلاؤ پہ باز پرس
کرنے پہ تم مجھ سے ایسے بات کرو گے تو میں اس ذکر کو
نہ چھیڑتا۔" ہاشم کا صدمہ اور غصہ حقیقی تھا۔

"مجھے آپ کی بات سے فرق نہیں پڑتا۔" وہ پیچھے
ہٹے مزید بلند آواز میں غصے سے بولا تھا۔ "آپ کا امیج
میری نظروں میں تباہ ہو چکا ہے۔ اس لیے بتادوں آپ
کے والد کے چہلم کا دعوت نامہ آیا تھا میں نہیں آؤں
گا، میرے گھر سے کوئی نہیں آئے گا۔ آئندہ ہمیں
کسی بھی دعوت پہ بلائے کی زحمت نہیں۔ یہ سمجھ گیا،
انکار سن کر آپ کو خود شرمندگی ہو گی۔" تنفر سے
جذباتی انداز میں کتاوہ مڑا اور باہر نکل گیا۔ دروازہ بند
کرتے اسے اندر کا منظر جو نظر آیا اس میں ہاشم غم و
غصے اور قدرے صدمے میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر
دروازہ بند کر دیا۔

راہداری میں چلتے سعدی نے گہری سانس لی۔
دانت بھڑکائے اور تنے اعصاب کو گویا ڈھیلا کیا۔ ہاتھ
اب بھی قدرے لرز رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔
لفٹ کے پاس رکا تو اس کے دھاتی دروازے میں اپنا
عکس دیکھتے خود کو شاباش دی۔

"اچھی پرفارمنس تھی سعدی! اگر جواہرات یہ نہ
کرتی تب بھی میں نے ان کے گھر نہ جانے کا کوئی تو
بہانہ ڈھونڈنا ہی تھا کہ اب ان کے ساتھ ایک میز پہ
کھانا کھانا، ہنس کر بات کرنا، سب عذاب تھا۔ ہر جگہ
وارث کا خون نظر آتا۔ سو اچھا کیا تم نے سعدی۔ اب
ہاشم بھائی کم از کم یہ نہیں جان سکیں گے کہ میں ان کی
اصلیت جانتا ہوں۔ اسے صرف اعتماد توڑنے کا غصہ
خیال کریں گے، اگر یہ نہ کرتا تو میرے کھنچے کھنچے
روپے سے وہ سمجھ جاتے۔ بہت اچھا کیا سعدی۔ روز
ان کی شکل نہ دیکھنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا! لفٹ میں کھڑے
اترائی کا سفر طے کرتے وہ خود کو نارمل کرتا، داد دے رہا

تھا۔ دل البتہ ویران سا تھا۔ آنکھوں میں بار بار نمی آتی
جسے وہ سوئیٹر کی آستین سے رگڑ لیتا۔



بھولنے والا لوٹ تو آیا
وقت مغرب یا عشاء کا تھا
چھوٹے باغیچے والے گھر میں کچن سے پکتے کھانے
کی مہک یوں پھیل رہی تھی جیسے پانی کے گلاس میں پکا
انک کا قلمرو پھیلتا ہے۔ ساری فضا اشتہا انگیز خوشبو
سے معطر ہو گئی تھی۔ ایسے میں حنین سعدی کے خالی
کمرے میں بے مقصد کرسی پہ بیٹھی تھی۔ کہنیاں میز
پہ رکائے، چہرہ ہتھیلیوں پہ گرا دیا۔ عینک اتار کر سائیڈ پہ
رکھ دی۔ کچھ دیر انگلی سے میز پہ لکیریں کھینچتی رہی۔
پھر کاٹیک چوکی۔

قریب میں سفید جلد والی کتاب رکھی تھی۔ ساتھ
ریپر اور کارڈ۔ سعدی وہ کتاب کسی کو تحفے میں دے رہا
تھا؟ اچھے سے اس نے کارڈ اٹھایا۔ سالگرہ کا کارڈ، زمر
کے نام۔ اوہ۔ پھپھو کی سالگرہ تھی نا چند دن بعد۔ تو
سعدی وہ کتاب زمر کو دینے جا رہا تھا۔ یہ وہی کتاب تھی،
جو برسوں پہلے اس نے ایک دفعہ یونہی کھول لی تھی۔
اب دوبارہ کھولی تو پہلے صفحے پہ ہاشم کا نام لکھا تھا۔ اس
نے نام پہ انگلی پھیری اور مسکرا دی۔ پھر بے مقصد صفحے
پلٹتی رہی۔ دلعتاً درمیان میں ایک ورق پہ رکی۔

سات سو برس پہلے کے زرد زمانوں کو جانا دروازہ
سامنے تھا۔ حنین نے رک کر سوچا کہ اندر جائے یا
نہیں، پھر بنا مزید کچھ سوچے اس نے ہاتھ بڑھایا اور
اسے دھکیلا۔ لکڑی کے قدیم منقش پٹ وا ہوئے۔
وہاں سے ڈھیروں روشنی کا سیلاب اُٹ آیا۔ اس کی
آنکھیں چندھیا گئیں۔

روشنی قدرے گھٹی تو اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر
ادھر ادھر دیکھا۔ وہ قدیم دمشق کے اس زرد سے مکان
کے باہر کھڑی تھی جو مسجد سے ملحقہ تھا۔ ایک زمانے
میں اس نے یہاں مجمع میں گھرے ایک "بیمار" کو دیکھا
تھا۔ آج یہاں ویرانی تھی۔ سناٹا تھا۔ زرد سی شام اتر

رہی تھی۔ روشنی اب ختم ہو چکی تھی۔ مکان کے اندر چراغ جل رہے تھے پاجامے، لمبی قمیص اور ہنٹو بینڈ لگے بالوں والی خنیں اس سارے زرد منظر نامے میں واحد رنگین شے تھی۔ اس نے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بالی کی چال چلتی، پھونک پھونک کر قدم رکھتی مکان کے اندر آئی۔ پہلے کمرے کا پردہ ہٹایا اور سر نیچا کر کے اندر داخل ہوئی۔

اس مطالعاتی کمرے میں جگہ جگہ دیے جل رہے تھے یا چند ایک موٹی موم بتیاں۔ دیوار میں بنے خانوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے فرش پہ دو زانو ہو کر شیخ معلم بیٹھے تھے اور چوکی پہ دھرے کورے پرچے پہ قلم سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھتے جا رہے تھے۔

وہ سینے پہ باند لیپٹے چوکھٹ میں کھڑی تنقیدی نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ پھر دل کڑا کر کے پکارا۔ ”کیا آپ نے اپنی کتاب ختم نہیں کی؟“ وہ سر جھکائے لکھتے رہے۔ خنیں نے آنکھیں ناراضی سے سکیریں۔ ارد گرد سب زردی مائل تھا جیسے پرانے زمانے کا رنٹ ہو اور ایک وہی کھر فل تھی۔ پھر قدم قدم چلتی قریب آئی۔ چوکی کے عین سامنے۔ سر ترچھا کر کے گویا جھانکا۔

”کیا آپ کی کتاب میں واقعی دل کی بیماریوں کا علاج ہے؟“ پوچھتے وقت شکل یوں بے نیاز بنائی گویا جواب میں دلچسپی نہ ہو، مگر ساری حسیات جواب پہ لگی تھیں۔

”ہر مرض کی دوا ہے۔ جو اسے جانتا ہے، وہ اسے جانتا ہے اور جو اسے نہیں جانتا۔“ سر جھکائے لکھتے ہوئے وہ بولے تھے۔

”آہ“ آپ کے زمانے کے مرض!“ اس نے گویا مایوسی سے ہاتھ جھاڑے۔ پھر سامنے بیٹھی، چوکی پہ کہنی رکھی اور ہتھیلی پہ تھوڑی گرائی۔

”طاغون اور دوسرے وبائی مرض ہمارے زمانے میں نہیں ہوتے۔ ہمارے مسئلے اور ہیں، یونہی۔ مگر نہیں،“ آپ کو کیا پتا۔“ پھر جیسے اسے غصہ آیا۔ تیوری چڑھا کر بولی۔ ”آپ سات سو سال قدیم کے ایک

بوڑھے ہیں۔ ایک نائو (naive) بوڑھے۔ آپ کو تو یہ تک نہیں معلوم کہ کمپیوٹر کیا ہوتا ہے، انٹرنیٹ کیا ہوتا ہے، ٹی وی شوز کسے کہتے ہیں۔ اور وہ زندگی کیسے تباہ کرتے ہیں۔ مگر نہیں۔ آف!“ جیسے کراہ کر سر جھٹکا۔ افسوس سے ان کو دیکھا۔

”آپ کی کتاب میری مدد نہیں کر سکتی، کیونکہ اس میں میرے کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

وہ ہنوز قلم سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھتے جا رہے تھے تو زنج ہو کر خنیں ان کے پرچے پہ جھکی۔ گردن ترچھی کر کے پڑھا۔

”اے ایمان والوں! بے شک خمر اور میسر اور انصاب اور ازلام شیطان کے گندے کاموں میں سے ہیں، پس ان سے بچو تاکہ تم نجات پاؤ۔“ خنیں نے سر اٹھایا، آنکھیں سکیر کر مشکوک نظروں سے ان کو دیکھا۔

”مجھے پتا ہے یہ آیت ہے، مطلب بھی پتا ہے۔ خمر ہوتی ہے شراب۔ میسر ہوتا ہے جوا۔

انصاب ہوتے ہیں بت اور ازلام۔“ آنکھیں میچ کر ذہن پہ زور دیا۔ ”ہاں“ قال کے تیر وغیرہ رائٹ؟

مگر اے شیخ! یہ میرے ملک کی میرے جیسی مڈل کلاس کی لڑکیوں پہ اپلائی نہیں ہوتا۔ نہایت افسوس سے ان کو دیکھتے تھی میں سر ہلایا۔ ”آپ کے زمانے میں ہوتے ہوں گے دمشق میں شراب کے منگے۔ وہ جیسے نسیم حجازی کے ناولز میں ہوتے تھے، ہم تو اس مشروب کا نام بھی نہیں لیتے، لیٹا پڑے تو انگریزی میں الکحل کہہ دیتے ہیں، انگریزی میں چیزیں کم بہودہ لگتی ہیں۔“

رازداری سے آگے ہو کر ان کو اطلاع دی۔ وہ سنے بغیر لکھتے جا رہے تھے۔

”بہر حال، شراب، جوا، بت، پانے، کسی سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں میرا۔ سو۔“ وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھی۔ ”آپ کی کتاب میرے کسی کام کی نہیں۔ جیسا

بازخواتین ڈائجسٹ 186 مئی 2015

کہ میں نے کہا، آپ سات سو برس پرانے ایک نائیو بوڑھے ہیں۔ ”قدرے مایوسی، قدرے خفگی سے وہ واپس جانے کو مڑی۔

دو زانو بیٹھے، قلم سے پرچے پہ لفظ اتارتے شیخ نے ہولے سے پکارا۔

”جب شراب حرام کی گئی تھی تو وہ برتن بھی توڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا جن میں وہ لی جاتی تھی۔“ وہ اس کو نہیں دیکھ رہے تھے، غالباً ”لکھتے ہوئے اونچا بول رہے تھے۔ حنین نے تاسف سے سر نفی میں ہلایا۔

”جیسا کہ میں نے کہا، آپ کے اور میرے زمانے کے مسائل مختلف ہیں۔“

قدیم دیوان خانے کی موم بتیاں ہنوز جھللا رہی تھیں۔ وہ ان کی مدھم روشنی میں راستہ بناتی آگے آئی اور چوکھٹ کا پردہ ہٹا دیا۔ دوسری جانب مہیب تاریکی تھی۔ اس نے تاریکی میں قدم رکھا اور۔۔۔ اور کتاب بند کر دی۔ سر اٹھایا تو بھائی کی اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی۔ کمرہ سفید ٹیوب لائٹ سے روشن تھا۔ لاؤنج سے بولنے کی آواز آرہی تھیں۔ حنین نے بے دلی سے کتاب واپس رکھی، اٹھی ہی تھی کہ سعدی اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر رکھا، پھر نظریں چرا کر الماری کی طرف چلا گیا۔

”ناراض ہیں آپ؟“ وہ بے قراری سے اس کے پیچھے آئی۔ چند لمحے وہ یونسی کھڑا رہا، پھر اس کی طرف گھوما۔

”نہیں میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“ گہری سانس لے کر بولا۔

”دل سے کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ وہ اس کے سامنے آیا۔ نرمی سے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ پہ بٹھایا اور قریب بیٹھا۔ وہ سر جھکائے اپنے گھٹنوں کو دیکھتی رہی۔

”تم کسی کی موت کی ذمہ دار نہیں ہو حنین اوسی پی صاحب کا بھی اتنا ہی قصور ہے جتنا تمہارا۔ ان کو تم پہ نہیں اللہ۔ بھروسہ کرنا چاہیے تھا۔ امی کے پاس جاتے، تمہاری حرکت بتاتے، تو امی تمہیں دو تھپڑ لگا کر ان کا

کام بھی کرواتیں اور معافی بھی مانگنے کو کہتیں۔ ان کو پیسہ بھی نہ دینے پڑتے اور کام بھی ہو جاتا۔ مگر انہوں نے بزدلی کا راستہ منتخب کیا۔ یہ ان کی بھی غلطی ہے۔ سواب بہتر ہے کہ ہم اس واقعے کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔“ حنین نے جھکے سر کو نفی میں ہلایا۔

”میں ایڈمیشن نہیں لے رہی۔ میں بی اے کروں گی۔“

”ٹھیک ہے، اب تم انجینئر نہیں بنو گی۔ تم یہ ڈیزرو نہیں کرتیں۔ سب کہتے تھے، حنین کو ہر وقت کمپیوٹر کے آگے مت بیٹھنے دیا کرو، پکی بگڑ جائے گی، مگر میں نے تمہارا انٹرنیٹ، کمپیوٹر، گیمز، کچھ نہیں روکا کبھی۔

مجھے تم پہ اعتبار تھا۔ تم نے میرا اعتبار توڑا ہے۔ حنین ایک لفظ کی چیلنج بھی آپ کی ڈگری کو ”ناجائز“ بنا دیتی ہے۔ جو لوگ چیلنج کر کے میڈیکل میں ایڈمیشن لیتے ہیں، وہ ساری عمر مفت علاج بھی کرتے رہیں، تب بھی ان کی کمائی پاک ہو گی کیا؟ اللہ کے اصول بدلے نہیں جاتے۔ یونوواٹ حنین، تمہیں اس کے لیے معاف کر رہا ہوں، کیونکہ تم میں اور وارث ماموں کے قاتل میں فرق ہے۔ تم نے کہا ان کو گلٹ محسوس ہوا ہو گا، تمہیں وہ بھی نہیں ہوا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، مجھے بھی لگتا ہے ان کو گلٹ ہوا ہو گا، وہ ماموں کی قبر پہ بھی گئے ہوں گے، ان کے نام پہ چیری بھی کی ہو گی، آج بھی ماموں کے قاتل اگر ماموں کی بچیوں کو دیکھ لیں تو ان کے لیے بہت دکھ محسوس کریں گے، مگر کیا دکھ ہونا کافی ہوتا ہے؟“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بڑے گناہوں کے کفارے ہوتے ہیں، خالی خولی گلٹ اور دکھ جاسے بھاڑ میں۔ ذرا دیر کو زرتاشہ کا سوگ انہوں نے بھی منایا ہو گا، اور پھر؟ کیا اعتراف جرم کیا؟ کیا کفارہ ادا کیا؟ خود کو قانون کے حوالے کیا؟ نہیں! تم ان جیسی نہیں ہو۔ تم نے کفارہ ادا کیا ہے اور حنین! کفاروں کے بعد گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اوسی پی صاحب کی جان تم نے نہیں ان کی بیٹی اور ان کی بزدلی نے لی ہے۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں، مگر مجھے بہت عرصہ لگے گا دوبارہ تم پہ اعتبار کرنے میں، اور اب تم جو

بھی رہنا چاہتی ہو، 'رہو' لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو گی۔ ایک پکا عہد کہ تم دوبارہ یہ کام نہیں کرو گی۔ کیونکہ حند اگر کبھی مجھے یہ پتا چلا کہ حسین نے دوبارہ پیپر میں چھٹنگ کی ہے، تو اس دن ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔" انگلی اٹھا کر سختی سے وہ تنبیہ کر رہا تھا۔ "مجھے دوبارہ کبھی یہ سننے سے مت دینا حند! کہ تم نے پھر سے یہی کام کیا ہے۔"

حسین نے جھٹ سر اثبات میں ہلادیا۔ (ایسا تو کبھی بھی نہیں ہو گا، کبھی بھی نہیں۔ اسے یقین تھا۔)

"مگر حند! فی الحال، لی اے کرنا بھی اس مسئلے کا حل نہیں ہے مسئلہ تمہاری ایڈکشن ہے۔ کمپیوٹر اور ٹی وی ڈراموں کی ایڈکشن۔"

"ایڈکشن؟" وہ چونکی۔ بری طرح۔ ایک دم سب رک گیا۔ وہ سات صدیاں پہلے کے شیخ معلم کے نیم تاریک دیوان خانے میں بیٹھی تھی، اور دور کہیں سعدی بول رہا تھا۔

"میں بھی دو تین ڈرامے فالو کرتا ہوں۔ پچھلے دو سال سے Suits اور چار پانچ سالوں سے Grey's Anatomy دیکھ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ڈرامے مت دیکھو، فلمیں مت دیکھو، میں یہ کہوں گا تو تم نہیں مانو گی۔ میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ حد میں رہ کر دیکھو۔ زیادتی کسی بھی چیز کی ہو نقصان دہی ہے۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتی، چپ چاپ سوچے گئی۔

"کیا سوچا پھر تم نے؟"

"خمر شیطان کی گندگی میں سے ہے۔" وہ ہولے سے بولی تو سعدی نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟" اسے بات کا موقع محل سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ دور کسی اور زمانے میں بیٹھی بول رہی تھی۔

"شیخ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہر شخص کا خمر مختلف ہوتا ہے۔ پتا ہے الکحل کیوں حرام ہے؟ کیونکہ وہ نشہ کرتی ہے، اور لت ڈالتی ہے۔ ہر نشے والی چیز خمر ہوتی ہے۔

چاہے وہ مشروب نہ ہو یا اس کا رنگ سرخ نہ ہو۔ میرا خمر یہ سب تھا۔ یہ کمپیوٹر، موبائل، انٹرنیٹ، ٹی وی۔

سواب۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کروں گی۔" کوئی عزم تھا جو اسی لمحے کر لیا۔ سعدی نے بے اختیار سمجھانا چاہا۔

"حند، کوئی بھی چیز بذات خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا۔"

"بالکل بھی مت کہہ سکتے گے، فضول بات، جو لوگ دہرا دہرا کر نہیں تھکتے۔" وہ غصے سے بولی۔ "ہر چیز کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بذات خود اچھی یا بری نہیں ہے۔ کچھ چیزوں کا برا استعمال ان کے اندر برائی کا اثر اتار آج کر دیتا ہے کہ۔ کہ ان میں آپ کے لیے اچھائی ختم ہو جاتی ہے۔ جب خمر ممنوع ہوتی تھی تو ان برتنوں کو بھی توڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا جن میں وہ لی جاتی تھی۔ آپ خمر کے برتن میں آب زمزم نہیں پی سکتے بھائی۔"

"خیر، آج کل کے برتنوں کو دھو کر استعمال کیا جاسکتا ہے، وہ اس زمانے میں کدو کے برتن تھے جو۔" وہ اسے فتویٰ اور فقہ بتا رہا تھا مگر حسین نے نفی میں سر ہلایا۔

"زمانہ نہیں بدلا بھائی۔ اب بھی مسئلے وہی ہیں جو سات سو سال پہلے کے دمشق میں ہوا کرتے تھے۔ کسی اور کے لیے یہ چیزیں بری نہیں ہوں گی، مگر میرے لیے ہیں۔ میں ان کو اب ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔" نفی میں سر ہلاتی حسین کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں۔

"لیکن حند، الکحل بھی اکٹھی حرام نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ منع کی گئی تھی۔ تین حصوں میں۔

ایک دم سے ان چیزوں کو زندگی سے نکالو گی تو اپنا ایک حصہ ان ہی کے ساتھ کھو دو گی۔ اڑھائی کٹلہ آدمی کو ایک

دم سے منشیات سے نہیں ہٹایا جاتا۔ ڈوز ہلکی اور مزید ہلکی کی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ چھوڑو۔ خود کو دبا کر، جبر

کرو گی تو کتنا عرصہ ضبط ہو گا؟ ایک دن اسپرنگ کی طرح واپس وہیں آ جاؤ گی۔"

"نہیں۔ اگر ابھی نہیں چھوڑا تو کبھی نہیں چھوڑ سکوں گی۔" وہ ناں میں گردن ہلائے جا رہی تھی۔

سعدی نے مزید سمجھانا چاہا، مگر حند نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔ اگر وہ اپنا ضبط نفس آزمانا چاہتی تھی، تو

سعدی کو اسے روکنا نہیں چاہیے۔

اگلے روز ندرت نے جب کچن کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر لاؤنج میں جھانکا تو دیکھا وہ کمپیوٹر بیگ کر کے سعدی کے کمرے میں شفٹ کر رہی تھی۔ اسمارٹ فون میں سے اس نے پہلے ہی سم نکال کر اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا اور ای کی سم چھوٹے پرانے نوکیا سیٹ میں ڈال کر انہیں دے دی کہ میں اب یہ نہیں استعمال کروں گی۔ ندرت کو سعدی نے پتا نہیں کیا کہ کر سمجھایا تھا کہ وہ پہلے تو چپ رہیں پھر ڈانٹنے لگیں انہیں اس کے انجینئرنگ میں ایڈمیشن نہ لینے کا بہت دکھ تھا مگر وہ بے حس بنی سنتی گئی۔ کتنے دن ندرت نے اس کے ساتھ سر پھوڑا پھر خود ہی تھک کر خاموش ہو گئیں۔ زندگی میں اور بھی غم تھے حسنین کے سوا۔

اور اس تنہائی اور خاموشی کی نئی سرنگ میں داخل ہونے کے بعد حسنین یوسف کے لیے ایک ہی روزانہ تھا۔ اپنا عہد! اگلے بورڈ ایگزام میں (لی اے کے فائنل ایگزام میں) وہ اپنی محنت سے پاس ہوگی جیسے سیکنڈ ایئر سے پہلے ہر سال ہوتی آئی تھی اور جس دن ایمان داری کا رزلٹ آئے گا اس کے دامن پہ لگا بے ایمانی کا داغ دھل جائے گا۔ بھائی اس پہ پھر سے اعتماد کرنے لگے گا۔ اب وہ کبھی بھی اس کو یہ سننے کا موقع نہیں دے گی کہ حسنین نے چیٹنگ کی ہے۔ اب حسنین ایسا کبھی بھی نہیں کرے گی۔ سعدی نے کہا تھا اگر اسے دوبارہ ایسا کچھ پتا چلا تو اس دن وہ دونوں الگ ہو جائیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہو گا اسے یقین تھا۔ وہ غلط تھی۔



یہ عیاں جو آب حیات ہے اسے کیا کروں کہ نہاں جو زہر کے جام تھے مجھے کھا گئے! جیل کا ملاقاتی کمرہ مایوسی اور ڈپریشن کی فضا سے بوجھل ان دونوں کے گرد موجود تھا۔ فارس پیچھے کو ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ جما کر منہ میں کچھ چبا تا نظریں آگے پیچھے کی چیزوں پہ دوڑا رہا تھا جبکہ سعدی

دب دبے غصے اور خفگی سے اسے گھور رہا تھا۔

”اور وہ سمجھ رہی ہیں کہ آپ نے انہیں استعمال کرنے کی کوشش کی۔“

”بریکنگ نیوز سعدی! ہر بات تمہاری پھپھو کی وجہ سے نہیں ہوتی۔“ اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔ ”اتنی مشکل سے وہ راضی ہو میں آپ سے ملنے کے لیے اور آپ نے سب کچھ غارت کر دیا۔“ وہ دبا دبا چلایا تھا۔

”تو کیا کروں؟“ فارس نے برہمی سے سعدی کو گھورا۔ ”مزید ڈھائی سال یہاں گزاروں؟“

”جب میں نے کہا تھا کہ آپ کو یہاں سے نکال لوں گا تو...؟ کیا ضروری تھا زمر کو دوبارہ خود سے بدظن کرنا؟“ اس کا غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

”وہ ہمیشہ سے مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ تمہاری ذہین فطین پھپھو (طنز سے اسے دیکھا) اتنا تو بتا نہیں لگا سکتیں کہ فارس غازی بے گناہ ہے!“

اس بات پہ وہ پیچھے ہو کر بیٹھا، آنکھیں سکیڑ کر چبھتی ہوئی نظروں سے فارس کو گھورا اور پھر چبا چبا کر بولا۔

”فارس غازی صاحب! میری پھپھو آپ سے کئی گنا زیادہ اسمارٹ اور سمجھ دار ہیں، آپ کی طرح وہ ہاتھوں سے نہیں سوچتیں، دماغ سے سوچتی ہیں۔ اور ہاں اگر آپ کی جگہ وہ جیل میں ہوتیں تو ڈھائی سال کیا ڈھائی دن میں باہر نکل آتیں۔“

”تھینک یو پریمی ٹیچ سعدی! میں بہت مرعوب ہوا ہوں۔“ اس نے اتنی ہی برہمی سے سر جھٹکا۔

”آپ کو یہ بات حیران کر رہی ہے کہ اتنی اسمارٹ ہو کر بھی ان کو آپ کی بے گناہی کا یقین نہیں ہے؟“

کچھ دیر بعد وہ قدرے ہموار لہجے میں بولا۔ فارس کچھ کہے بنا اسے دیکھنے لگا۔ ”ماموں! آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔ بات ذہانت یا بے وقوفی کی نہیں ہے۔ امی کو دیکھ لیں۔ امی بالکل بھی ذہین نہیں ہیں۔ دودھ چولہے پہ رکھ کر بھول جاتی ہیں۔ ان سے پوچھو کہ ورلڈ ٹرینڈ سینٹر پہ حملہ کب ہوا تھا تو تاریخ یا سن یاد نہیں ہو گا“

مگر کہیں گی تب سعدی فلاں کلاس میں تھا۔ ان کا کیلینڈر ان کے بچوں کی پیدائش ان کے چلنے بولنے یا فلاں کلاس میں ہونے کے مطابق ان کے ذہن میں فٹ ہے۔ بالکل ہی بھولی ہیں ای۔ مگر جب میں نے ان سے کہا کہ ماموں کی جعلی ٹیپ سن لیں تو انہوں نے نہیں سنی 'سن لیتیں تب بھی نہ مانتیں۔ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود ان کو جتنے ثبوت آپ کے خلاف مل جائیں وہ آپ کو گناہگار نہیں مانیں گی۔ پتا ہے کیوں؟

"کیونکہ ان کو مجھ پہ اعتبار ہے اور۔" وہ ٹھہرا اثبات میں سر ہلایا۔ "اور میڈم زمر کو مجھ پہ اعتبار نہیں ہے! بہت سالوں بعد اس کو وہ بات سمجھ آئی تھی۔"

"بالکل۔ وہ آپ پہ اعتبار نہیں کرتیں سواب آسمان سے فرشتے اتر کر بھی آپ کے حق میں گواہی دیں وہ تب بھی نہیں مانیں گی کیونکہ ٹوٹا اعتبار جوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ کیوں کریں آپ پہ اعتبار؟ وہ آپ کو جانتی ہی کتنا ہیں؟ چند ماہ کے لیے آپ ان کے اسٹوڈنٹ رہے تھے وہ کبھی بھی آپ سے بے تکلف نہیں تھیں آپ کام کے علاوہ ان سے کبھی کوئی بات نہیں کرتے تھے اس کے بعد وہ کام پڑنے۔ آپ سے رابطہ کر لیتیں یا خاندانی تقریبات میں آپ سے سرسری سی ملاقات ہو جاتی اور بس۔ وہ آپ کو ویسے نہیں جانتی تھیں جیسے ہم جانتے ہیں۔ جیسے ای جانتی ہیں۔ جس دن وہ آپ کو جاننے لگیں گی اسی دن اعتبار جھی کرنے لگیں گی اس لیے پلیز ان کو دشمن سمجھنا چھوڑ دیں۔" ایک ایک لفظ پہ زور دیتا وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ "زمر دشمن نہیں ہیں زمر وہ واحد انسان ہیں جن کو میں اپنے ساتھ کھڑا کرنا چاہتا ہوں اس جنگ میں مگر ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ان کو الزام مت دیں۔ میں آپ کو باہر نکال لاؤں گا ٹرسٹ ی۔ صرف چند ماہ۔ مجھے چند ماہ کا وقت دیں۔ میں آپ کو یہاں سے نکال لوں گا۔" سینے پہ ہاتھ رکھے آگے جھکے وہ خطی سے ہی سہی التجا کر رہا تھا۔ فارس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ مگر اسے ساتھ ہی حیکمی

نظروں سے بھی دیکھا۔

"اور تم کیا کرو گے؟"

سعدی نے گہری سانس لی پیشانی انگلی سے کھجائی۔ "جو بھی کرنا پڑا۔"

"اے۔۔ بات سنو۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ "کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا ورنہ چار دن میں ادھر جیل میں بند ہو گے۔" بے زاری اور غصے کے پیچھے جیسے وہ فکر مند ہوا تھا۔ سعدی لب بچنے آگے ہوا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میری جو مرضی آئے میں کروں گا جو بھی کرنا پڑا کروں گا۔ زیادہ مسئلہ ہے آپ کو تو مجھے گرفتار کروادیں ڈھٹائی سے کتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فارس نے بے بسی بھری برہمی سے اسے گھورا۔

"کچھ غلط کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں آپ پہ احسان کرنے جا رہا ہوں اس امید پہ کہ شاید کبھی آپ بھی ایسا ہی احسان میرے اوپر کرنے کے قابل ہوں۔ اوہ انڈیو آرو۔ ملکہ!" مسکرا کر سر کے خم سے اس کا وہ شکریہ قبول کیا جو اس نے نہ کہا تھا نہ کہنا تھا۔ اور پھر جب وہ مڑا تو اس نے سنا فارس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا تھا۔ "سنو۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"



سمجھتا کیا ہے تو دیوانہ مگن عشق کو زائد! یہ ہو جائیں گے جس جانب اسی جانب خدا ہو گا! سعدی قدم قدم زینے چڑھتا اوپر آیا۔ راہداری کے سرے پہ عمارت کا فلور نمبر لکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی جٹ سے پتہ ٹیلی کیا اور ادھر ادھر گردن گھمائی۔ آگے پیچھے فلیٹس کے بند دروازے تھے وہ دائیں طرف کے دوسرے دروازے پہ آیا اور ٹیل بجائی۔ "کون ہے؟" اندر سے مردانہ آواز سنائی دی۔ "مجھے۔ مجھے احمر شفیع سے ملنا ہے۔"

دروازہ کھلا ذرا سی درز سے اس نوجوان نے باہر

جھانکا۔ ماتھے پہ بکھرے بال، 'راؤزر' پر شرٹ پہنے، وہ سیاہ آنکھوں والا نوجوان تھا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک سعدی کا جائزہ لیا جو جینز پہ گول گلے کا سویٹر پہنے کھڑا متذبذب سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے کوئی ہنسا آرڈر نہیں کیا۔" وہ بے زاری سے دروازہ بند کرنے لگا۔ سعدی جلدی سے بولا۔

"میں سعدی ہوں۔ فارس غازی کا بھانجا۔" (کیا میں دیکھنے میں ڈیوری بوائے لگتا ہوں؟)

بند کرتے کرتے وہ رکا، پھر دروازہ پورا کھول دیا۔ اب کہ نوجوان نے قدرے غور سے اسے دیکھا، پھر سرترچھا کر کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سعدی قدرے پہچان سے اندر آیا۔

"آپ حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے ہیں، ماموں نے بتایا تھا۔" چھوٹے سے فلیٹ کو طائرانہ نظروں سے دیکھتے، وہ لاؤنج کے وسط میں کھڑا برائے بات بولا۔ جواب میں احمر نے شانے اچکائے۔

"ہوں۔ میرے وکیل نے سارے ثبوت مٹا دیے اور اس گھنگھریالے بالوں والی چڑیل پر ایسیکویٹر کو نتیجہ جتنا "چار جز ڈراپ کرنے پڑے۔" وہ اوپن چین میں آیا، فریج کھولا۔ دو کوک کے کین نکالے اور مڑا تو سعدی صوفے کے ساتھ کھڑا بالکل چپ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھو۔" اس نے اسی لاپرواہی سے اشارہ کیا مگر وہ نہیں بیٹھا۔ وہ گھنگھریالے بالوں والی پر ایسیکویٹر میری سگی پھپھو ہیں۔"

دانت سے کین کا منہ کھولتے احمر کو گویا ہنسی آئی۔ بمشکل سنبھالتے وہ چہرے پہ معذرت خواہانہ تاثر لایا۔ "آئی ایم سوری، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ وہ بہت اچھی ہیں، میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ بیٹھو نا!"

ایک لمحے کو سعدی نے راہداری کو جاتے دروازے کو دیکھا، گویا وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہو، مگر یہ تو وہ جان گیا تھا کہ پہلے تاثر سچ نہیں ہوتے، سو سر ہلا کر صوفے پہ بیٹھا۔ احمر نے دوسرا کین اس کی طرف

اچھلا، جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں کیچ کیا۔ (بونی پتا نہیں کیوں تو شیرواں یاد آیا)

چند منٹ بعد وہ دونوں صوفوں پہ آنے سامنے بیٹھے تھے۔ سعدی گھٹنے برابر رکھے، آگے ہو کر، اور احمر صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے، ٹانگہ ٹانگہ جمائے، ایک پیر جھلاتا، اپنی سیاہ آنکھیں سکیٹر کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں، جج فارس غازی کے حق میں فیصلہ دے دے۔ اس کے لیے میں کیا کروں؟ ماموں نے کہا تھا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔"

احمر نے کین اونچا کر کے گھونٹ بھرا، پھر اسے نیچے کیا۔ ابرو اچکائے۔

"سپیل۔ ایک Presentation تیار کرو، اس میں غازی کے حق میں سارے ثبوت ڈالو، اور یہ دکھاؤ کہ وہ کتنا اچھا انسان ہے، پھر اسے ایک فلیش ڈرائیو پہ ڈالو، اور وہ ڈرائیو جج کے گھر لے جاؤ، اس سے درخواست کرو کہ وہ یہ دیکھ لے، اس کے کمپیوٹر پہ اسے چلاؤ۔ پھر اس کی خوب منت کرو کہ وہ اسے رہا کر دے۔"

"کیا صرف منت کرنے سے وہ رہا کر دے گا؟" "اے نہیں یار!" احمر نے بد مزہ ہو کر ناک سے مکھی اڑائی۔ "جو فلیش تم اس کے کمپیوٹر میں لگاؤ گے، وہ اس کے سسٹم میں ایک mole داخل کرے گی۔ اس کے بعد جج صاحب اس کمپیوٹر پہ جو کچھ لکھیں گے، یاد دیکھیں گے، اس کی لمحہ بہ لمحہ خبر تمہارے کمپیوٹر پہ آجائے گی۔ چند ہفتوں میں تمہیں اچھا خاصا مواد مل جائے گا، جج کے خلاف۔ پہلے گمنام طریقے سے اسے بھیجنا۔ اگر وہ ڈر جائے اور جھانسنے میں آجائے، تو کھلم کھلا بلک میل کرنا۔ چند مہینوں میں غازی باہر ہو گا۔" سعدی حکامانہ کھل گیا۔ پھر آہستہ سے اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ (واؤ) احمر اب آخری گھونٹ اندر انڈل رہا تھا۔

"ایک اور کام بھی ہے۔" "بولو۔" اس نے کین رکھ کر سنجیدہ متوقع نظروں

191 مئی 2015

”بلکہ۔۔“ احمر کا تھوڑی بہ دو انگلیاں رکھے کچھ سوچا۔ ”مسز شہرین سے کیش لینا۔ چیک نہیں۔ اسے یہ نہیں پتا چلنا چاہیے کہ یہ کام مجھ سے کروا رہے ہو۔“

”کیوں؟“

”وہ اپنے شوہر کو بتا دے گی اور وہ سارا غصہ مجھ پہ نکالے گا اسے ویسے ہی میں ناپسند ہوں۔“

”ارے نہیں۔ وہ دونوں علیحدہ ہو چکے ہیں اور وہ تو خود اسے ہاشم بھائی سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔“ اس کی بات پہ احمر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”پتا ہے عورتوں کا مسئلہ کیا ہوتا ہے؟“ قریب آکر قدرے رازداری سے پوچھا۔ سعدی نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ کسی نہ کسی کے سامنے کبھی نہ کبھی بول ہی پڑتی ہیں سو آج نہیں تو دو سال بعد وہ ہاشم کو ضرور بتائے گی۔ Always a Kardar Once a Kardar اس لیے۔“ ابرو اٹھا کر تنبیہ کی۔

”اوکے سمجھ گیا۔“ اور اس کا پھر سے شکریہ کہتا باہر جانے کو مڑا۔

”ویسے عازی کے کیس سے شہرین کاردار کا کیا تعلق؟“ تھوڑی کھجاتے ہوئے اس نے قدرے پرسوج انداز میں پوچھا۔ سعدی کے قدم تھمے احمر کی جانب پشت تھی سو تھوک نکل کر قدرے اعتماد سے پلٹا۔

”شہرین والا معاملہ ایک ذاتی فورہ ہے۔ اس کاموں کے کیس سے کوئی تعلق نہیں۔“

”آہں۔“ احمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا مطمئن ہو گیا ہو۔ اس سے زیادہ اسے دلچسپی نہ تھی۔



یہ حقیقت ہے جہاں ٹوٹ کے چاہا جائے وہاں پھرنے کے بھی امکان ہوا کرتے ہیں قصر کاردار پہ گہری سیاہ شام پھیل چکی تھی جب ہاشم بیرونی دروازہ عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہوا۔

ملازم اس کا بریف کیس لیے پیچھے تھا۔ جواہرات اپنی مخصوص اونچی کرسی پہ براجمان تھی اور نوٹس دیاں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کوئی بات کر رہے تھے ہاشم کو دیکھ کر خاموش ہوئے۔ خلاف معمول وہ سیدھا اوپر نہیں گیا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا، قریبی صوفے پہ آ بیٹھا۔ تھکا تھکا اور کسی سوچ میں لگ رہا تھا۔

”خیریت؟“ جواہرات نے محتاط نظروں سے اس کا چہرہ دکھا۔

”سعدی آیا تھا آج۔“ وہ سر تلے بازوؤں کا تکیہ بنائے، پیر میز پہ رکھے، سامنے دیوار کو دیکھتے سوچتے ہوئے بولا تو جواہرات اور شیرو نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

”کیوں کیا کہہ رہا تھا؟“ گردن کی موتیوں کی لڑی پہ خواجواہ ہاتھ پھیرتے وہ سرسری سا بولی۔ آنکھوں میں بے چینی اُٹھ آئی تھی۔

جواب میں وہ ساری بات اسی سوچ میں گم انداز میں بتاتا گیا، جسے سن کر جواہرات کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے شیرو نے بھی گہری سانس لی۔

”میں نے وکیل کے بدلاؤ کی بات پہ باز پرس کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے کبھی مجھ سے ایسے بات نہیں کی۔ مجھے لگا وہ لڑنے کا بہانہ چاہتا تھا۔“ پھر ایک دم چونک کر گردن موڑی۔ فہنوٹا اسپرے کی بوتل اٹھائے گزر رہی تھی۔ ہاشم نے اسے ہٹا کر اتوہ رکھی۔

”سعدی کو جانتی ہو نا؟ کیا وہ آج گھر آیا تھا؟“ فہنوٹا نے جواب دینے سے قبل ایک ذرا کی ذرا نظر جواہرات پہ ڈالی جو دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی، پھر ہاشم کو دیکھا اور مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”نوسر۔ آخری دفعہ میں نے اسے چار روز قبل ادھر دیکھا تھا۔“ ہاشم نے سر ہلا کر اسے جانے کو کہا۔

”آپ کی تو کوئی بات نہیں ہوئی اس سے؟“ اب وہ جواہرات کو اچھے انداز میں مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔

”نہیں کیوں؟ ہمارا کیا تعلق؟“

”نہیں مجھے لگا وہ لڑنے کا بہانہ ڈھونڈنے آیا تھا۔“

سے سعدی کو دیکھا۔ وہ قدرے متذبذب تھا۔

”ایک معزز خاندان کی لڑکی کی ایک گالف کلب کے ریکارڈ میں کچھ فوٹوجز ہیں جو۔“

”کیسی فوٹوجز؟ جو؟ ڈرگز؟ یا کچھ اور؟“ وہ جو رک رک کرتا رہا تھا، احمر نے اتنی ہی سادگی سے پوچھا۔

سعدی نے گہری سانس لی۔ فجر یہ اٹھ کر قرآن پڑھنے والوں کو غلط باتیں کرنا زیادہ ہی غلط لگا کرتا ہے۔

”وہ کارڈز کھیل رہی تھیں۔ آف کورس جو۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”مطلب فوٹوجز غائب کرنی ہیں؟ ہو جائیں گی۔ کلب کا نام کیا ہے؟ ویسے مجھے اندازہ ہے یہ کدھر ہوا

ہو گا، بہر حال، نام تاریخ، لڑکی کی تصویر، سب دے دو۔ میں کر لوں گا۔“

”مگر آپ اس کے شوہر کو نہیں بتائیں گے۔“ احمر نے اچھے سے ابرو سکیرے۔

”کیا میں اس کے شوہر کو جانتا ہوں؟“

”مسز شہرین کاردار۔“ اس نے اچھپاتے ہوئے بتایا۔

احمر چونک کر سیدھا ہوا۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی، حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہاشم کاردار کی بیوی، اوہ ہو۔

یہ تو کافی شرمناک ہو گا کاردار صاحب کے لیے۔ بیوی کی گیمبلنگ فوٹوج؟ چیچ چیچ۔ یہ تو اسکینڈل بن سکتا

ہے۔“ اس نے ماتھے کو چھوا۔ ”ہاشم کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ غازی کا کزن ہے، مجھے پسند نہیں

ہے مگر وہ ایک عزت دار آدمی ہے۔ اوہ تم اس سے ناراض تو نہیں غازی کی طرح؟“

سعدی کے چہرے پہ اس نام پہ آئی ناپسندیدگی دیکھ کر اس نے وضاحت دی۔ ”اس نے تو اپنی پوری

کوشش کی تھی غازی کو نکلوانے کے لیے، مگر اس کے والد نے اسے روک دیا اور انہوں نے بھی اپنے

ایڈوائزر؟ کیا ان کو کسی نے فارس کی مدد نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا؟“ پوچھتے ہوئے اس کے ابرو غصے سے تن

گئے۔ احمر نے بے اختیار اس کو دیکھا، پھر سینٹر ٹیبل پہ رکھے کانچ کے گلدان پہ نظر ڈالی جو اگر ٹوٹا تو بہت زور کا

لگتا۔ آؤج!

”آہ ہاں شاید کسی نے مشورہ دیا تھا۔ پتا نہیں کون تھا، میں تو آڑتی آڑتی سنی ہے!“ گڑبڑا کر کہتے اس نے

تھوک نکلا۔ سعدی سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر اصل کام یاد آیا۔

”تو کیا آپ شہرین کی فوٹوج غائب کر سکتے ہیں؟“ وہ بے چینی سے آگے ہوا۔

”ہاں، لیکن وقت لگے گا، کسی اور سے نہیں کروا سکتا۔ خود کرنا پڑے گا۔“

”آپ کا اس سب پہ وقت کے ساتھ پیسہ بھی لگے گا تو۔“ کہتے ہوئے سعدی نے جینز کی جیب پہ ہاتھ

رکھا گویا بیوہ نکالنے لگا ہو۔ مگر احمر نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”نہیں، میں غازی کے بھانجے سے پیسے نہیں لوں گا۔“

”نہیں پلیز، میں آپ کو ہائر کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو لوگ ایسے کاموں کے لیے ہائر کیا کرتے

ہیں تو ظاہر ہے مجھے اچھا نہیں لگے گا اگر میں۔“

”سنو نیچے۔“ سنجیدگی سے کہتے اس نے ہاتھ اٹھا کر سعدی کو مزید بولنے سے روکا۔ ”پہلی بات۔ میں تم

سے پیسے نہیں لوں گا اور دوسری بات جس جیب تم نے ہاتھ رکھا ہے، تمہارا بیوہ اس میں نہیں، بلکہ

دوسری جیب میں ہے۔ شرمندہ مت ہونا، مجھے پتا ہے تم اپنی خودداری کی وجہ سے کہہ رہے ہو اس لیے سنو،

میں بھی اپنی خودداری کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ میں غازی کے بھانجے سے پیسے نہیں لوں گا۔“

سعدی نے تکان سے ٹھنڈی سانس بھری، اب شرمندہ کیا ہونا؟ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تھینک یو، فری

سروسز کرنے کے لیے۔“ اور ہلکا سا مسکرایا۔

”ایک منٹ بھائی ایک منٹ!“ احمر اٹھ کر آیا اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا ”اب یہ نہیں کہا کہ فری

کام کروں گا۔ تمہارا کام ہو جائے گا، مگر شہرین بلی سے کہنا، میرا چیک تیار رکھیں۔“

”اوہ۔ شیور!“ وہ سنبھل کر مسکرا دیا۔

کسی اور بات پہ خفا تھا اور غمہ کسی اور طرح نکالا۔ ”پھر ہولے سے سر جھٹکا۔ ”شاید میں زیادہ ہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ اتنے سال جس لڑکے کے ساتھ میں اتنی شفقت سے پیش آتا رہا، وہ اس طرح بات کیسے کر سکتا ہے مجھ سے؟“ اسے کافی دکھ ہوا تھا۔ شیرو نے بمشکل ناگواری چھپائی۔

”وہ تو اسی طرح کا ہے بد تمیز اور احسان فراموش۔ آپ کو ہی اس کی اصلیت دیر سے پتا چلی۔ مگر آپ اب بھی اس کے ساتھ وہی چھوٹے بھائی والا رویہ رکھیں گے مجھے پتا ہے۔“

”اب نہیں۔“ ہاشم کے چہرے پہ تلخی گھل گئی۔ آنکھوں میں بے پناہ سختی اتر آئی۔ اس کے دل میں سعدی کے لیے گرہ پڑ گئی، سو پڑ گئی۔ ”جس طرح وہ آج بد تمیزی سے بولا، میں دوبارہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ پیر نیچے اتارے اور جھک کر بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا۔

”بہتر ہے۔“ جواہرات نرمی سے مسکرائی اور شیرو کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

ہاشم تسمہ کھول کر سیدھا ہوا اور جیب سے ایک کی چین نکال کر شیرو کی جانب اچھالی، جو اس نے بروقت کیچ کی۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر چابیاں دیکھیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”تمہاری نئی کار۔“ بیٹھے بیٹھے چہرہ اٹھا کر وہ ٹکان سے مسکرایا۔ نو شیرواں نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پھر چابیوں کو۔

”نہیں، یہ وہ اسپورٹس کار نہیں ہے جو تم چاہتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ایگزیکٹو لکڑی کا ردے کر میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں نو شیرواں کہ تمہاری کمپنی جو ڈیڈ نے تم سے لی تھی، میں نے تمہیں واپس کر دی ہے، تمہیں ہر وہ چیز نہیں ملے گی جو تم چاہتے ہو، بلکہ وہ دی جائے گی جو تمہارے لیے بہتر ہو۔“ اور پھر نرمی سے مسکرایا۔

”تھینک یو سوچ بھائی۔“ وہ حیران، خوش، تیزی

سے باہر بھاگا۔ ہاشم اب اٹھ کر اوپر جا رہا تھا۔ جواہرات مسکراتے ہوئے، سکون اور اطمینان سے دونوں بیٹوں کو جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ لاؤنج میں اکیلی رہ گئی تو میز پر رکھے شیرو کے فون کی لمپ بجی۔ اس نے بنا تو قف کے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ شہرین کا میسج تھا۔

کوئی عام سی بات کہی تھی اس نے، مگر جواہرات کے ابرو تن گئے۔ ر سوچ انداز میں بیرونی دروازے کو دیکھا، جہاں سے شیرو گیا تھا اور پھر۔۔۔ انکلیوں کو حرکت دی، پیغام مٹایا۔ فون واپس رکھا، اور اسی شان سے اس کرسی پہ بیٹھی رہی جو کسی ملکہ کا خاصا ہوتی ہے۔ تنی گردن بے نیاز مسکراہٹ اور ایک عظیم الشان سلطنت کے خیال سے چمکتی آنکھیں۔

وہ آزاد تھی۔ اور نگ زیب کی غلامی کی زنجیروں سے یکسر آزاد۔ سوا گلا ڈیڑھ برس بہت اچھا گزرا۔ ہاشم نے کاروبار، گھر، سب سنبھال رکھا تھا۔ سونی شہرین کے پاس ہوتی، کبھی آجاتی تو اچھا لگتا۔ شہرین آتی تو اچھا نہ لگتا، مگر وہ اس کو فی الوقت تحمل سے برداشت کیے ہوئے تھی۔ شیرو کا شیر کی جانب بڑھتا رجحان بھی اس کی نظر میں تھا، مگر ابھی اسے برداشت کرنا تھا۔

سعدی اور اس کے خاندان کا داخلہ یہاں اب بند تھا۔ سونی کی اگلی پارٹی پہ (جو اور نگ زیب کی وفات کی پانچ ماہ بعد ہوئی) اس نے سعدی کو دعوت نامہ بھجوایا، مگر وہ نہیں آیا۔ ہاشم بھی اب اس کا ذکر نہیں کرتا تھا، سوائے ایک رد و دفعہ کے، جب اس نے بتایا سعدی اسے اپنے آس پاس نظر آیا ہے، کبھی کسی ہوٹل تو کبھی کسی اور پبلک پلیس پہ، جیسے وہ کسی چیز کے پیچھے ہے، تو جواہرات نے نظر انداز کیا۔ مگر ہاشم زیادہ عرصہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ عرصہ بھی اس لیے توجہ نہیں کر سکا کہ باپ کے مرنے کے بعد ٹیک اوور کرنا، ہر شے سنبھالنا، ان سب بکھیڑوں نے اسے مصروف کر دیا تھا۔ ایسے میں کس کے پاس اتنا وقت تھا، کہ جیل میں جنم واصل ہوئے کزن یا اس کے بھانجے کی فکر کرے؟ اسے جس دن سعدی کو ”چیک“ کرنے کا خیال آیا، قارس اسی دن رہا ہو کر ان کی زندگیوں میں

واپس پہنچ گیا اور جیسے پرسکون ندی میں زوردار پتھر آن گرا تھا۔

آج ڈیڑھ سال بعد کی اس خاموش سہ پہر جب جواہرات زمر کے گھر سے فارس کے ہمراہ لوٹی تھی اور اپنے خالی گھر میں اسی اونچی کرسی پر بیٹھی تھی تو اپنے کان کے بندوں پر انگلی پھیرتے، نم آنکھوں سے اسے وہ سب یاد آ رہا تھا جو یاد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور ہاں ایک بات وہ اب بھی جانتی تھی۔ ہاسٹم اعتراف کرے یا نہیں وہ آج بھی سعدی سے محبت کرتا تھا۔ وہ آج بھی اسے مس کرتا تھا۔

تو پھر بالآخر ہم بھی ڈیڑھ برس قبل کے سرما کے سرد ماضی کی کہانی کو وہیں دفن کر کے مکمل طور پر ”حال“ کے موسم گرما کی جانب بڑھتے ہیں جہاں فارس غازی کی رہائی کے بعد سب کی زندگی بدل رہی تھیں۔



رک گیا میں سزا سے کچھ پہلے
اس کو احساس خود خطا کا تھا

یوسف صاحب کے روشن گھر پہ مئی کی گرم شام اتری تھی اور وہ ڈرائنگ روم میں عین اسی جگہ وہیل چیئر پر بیٹھے تھے جہاں دوپہر میں تب براجمان تھے جب فارس اور جواہرات ادھر تھے۔ البتہ اب حاضرین بدل چکے تھے۔ ندرت سامنے صوفے پر بیٹھیں، دھیمی آواز سے بڑے ابا کو تسلی دے رہی تھیں اور سعدی وہ جو آفس سے فارس کا فون سن کر گویا بھاگتے ہوئے امی کو لیے ادھر آیا تھا کھڑکی کے ساتھ کھڑا نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر ان کی جانب مڑا تو چہرے پہ خفگی تھی۔

”آپ کس طرح اپنے منہ سے یہ بات فارس ماموں سے کہہ سکتے ہیں؟ کلم از کم امی یا مجھ سے تو بات کرتے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟“

”زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے“ سعدی۔
ندرت خفا ہوئیں۔ ”آج کل لڑکی والوں کا کہنا معیوب نہیں سمجھا جاتا“ اور اس میں غلط بھی کیا ہے؟ اگر زمر کو اعتراض نہیں تو تم کیوں حواس باختہ ہو رہے ہو؟“

”یہ جس جگہ آپ بیٹھی ہیں ادھر بالکل ادھر پچھلے ہفتے فارس ماموں بیٹھے تھے جب زمر آئیں اور ان کو کھڑے کھڑے یہاں سے نکال دیا۔“ باقاعدہ انگلی سے اس صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ندرت نے بے اختیار پہلو بدلا۔ ”مان ہی نہیں سکتا میں کہ زمر مان گئی ہیں۔“ بہت ہی شدت سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بڑے ابا نے گردن اٹھائی۔ بے بسی سے اسے دیکھا۔

”وہ مانی نہیں ہے“ بس اس نے کہا کہ جو میری مرضی ہو میں کروں۔“

”یعنی کہ آپ لوگ ان پہ دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ایسا مت کریں بڑے ابا۔“ وہ ناراض ہوا۔

”اور اسی جگہ کھڑے ہو کر تم نے پچھلے ہفتے سعدی مجھے کہا تھا کہ میں زمر کی شادی کروں فارس سے۔“ وہ لمبے بھر کو چپ ہو گیا۔

”مگر ایسے نہیں کہ وہ زبردستی یہ فیصلہ کریں۔“

”تو پھر جاؤ بیٹے زمر سے بات کرو“ اس سے پوچھو کہ بغیر جبر کے بتائے وہ کیا چاہتی ہے۔ میں وہی کروں گا جو وہ چاہتی ہے۔“

سعدی کھڑا لب کاٹتا رہا۔ وہ الجھا ہوا تھا خفا بھی تھا۔ کیا چیز غلط تھی وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مگر کچھ صحیح نہیں تھا۔

”مجھے اس سب میں مسز کاردار کی مداخلت نہیں پسند آئی بڑے ابا۔ وہ کیوں اتنی بے چین ہیں زمر کی شادی کے لیے؟“

”ان کو کہا تھا میں نے کہ زمر کو شادی کے لیے قائل کریں وہ میرے کہنے پہ مداخلت کر رہی ہیں۔“ ان کی وضاحت پہ سعدی نے الجھے الجھے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”مجھے نہیں پتا مگر مجھے یہ اس طرح ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ اور اسی متفکر چہرے سے یا ہر نکل آیا۔

لان میں شام اندھیری ہو چکی تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھی پہ بیٹھا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر جیب سے موبائل نکالا اور جواہرات کا نمبر ملایا۔ فون کان سے لگائے سنجیدہ آنکھوں اور تنے تاثرات کے ساتھ دوسری

جانب جاتی گھنٹی سن رہا۔

”سعدی! اتنے عرصے بعد فون پہ تمہاری آواز سنی۔ کبھی کبھی ہمارے لیے وقت نکال لیا کرو۔“ وہ نرم خوشگوار انداز میں بولی تھی۔

”آپ یہ گلہ ایسے کرتی ہیں جیسے خود بھی واقف نہ ہوں کہ اب میرے لیے وقت کس کے پاس نہیں ہوتا۔“ چاہ کر بھی وہ بے زار۔ نہیں ظاہر کر سکا خود کو۔ ہاشم کی ماں کو ہاشم کے کارناموں سے وہ ہمیشہ الگ رکھتا تھا۔ ہر چیز کے باوجود!

”اس رات شادی میں بھی تم نے مجھ سے خاص بات نہیں کی۔ سونی کی پارٹی پہ اس نیکلس والے واقعے کا۔“

”مسز کاردار! آج آپ نے کیا کیا ہے؟“ اس نے اکھڑے خشک انداز میں بات کالی وہ تو ترنت بولی۔ ”اور کیا کیا ہے میں نے؟“

”مجھے نہیں معلوم“ آپ کیوں زمر اور فارس کی شادی کروانا چاہتی ہیں۔ مگر وجہ جو بھی ہو، میں نے بڑے ابا کو کہہ دیا ہے کہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے سختی سے کہتے گویا بات ختم کی۔

”تیسری دفعہ سعدی؟“ وہ محفوظ ’مزہ لینے والے انداز میں گویا ہوئی تو وہ الجھا۔

”سوری!“

”پہلی دفعہ بچپن میں زمر کے جینز کو آگ لگانا اور دوسری دفعہ چار سال پہلے زمر کو ایک خطرناک کیس میں دھکیلنا۔ دوبار تم نے اس کی شادی نہیں ہونے دی۔ اب تیسری دفعہ رختہ ڈالو گے؟“

”ایکسکیوز می؟“ بے یقینی سے اس نے فون کو کان سے ہٹا کر دیکھا۔

”مشکل بات نہیں کی میں نے۔ تم نے خود بتایا تھا“ بچپن میں وہ تمہیں اپنی شادی کی چیزیں دکھا رہی تھی اور پھر وہ چلی گئی اور تم وہیں کھلتے رہے، پھر کھیل کھیل میں آگ لگ گئی اور اس کا جینز جل گیا۔“

”میں اس وقت دس سال کا تھا“ مسز کاردار! کچھ دیر پہلے کے تنے تاثرات غائب تھے اور وہ پھیکے پڑتے

چہرے کے ساتھ بمشکل بول رہا تھا۔

”اور تم اچھی طرح جانتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو۔“ وہ شاید مسکرائی تھی۔ ”تم سے کھیل میں آگ نہیں لگی تھی۔ تم نے جان بوجھ کر آگ لگائی تھی۔“ اس نے محفوظ سی سرگوشی کی اور وہ دم سادھے سانس روکے بیٹھا رہ گیا۔

”میں اس وقت دس سال کا تھا“ مسز کاردار! مگر وہ کہے جا رہی تھی۔

”وہ تمہاری ہیسٹ فرینڈ تھی“ اور وہ شادی کے بعد کراچی چلی جاتی۔ تم جیلنس ہو گئے تھے، اور ان سیکور بھی۔ مجھے جب تم نے بتایا تھا تب میں نے تمہاری آنکھیں پڑھی تھیں، نیچے۔ وہ آگ تم نے خود لگائی تھی۔“

”میں اس وقت دس سال کا تھا“ مسز کاردار۔“ بدقت کہہ کر اس نے بچلے لب میں دانت پیوست کیے۔ جیسے ڈھیروں ضبط کیا۔ آنکھوں میں نمی آئی تھی۔

”مگر اب تم دس سال کے نہیں ہو۔ اب بڑے ہو جاؤ اور اپنی پچھو کو اس کی زندگی گزارنے دو۔ اس کے رشتے میں مداخلت مت کرو۔ کیونکہ جب تم مداخلت کرتے ہو تو وہ صرف نقصان اٹھاتی ہے۔“

”آپ۔۔ آپ یہ اس لیے کہہ رہی ہیں تاکہ۔۔ تاکہ میں اس معاملے سے خود کو الگ کر لوں اور آپ کا جو بھی مقصد ہے وہ پورا ہو جائے۔“ اس نے کمزور کنبے کو مضبوط کرنے کی ناکام جد کی۔

”ہاں“ میں اسی لیے کہہ رہی ہوں، مگر سچی سچ ہے۔ کیا نہیں ہے؟“ اور لمحے بھر کی خاموشی کے بعد فون بند ہو گیا۔

سعدی کتنی دیر چپ چاپ اس سیڑھی پہ بیٹھا رہا۔ آنکھیں قدموں میں آگے گھاس پہ جمائے وہ مسلسل لب کاٹ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا جواہرات اسے ڈسٹرب کرنا چاہتی تھی، مگر اس بات کا علم ہونا ڈسٹرب ہونے سے روک نہیں سکتا۔

میں دلائل پہ تکیہ کر بیٹھا

آہ ! وہ وقت التجا کا تھا

کافی دیر بعد جب وہ اٹھ کر اندر آیا تو ندرت اور بڑے ابا مسلسل اسی بات پہ غور و خوض کر رہے تھے۔ اس چہرے کے ساتھ نہیں آیا جس کے ساتھ گیا تھا۔ سو ان کو وہیں چھوڑے، راہداری میں آگے چلا گیا۔ لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا اور ملازم لڑکا صداقت اسٹول بیٹھا، پیاز پھیلے اسکرین پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر شرمندہ سا اٹھنے لگا مگر سعدی مزید آگے بڑھ گیا۔ زمر کے دروازے پہ دستک دی۔ پھر اسے دھکیلا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی۔ فائل پہ جھکایمپ چل رہا تھا اور وہ گردن ترچھی کیے قلم سے کچھ لکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ چہرہ اٹھایا۔ اسے دیکھ کر بھوری آنکھوں میں نرمی آئی اور مسکرائی۔

”آؤ سعدی!“ سامنے کاؤچ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ وہاں آ بیٹھا۔

”اور کیا ہو رہا ہے؟“ فائل بند کرتے ہوئے اس نے اسی نرمی سے پوچھا۔ سعدی نے بدقت مسکرانے کی سعی کی۔

”بس جاب چل رہی ہے۔ آپ۔“ وہ رکا۔ سر ابھی تک جھکا تھا۔

”ابا نے بھیجا ہے مجھ سے بات کرنے کے لیے؟“ ”جی، مگر۔ میں آپ سے وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ جو دلائل پہ تکیہ کیے مزید چند فقرے بولنے جا رہی تھی، اپنے انہی سپاٹ انداز میں بے تاثر سے فقرے، سعدی کی بات نے اسے روک دیا۔ وہ چونک کرنا سمجھی اسے دیکھنے لگی۔

”تو پھر؟“

”بڑے ابا نے کہا ہے کہ آپ اس شادی پہ راضی ہیں۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں زمر! کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں، میں اس میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔“ سر جھکائے، انگلیاں مروڑتے بجھا بجھا سا کہہ رہا تھا۔ ”آپ بغیر کسی مجبوری یا دباؤ کے فیصلہ کریں اپنی زندگی کا فیصلہ۔ میں آپ کو سپورٹ کروں گا۔“

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس سب کے پیچھے کوئی وجہ ہوگی۔ آپ ان سے نفرت کرتی ہیں، اور پھر بھی آپ ان سے شادی کرنے جا رہی ہیں۔“

زمر کے بظاہر سکون چہرے پہ سایہ سا لہرایا، مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سر جھکائے وہ کہے جا رہا تھا۔

”آپ کامل بھی ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا، لیکن اس سب کے باوجود بھی آپ ان سے شادی کرنے جا رہی ہیں، تو میں آپ سے صرف ایک چیز چاہتا ہوں۔“ اس نے جھکی نظریں اٹھا کر زمر کو دیکھا جو دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

”کیا آپ مجھ سے وعدہ کرتی ہیں کہ آپ فارس ماموں کو کبھی ہرٹ نہیں کریں گی؟“

زمر نے تھوک نگلا، یوں کہ اس کی آنکھیں کھٹکھریا لے بالوں والے خوبصورت لڑکے پہ جھیٹھیں، اور لب خاموش تھے۔

”کیا آپ مجھ سے وعدہ کریں گی کہ آپ کبھی بھی ان کو دانستہ طور پہ نقصان نہیں پہنچائیں گی؟“ وہ برے اور بھیانک خوف کے زیر اثر کہہ رہا تھا۔ زمر نے خواجہ خواہ چہرہ پھیر کر میز کو دیکھا، پھر فائلز کو، اور پھر دوبارہ سعدی کو۔ اتنا بڑا وعدہ جو انتقام کے ہر ارادے کو مار ڈالے؟

”میں۔ میں اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ آئی پراس!“ چند لمحوں بعد وہ سعدی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی اور دوبارہ تھوک نگلا۔ سعدی نے گہری سانس لے کر بھنوں پہ ہاتھ رکھے، سر جھکا دیا۔ گویا تنے اعصاب ڈھیلے کیے۔ زمر ہنوز پلک جھپکے بنا اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھایا۔ مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ جو بھی چاہیں گی، میں وہی کروں گا اور کرواؤں گا۔“ زمر پھیکا سا مسکرائی۔ (اور جب وعدہ ٹوٹے گا تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گا؟)

”ابا چاہتے ہیں، میں اس سے شادی کر لوں، میں

197

کرلوں گی سعدی۔“

”میں نے کہا، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ وہ دروازے تک گیا، پھر رکا۔ مسکراہٹ مدھم مدھم ہو کر حزن میں بدلی۔ سر جھکائے، بنا مڑے، دھیرے سے بولا۔

”اور مجھے معاف کر دیجئے گا، میری ہر اس چیز کے لیے جس نے آپ کو نقصان پہنچایا، آئی ایم سوری، زمر میں جان بوجھ کر نہیں کرتا، پھر بھی میری وجہ سے کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے!“ اور پھر رکے، بنا یا ہر نکل گیا۔

زمر نے کنپٹی کو انگلی سے مسلا۔ اسے لگا، انگلیوں میں لرزش ہے۔ کرسی گھما کر رخ دائیں طرف کیا تو سنگھار میز پر لگا آئینہ سامنے آیا، اور اس کا عکس بھی۔ کرسی پر بیٹھی، گھنگھریالے خوب صورت بالوں والی لڑکی جس کے ٹاک کی لونگ دمک رہی تھی۔ مگر آنکھیں پریشان تھیں۔

تب ہی اس کا فون بجا۔ وہ چونکی۔ غیر شناسا نمبر آ رہا تھا۔ تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے، اس نے موبائل کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“

”پراسیکوٹر صاحبہ، مجھے تو پہچانتی ہوں گی آپ۔“ اور وہ فارس کی آواز کیسے نہیں پہچان سکتی تھی؟ فکر مند تاثر استبدلے۔ آنکھیں سنجیدہ اور سپاٹ ہو گئیں۔

”جی فارس۔ کہیے۔“

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتی ہیں کیوں ملنا چاہتا ہوں۔ وقت آپ بتائیں، جگہ میں بتاؤں گا۔“

اس نے آنکھیں میچ کر بہت سی کڑواہٹ اندر اتاری اور پھر ہموار کبجے میں بولی۔ ”اوکے! کل شام چار بجے مل سکتی ہوں میں۔ مگر کدھر؟“

”اسی ریسٹورنٹ میں جہاں آپ کو بلا کر گولی ماری تھی میں نے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟“

زمر کی آنکھوں کی سرد مہری مزید بڑھی۔ ”شیور۔“ اور موبائل کا بٹن زور سے دبا کر کال کالی۔ اذیت سی اذیت تھی۔

عکس چننے میں عمر گزری ہے

ایسا ٹوٹا ہے آئینہ مجھ سے

چھوٹے باغیچے والے گھر کے لاؤنج میں نی وی کا شور جاری و ساری تھا، اور حنین نفی میں سر ہلاتی اور اصرار چکر لگاتی پھر رہی تھی۔ دفعتاً ”وہ رکی“ اور تندہی سے صوفے پر بیٹھے سعدی کو گھورا۔

”وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔“

”کیا تم چند لمحوں کے لیے زمر اور اپنے تمام اختلافات بھلا کر ان کے لیے غیر جانب داری سے نہیں سوچ سکتیں؟“ وہ تھک سا گیا تھا۔ حنین نفی میں سر ہلاتی سامنے بیٹھی۔ ہاتھ سے ماتھے پر کٹے بال ہٹائے جو پھر دوبارہ وہیں گر گئے۔

”وہ اصل بات چھپا رہی ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بغیر کسی منفی وجہ کے ماموں سے شادی پر راضی ہو جائیں۔“ وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے وہ بڑے ابا کے کہنے پر ایسا کر رہی ہیں، اور دل میں ابھی ابھی ماموں کے لیے بغض ہو گا۔ شاید وہ سچ کی تلاش میں ہیں، ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے، تاکہ ان پر شک کرنا چاہیے۔“

”اوہ خدا۔ آپ لوگوں کو کیوں نہیں نظر آ رہا؟“ وہ متعجب، حیران پریشان تھی۔ ”وہ زمر یوسف ہیں، ان کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ فارس ماموں کو نقصان پہنچانا چاہتی ہیں، اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے۔“

”انہوں نے مجھے زبان دی ہے کہ وہ فارس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔“ وہ ایک ایک حرف بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ حنین چپ ہو گئی۔ سینے پر بازو لپیٹ لیے اور ابھی ابھی سی انگلی کا ناخن دانت سے کترنے لگی۔

”مگر۔“ چند ثانیہ بعد انگلی دانتوں سے نکال کر وہ حتمی انداز میں بولی۔ ”مگر میں ان پر یقین نہیں کر سکتی۔“

”بس کرو حنین۔“ ندرت کچن سے اکتا کر نکلیں۔ ہاتھ میں کفگیر تھا، گویا حنین کو دے مارنے کا ارادہ ہو۔ ان دونوں کے سامنے کھڑے، کمر پر ہاتھ رکھے، وہ جب

بولیں تو بے زار لگ رہی تھیں۔

”کوئی عقل ہے تم میں؟ وہ فارس کو برا بھلا کہتی تھی تب بھی ہم سب کو شکایت تھی اب نہیں کہہ رہی تب بھی تم اس کے پیچھے پڑی ہو۔ جب ایک دفعہ اس نے اپنے الزامات واپس لے لیے تو اسے معاف کرو اب۔“

”مگر وہ کیسے ہنسی خوشی ماموں سے شادی کر سکتی ہیں؟ حنین اب کے ذرا دھیمے لہجے میں بولی۔ لاشعوری طور پر کشن نے ہاتھ رکھ لیا۔ ادھر امی نے کفگیر گھمایا، ادھر اس نے کشن کو ڈھال بنایا۔

”کیونکہ اس میں تم سے زیادہ عقل ہے۔“ وہ بھی گویا تھک گئی تھیں۔ ”وہ بیمار ہے بیٹا اس کے گردے خراب ہیں اور بڑے ابا پہلے سے زیادہ بیمار رہنے لگ گئے ہیں۔ (حنہ نے آہستہ سے کشن چھوڑ دیا۔) اس کو فارس سے بہتر رشتہ نہیں ملے گا وہ سمجھ چکی ہے۔ اس لیے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے گزشتہ رویے کا ازالہ کرنے جا رہی ہے۔ تو تم دونوں کیوں میں میچ نکال رہے ہو؟“

”نہیں مجھے تو اب کوئی اعتراض نہیں۔“ سعدی نے فوراً ”ہاتھ اٹھا دیے اور احتیاط سے کفگیر کو دیکھا جو ہنوز امی کے کمر پر رکھے ہاتھ میں تھا۔ حنہ چپ چاپ لب کاٹتی رہی۔ چہرے کی خفگی اب تاسف اور ندامت میں بدل گئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ بس اتنا سا کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ندرت افسوس سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ ”اسے کیا ہو گیا ہے سعدی؟ یہ پہلے ایسی نہیں تھی۔“

سعدی نے گہری سانس لیتے رہمورٹ اٹھالیا۔

”ای۔۔۔ ہم میں سے کوئی بھی پہلے ایسا نہیں تھا۔“

ندرت کچھ منہ میں بڑبڑاتی پلٹ گئیں۔ سعدی وہیں بیٹھا رہا۔ پھرٹی وی چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا۔ سیم اس کے لیپ ٹاپ پر بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ ”آپ کو کمپیوٹر چاہیے بھائی؟“ اسے آتے دیکھ کر

تابع داری سے پوچھا۔

”اونہوں۔ تم بیٹھو۔“ اس نے جھک کر اسٹڈی ٹیبل کے نچلے دراز سے ایک چھوٹا سا باکس نکالا۔ اور الماری تک آیا۔ پٹ کھول کر احتیاط سے باکس کا ڈھکن الماری کے اندر کر کے ہٹایا۔ (سیم دور تھا۔ اس طرف اس کا رخ نہیں تھا۔) باکس کے اندر ایک پلیٹینم اور ہیروں کا جھلملاتا نیکلس رکھا تھا۔ (جو اہرات کا نیکلس جو اسے واپس کرنا تھا۔) اور ساتھ میں سفید رنگ کی فلیش ڈرائیو۔ اس نے ڈرائیو نکالی ڈب الماری کے اندر چھپا کر رکھا اور باہر نکل آیا۔

حنین اپنے بیڈ پر بیٹھی ایک رسالے کے ورق پلٹ رہی تھی جب سعدی چوکھٹ میں آیا۔

”یہ وہ فائلز ہیں جو مجھ سے نہیں کھلیں۔ کیا تم انہیں کھول دو گی؟“

وہ چونکی۔ سر گھما کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب در آیا۔

”میں۔۔۔ آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتی اب۔“

”کچھ دن اسے اپنے پاس رکھو۔ اگر موڈ بنے تو کر دینا۔ نہیں تو واپس دے دینا مگر اسے رکھو اور سوچو کہ تم میری مدد کرنا چاہتی ہو یا نہیں۔“

وہ فلیش اس کی سمت برسھائے ہوئے تھا۔ حنین کی آنکھوں میں خفگی تھی مگر اس نے چپ چاپ وہ پکڑ لی۔ سعدی چلا گیا تو وہ انھی الماری تک آئی اس کے نچلے جوتوں والے خانے کے برابر بیٹھی۔ ایک بڑا باکس نکالا۔ اس میں وہ لیپ ٹاپ ٹیبلٹ اور دوسرے ایسے کئی gadgets رکھے تھے جو اور نگریب کاردار نے اسے دیے تھے۔ علیشا کالا کٹ بھی ادھر ہی تھا۔ حنہ نے وہ فلیش بھی ان ممنوعہ اشیاء کے ساتھ رکھ دی اور ڈب بند کر کے اندر دھکیل دیا۔

پھر گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوچنا کیا تھا؟ جو طے کر لیا تو بس کر لیا۔



اپنے قاتل کی ذہانت پہ حیران ہوں میں

ہر روز ایک نیا طرز قتل ایجاد کرے ہے
مسی کی چلچلاتی سہ پہر پورے شہر کو گویا جھلسا رہی
تھی۔ ایسے میں اس پوش علاقے کا وہ ریسٹورنٹ خالی
لگ رہا تھا۔ دور کوئی اکاؤنٹ میز پر تھی ورنہ گرمی نے
کاروبار ٹھنڈا کر رکھا تھا۔

گھنگھریالے بالوں کو ہاف کیچر میں باندھے، کہنی
پر اس انکائے سیاہ منی کوٹ اور سفید لباس میں
لبوس زمر مناسب چال چلتی اندر داخل ہوئی اور
سیدھی دروازے کے قریب ایک میز تک چلی آئی۔
گئے برسوں میں ایک روز ادھر زر تاشہ بیٹھی دکھائی دی
تھی اب وہ کرسی خالی تھی۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ
وہ بیٹھ گئی اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ چارج
چکے تھے۔

ریسٹورنٹ کافی بدل چکا تھا۔ رنگ، فرنیچر۔ شاید
مینیو بھی۔ مگر اسے تو ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ سو
کوشش کی کہ بھوری آنکھوں کو میز پر رکھے گلدان پہ
جمادے اور ہلائے نہیں۔ ورنہ کچھ اندر تک ہل جانا
تھا۔

”لائگ ٹائم میڈم!“ وہ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھتے
ہوئے سنجیدگی سے بولا تو زمر نے آنکھیں اٹھائیں۔
آخری ملاقات کا منظر آنکھوں میں جھللا گیا۔ جیل کا
ملاقاتی کمرہ اور میز کے پار بیٹھا سفید کرتے شلوار اور
کسی ہوئی پونی والا فارس۔ (میں۔ معافی۔ نہیں
مانگوں گا!) پھر منظر بدلا اور چار برس پہلے کی زر تاشہ اسٹرا
لیوں میں دیائے ادھر بیٹھی نظر آئی اور اب۔ اب وہ
پوری آستین کی ٹی شرٹ میں لبوس ہاتھ باہم ملا کر میز
پر رکھے، چھوٹے کٹے بالوں کے ساتھ، ہلکی سنہری
آنکھوں کو سکیرے اسے دیکھ رہا تھا۔

ان تینوں مناظر میں زر تاشہ جیل والا فارس اب
کا فارس، ان سب میں اگر کچھ مشترک تھا تو وہ زمر
تھی۔ وہی بال، وہی سیاہ کوٹ، وہی سفید لباس۔ سب
آگے بڑھ گئے یا پیچھے رہ گئے، ایک اسی کی زندگی رکھی
ہوئی تھی۔

”لائگ ٹائم فارس!“ ویٹرنے آکر مینو کارڈ سامنے

رکھے۔ زمر نے کافی مشکوئی۔ فارس نے کچھ نہیں
منگوا یا۔

”تو کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے؟“ اس کی
آنکھوں میں دیکھ کر وہ ٹھنڈا سا بولی۔

”آپ کے والد نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ
سے شادی کر لوں۔“ اس کے تاثرات دیکھنے وہ رک۔
زمر نے ہلکے سے اثبات میں سر کو خم دیا۔

”مجھے معلوم ہے انہوں نے مسز کاردار کے کہنے
پہ ایسا کیا اور مسز کاردار نے میرے کہنے پہ۔“

فارس نے تعجب سے چہرہ را پیچھے کیا۔ پتلیاں سکیر
کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے زمر نے ابرو
اٹھائی۔

”کیوں آپ کو کیا لگا تھا؟ میں جھوٹ بولوں گی،
ادا کاری کروں گی، یہ ظاہر کروں گی کہ آپ کو معاف کر
دیا ہے، یا بے گناہ سمجھتی ہوں اور دل سے اس شادی پہ
راضی ہوں؟“ ذرا سے استہزاء سے نفی میں سر ہلایا۔
”آپ مجھے بالکل نہیں جانتے فارس!“

وہ پیچھے ہو کر بیٹھا، کھوجتی مشتہ نظروں سے اسے
دیکھ رہا تھا۔ اسے واقعی امید نہیں تھی کہ وہ خود ہی ہر
بات کا اعتراف کر لے گی۔

”آپ نے مسز کاردار سے ایسا کرنے کے لیے کیوں
کہا؟“

”کیونکہ مجھے چند دن پہلے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے
میرا رشتہ مانگا تھا اور میری امی نے انکار کیا تھا۔ اس سے
پہلے میں اتنے سال پہلے سمجھتی رہی کہ آپ نے مجھے
صرف استعمال کی شے سمجھ کر استعمال کیا، کو لیٹرل
ڈیمینج۔ مگر اب مجھے پتا چلا ہے کہ یہ ذاتی جنگ تھی۔
میں مظلوم نہیں تھی، انتقام لیا تھا آپ نے مجھ سے۔“
وہ خیریں پڑھنے کے انداز میں کہے گئی۔ کافی آگئی تو اس
نے کپ اٹھالیا۔ جلتا ہوا مالغ لیوں سے لگایا۔

”اچھا پھر؟“ وہ چبھتی آنکھیں اس پہ مرکوز کیے
ہوئے تھا۔

”اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اباب سے اب تک
میری آپ سے شادی کروانا چاہتے ہیں۔ سو میں نے

مسز کاردار سے کہا کہ وہ ایسا کروادیں۔ میں آپ سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ کافی اچھی ہے۔“ سراہ کر اس نے کپ واپس دھرا۔

”ہوں اور کس لیے؟“ جواب میں زمر نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”یہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے میں آپ سے آپ کے جرائم کا اعتراف کروا سکتی ہوں اور مجھے یہی کروانا ہے۔“

”تو اگر آپ مجھ سے انتقاماً شادی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟“

”کیونکہ آپ کے برعکس میں پیٹھ نہ وار کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آپ کو پہلے سے وارن کر رہی ہوں۔ میں یہ شادی آپ سے اعتراف جرم کے لیے کر رہی ہوں۔ اس لیے آپ چاہیں تو یہ شادی نہ کریں اور میرے ابا کو انکار کر دیں۔ فیصلہ آپ پر ہے۔“ کپ کے منہ پر انگوٹھا پھیرتی وہ کہہ رہی تھی۔ فارس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔

”اس آپشن کا شکریہ کیا میں اس پوزیشن میں ہوں کہ جب وہ اپنے منہ سے کہہ چکے ہیں تو ان کو انکار کر دوں؟“

زمر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”میں نے آپ کو مطلع کرنا تھا، کر دیا۔ مجھ سے شادی کریں گے تو اعتراف جرم کرنا ہی بڑے گا ایک دن۔ آگے آپ کی مرضی۔“ کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”پرسکون، مطمئن آنکھیں فارس پر جمی تھیں۔“

فارس آگے ہوا، میز پر ہاتھ رکھ کر اس کی سمت جھکا۔ ”کیا آپ مجھے چیلنج کر رہی ہیں؟“

”سچائی بتا رہی ہوں!“

”اور یہ سچائی کتنے لوگوں کو مزید بتانے کا ارادہ ہے آپ کا؟“

”اگر آپ نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔“ کپ پرے کر کے اس نے بیگ کی اسٹریپ کندھے پر ڈالی۔ ”سروسا مسکرائی“ اور اگر آپ کو شادی پہ کوئی اعتراض نہ ہو تو اتنا خیال رکھیے گا

کہ میرے نتیجے اور میرے ابا اس معاملے سے بے خبر رہیں، ہو ہمارے درمیان ڈسکس ہوا ہے۔ اس سب میں ان کو دکھ نہیں پہنچنا چاہیے۔“

”شیور!“ اس نے نئی سے گردن کو خم دیا۔

”کوئی اور سوال نہیں ہے تو میں جاؤں؟“ اور پرس تھامے ابھی کرسی دھکیلی اور جانے کے لیے مڑی۔

”صرف ایک سوال میم!“ وہ جیب سے والٹ نکالتے اٹھا۔ سر جھکائے چند نوٹ نکالے، میز پر رکھے اور چہرہ اٹھا کر ایسے دیکھا۔ وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

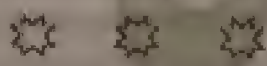
”اگر میرے خلاف اس ساری ان تھک محنت کے بعد آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں بے گناہ تھا تو کیا کریں گی آپ؟“

زمر جو اس کے مخاطب کرنے پر رکی تھی پرس پر ہاتھ رکھے کھڑی چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ آپ بے گناہ نہیں ہیں!“

پھر مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا یا اس نے جواب سوچا ہی نہیں تھا۔

فارس کان کی نو مستی سوچتی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔



ہو گلہ کسی سے کیوں اپنی مات کا ہی جب شہہ جو ولا دیں وہ اپنے ہی تو مہرے ہیں قصر کاردار میں اس رات ڈانگ ہال میں کھانا چن دیا گیا تھا اور ہاشم خالی سربراہی کرسی کے دائیں ہاتھ کی پہلی کرسی پر بیٹھا، نہہکن پھیلا رہا تھا جب اس نے لاؤنج کی سمت سے جواہرات کو آتے دیکھا۔

”کس کا فون تھا؟“ جواہرات پہلے سربراہی کرسی پر بیٹھی، لٹ انگلی سے پیچھے کی پھر کہنیاں میز پر رکھے دونوں ہاتھوں کو اوپر تلے رکھ کر تھوڑی ان پر جمائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ پیٹ کے ساتھ سفید شرٹ میں ملبوس سر جھکائے پلیٹ اپنی طرف کر رہا تھا۔
”فارس کا۔“

چاول پلیٹ میں نکالتے ہاشم نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

”برا منہ مت بناؤ۔ اس نے بتایا کہ وہ زمر سے شادی کے لیے راضی ہے اور یہ کہ میں زمر کے والد کو مطلع کروں۔“

”کیا اسے یہ اطلاع اپنی بہن کو نہیں دینی چاہیے تھی؟“

”ان کو بھی دے گا۔ مجھے تو بس یہ جتا رہا تھا کہ زمر نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے خود یہ بات شروع کرنے کے لیے مجھے کہا تھا۔“

کانٹے سے چاول لبوں تک لے جاتے ہاشم نے رک کر اچھٹے سے اسے دیکھا۔
”زمر نے اسے کیوں بتایا؟“

”اسے مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ اسے لگا ہو گا کہ میں اس راز کو اس کے خلاف استعمال کر سکتی ہوں اسی لیے بتا دیا۔ مجھے بھی اس کی امید نہیں تھی مگر ہر حال وہ ایک عقل مند عورت ہے۔“ گہری سانس لے کر جواہرات نے سلاو کے پیالے سے پیچ بھر کر اپنی پلیٹ میں ڈالا۔

”انتقام لینے کے ایک ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ اسے فارس سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بالکل بھی یہ سب پسند نہیں آ رہا۔“ وہ ناپسندیدگی سے کہتا پلیٹ پر جھٹکے کھا رہا تھا۔
”تمہیں کیا برا لگ رہا ہے؟“

”وہ شادی کے بعد ادھر۔“ ابو سے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا جس کے پار دور سبزہ زار انیکسی کھڑی تھی۔ ”ادھر آ کر رہنے لگ جائے گی۔ صبح شام مجھے اس کی شکل دیکھنی ہوگی۔ ناقابل برداشت۔“ منہ میں چاول رکھے برہم آنکھوں کے ساتھ چباتا رہا۔

”یہ ہمارے لیے زیادہ اچھا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔“ وہ

مسکرا دی۔

”شیر و کہاں ہے؟ کل بھی ڈنر یہ نہیں تھا۔“ تھوڑی خاموشی کے بعد ہاشم نے مقابل رکھی خالی کرسی کو دیکھ کر پوچھا۔

”دوستوں کے ساتھ باہر ہے۔ شاید۔“
”آپ نے پوچھا نہیں یہ کون سے نئے دوست نکل آئے ہیں اس کے؟“

”خود ہی تو کہتے ہو اس پر دباؤ نہ ڈالا کروں۔ سو خاموش ہوں۔“

ہاشم نے نپکین سے لب تھپتھپائے اور پھر اسے گویا میز پر بے پھینکا۔ جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ برہم نظر آ رہا تھا۔

”وہ ابھی تک شہری کی وجہ سے ایسا ہے؟“
”اس بات کو ڈیڑھ ہفتہ ہی تو ہوا ہے اتنی جلدی کیسے سنبھلے گا۔ خیر تم بات کر کے دیکھ لو۔ کیونکہ جب میں بات کروں گی تو پھر ایک ہی دفعہ کروں گی۔“ مسکراتے مگر سرد لہجے میں کہہ کر وہ کھانے لگی۔

”پھر کبھی سہی۔“ ہاشم میز سے سیل فون اٹھاتا کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں ہنوز غصہ اور ناگواری موجود تھی۔



تو محبت سے کوئی چال تو چل!
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھ کو!
ایار منٹ بلڈنگ کے اس فلور پر مدھم بٹیاں جل رہی تھیں۔ سیڑھیاں ویران تھیں، البتہ لفٹ کی بیرونی اسکرین پر نمبر بدلتا نظر آ رہا تھا۔

”وہنا“ لفٹ ادھر ہی رکی۔ دروازے، سس کی آواز سے کھلے۔ اندر سے اسٹریپ والا بیگ کندھے پر ڈالے جینز، ٹی شرٹ اور الٹی لی کیپ والا احمر نکلا۔ ماتھے پر کٹے بال اب کے کیپ کے اندر تھے اور لاہروا چہرے پر وہی تاثرات تھے جو ہمیشہ ہوتے تھے لبوں کو گول کیے، وہ مدھم سی سیٹی بجاتا اپنے دروازے تک آیا۔ چابی لاک میں گھمائی۔ اسے کھول کر اندر قدم

رکھا۔

راہداری میں اسی طرح سیٹی بجاتا آگے آیا۔ لاؤنج کی میز پر بیگ رکھا اور کیپ اتاری ہی تھی کہ ایک دم کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

پکچن کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پر فارس اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ کہنیاں کاؤنٹر پر جمائے وہ سافٹ ڈرنک کے کین سے گھونٹ بھر رہا تھا۔

”اوہ ایم جی!“ اصرار نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر پلیٹ کر راہداری کو اور پھر ہاتھ میں پکڑی چابیوں کو۔ ”کیا تم میرے گھر کالاک توڑ کر اندر آئے ہو؟“

فارس نے گھونٹ بھرتے بھرتے رک کر چہرہ گھمایا۔ چھوٹے سے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ ”یہ گھر ہے؟“ ”کم از کم جیل نہیں ہے۔“ وہ جل کر کہتا کاؤنٹر تک آیا اور خفگی سے اسے دیکھا۔

فارس اسی گرے پوری آستین کی شرٹ میں ملبوس تھا جو سہ پہر زمر سے ملاقات میں پہن رکھی تھی۔ ”میں نے پوچھا، تم میرے اپارٹمنٹ میں داخل کیسے ہوئے؟“

”اے۔۔۔ تمیز سے۔۔۔ کیا تم مجھے آپ نہیں کہا کرتے تھے؟“ اسے گھور کر دیکھا اور کین اونچا کر کے آخری گھونٹ اندر انڈیلا۔

”تب ہم اتنے بے تکلف نہیں تھے۔“ اس نے شانے اُچکائے ”اپنے سوال پر لعنت بھیجتا وہ فریج تک آیا اور کھول کر اندر جھانکا۔ پھر دروازہ بند کر کے برامنہ بنا کر پلٹا۔

”آخری کین تمہیں ہی مبارک ہو، غازی! اب بتاؤ، مزید کتنا سلحہ چاہیے؟“

دوسرا اسٹول کھینچ کر اس کے ہمراہ بیٹھا اور رخ بھی اس کی طرف پھیر لیا۔ جیل سے نکلتے ہی فارس نے اسے فون کر کے اسلحہ منگوایا تھا، جو اس نے اریج کر کے دے بھی دیا تھا۔

”اسلحہ نہیں چاہیے۔“ ”پھر؟“

”میں شادی کر رہا ہوں۔“ خالی کین ہاتھ میں

گھماتے اس نے گردن موڑ کر اصرار کو دیکھا۔ اصرار کا پہلے تو منہ کھل گیا۔ پھر اس نے بند کر لیا۔ پھر اثبات میں دو تین دفعہ سر ہلایا۔

”گڈ۔ مبارک ہو۔“ فارس نے ابرو اٹھا کر ”بس یہی؟“ والے انداز میں اسے دیکھا۔

”اور کیا پوچھوں؟“ ناراضی سے سر جھٹکا۔ پھر چھت کو دیکھتے ذرا سا سوچا۔

”ویسے کون ہے یہ بے چاری جس سے تم شادی کرنے جا رہے ہو؟“

فارس چند لمحے سوچتا رہا، پھر گہری سانس لی۔ ”جڑیل سے۔“

”نہ کرو بھی۔“ اصرار نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”اب اتنی کوئی بری شکل کی بھی نہیں ہوگی جو اسے جڑیل کہا جائے، پتا ہے یہ سب لڑکیاں۔“ بولتے بولتے ایک دم اسے بریک لگا۔ اسٹول سے جھٹکے سے اٹھا۔ نہایت بے یقینی سے فارس کو دیکھا جو ہنوز بیٹھا کین کو ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔

”وہ۔۔۔ وہ جڑیل؟ نہ کرو یا۔۔۔ وہ پراسیکیوٹر زمر یوسف؟“ اس کے کندھے کو جھنجھوڑتا وہ واپس اسٹول پر بیٹھا۔ آنکھیں ابھی تک بے یقینی سے پھیلی تھیں۔ ”مگر کیوں؟ دماغ تو ٹھیک ہے؟“ وہ حیران پریشان سا پوچھے جا رہا تھا، دفعتاً ”ڈور بیل بجی۔“

”کھانا منگوایا تھا۔ لے آؤ۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کین ڈسٹ بن کی جانب اچھالتے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو اصرار کو چاروٹا چار اٹھنا پڑا۔

پندرہ منٹ بعد وہ دونوں لاؤنج کے صوفوں پر آئے سانسے بیٹھے تھے۔ میز پر ٹیک اوے کے ڈبے کھلے پڑے تھے اور کھانا ختم ہوا چاہتا تھا۔

”میرا مشورہ مانو تو فوراً شادی سے انکار کر دو۔ ورنہ جو زمر صاحبہ تمہیں برا پھنسا میں گی نا، یاد رکھو گے۔“

فارس نے بے زاری سے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”نہیں کر سکتا انکار۔ اس کے باپ کے احسان ہیں مجھ پر۔ وہ نہ ہوتے تو میں یہاں نہ ہوتا۔“

”میں شادی کر رہا ہوں۔“ خالی کین ہاتھ میں

”اور ان کی بیٹی نہ ہوتی تو واقعی تم یہاں نہ ہوتے۔“

”بکومت۔“ وہ نشو سے ہاتھ صاف کرتا پیچھے ہو کر بیٹھا۔ بازو صوفے کی پشت پہ لمبا سا پھیلا لیا۔ اوپن کین کی سمت دیکھتے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”ویسے ایک بات سوچنے کی ہے۔ اگر اس کو تم سے...“ فارس نے نگاہیں اس کی جانب پھیر کر گھورا۔ احمر رکا۔ ”اگر ان کو تم سے۔“ (تصحیح کرتے بات جاری رکھی) اعتراف جرم کروانا ہے یا تمہیں مجرم ثابت کرنا ہے تو اس کے لیے شادی کرنے کی کیا ضرورت؟ مطلب یہ کام تو کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے وہ کیوں شادی کرنا چاہتی ہے“ جب آخری دفعہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا ”اچھا ہے جیل توڑو اور باہر جاؤ“ دوبارہ شادی کرو اور اس بیوی کو بھی مار دو۔ تم وائف کلرز کی سائیکسی۔ پتہ نہیں کچھ ایسا ہی بولا تھا اس نے۔“ ہلکے سے سر جھٹکا تو احمر کا منہ کھل گیا۔

”تم۔ تم ان کے نزدیک وائف کلر ہو اور۔ اور بیوی کو قتل کرنے والے ہمیشہ یہی تو کرتے ہیں۔“ احمر نے رنجوش انداز میں صوفے کے بازو پہ ہاتھ مارا۔ ”وہ پہلے قتل کے الزام سے بچ جائیں تو دوبارہ شادی کرتے ہیں اور دوبارہ قتل کرتے ہیں دوسری بیوی کو۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تم انہیں بھی مارنے کی کوشش کرو گے اور پکڑے جاؤ گے۔“

”نہیں۔ اسے اچھے سے پتا ہے کہ میں اسے نہیں ماروں گا۔ مگر باقی دنیا کو تو نہیں پتا۔“

”مطلب؟“ احمر نے اچھ کر اسے دیکھا۔ وہ دو انگلیوں سے ٹھوڑی کے بال نوچتے کہہ رہا تھا۔

”وہ مجھے زمر یوسف کے ارادہ قتل کے جرم میں پھنسانا چاہے گی۔ وہ واقعات کو اپنی مرضی سے ترتیب دے گی۔ ایسے کہ دنیا مان لے فارس غازی نے پھر سے زمر کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دفعہ لوگ اس کا یقین کر لیں گے۔“

احمر دم بخود بیٹھا سن رہا تھا۔ ذرا دیر کو خاموشی چھا گئی، پھر اس نے گویا جھرجھری لی۔

”سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اس سے شادی کر رہے ہو؟ ابھی بھی وقت ہے یا۔ اس کے باپ کو انکار کرو، یا یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔“ مگر فارس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس کے پاس میرا جرم ثابت کرنے کا یہ آخری راستہ ہے۔ میرے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا یہ آخری راستہ ہے۔ میں اس کو نہیں گناؤں گا۔ وہ اپنی پوری کوشش کر لے، تب بھی مجھے نہیں پھنسا پائے گی۔ کچھلی دفعہ اگر وارث کے قاتل مجھے سیٹ اپ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو وہ میری غلطی تھی۔“ وہ انگوٹھے کے ناخن سے ٹھوڑی مسلتا، میز پر بکھرے ڈبوں کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔ ”میرا بھائی قتل ہوا تھا، تو مجھے زیادہ احتیاط کرنا چاہیے تھی، مگر مجھے لگا تھا۔“ اس نے تلخی سے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”کہ مجھے کوئی پھنسا نہیں سکتا۔ تب تک میں لوگوں کو گرفتار کرتا آیا تھا، کوئی مجھے کیسے گرفتار کر سکتا تھا؟ مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو گا اسٹین۔ اس دفعہ میں تیار ہوں۔“

حتی سنگین پہلجے میں کہہ کر اسے دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ احمر ابھی تک فکر مندی سے اسے تک رہا تھا۔

”میڈم پراسیکیوٹر کا قصور نہیں ہے۔“ فارس نے اب کے نرمی سے اسے گویا تسلی دی۔

”ہاں وہ تمہیں پھانسی پہ لٹکا دے گی، تب بھی کہنا اس کا قصور نہیں ہے۔“ وہ جی جان سے جل گیا تھا۔

”اونہوں۔ یہ میرا قصور ہے۔ میرے بھائی کے دشمن اور میرے دشمنوں نے میری وجہ سے مجھے پھنسانے کے لیے ان کو زخمی کیا۔ اگر وہ مجھے مورد الزام ٹھہراتی ہیں تو وہ غلط نہیں ہیں۔“ چابی اور فون اٹھا کر وہ راہداری کی جانب بڑھ گیا۔

”مجھے پتا ہے کیا لگتا ہے؟“ عقب سے احمر کی آواز پہ اس کے قدم رکے۔

”مجھے لگتا ہے یہ سب وہ بہانے ہیں جو تم نے

کر کھنٹوں کے گرد بازوؤں کا ملاقہ بنالیا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔

”آپ سوئے نہیں ابھی تک؟“ بڑے ابا نے نم آنکھوں سے اس کا چہرہ دکھا۔ سیاہ روپے کے بالے میں وہ گندی چہرہ تھا۔ خوب صورت نہیں تھی وہ مگر اچھی شکل کی تھی۔ پرکشش اور کچھ اس کا ٹھنڈا پر سکون انداز تھا جو اسے پرکشش بناتا تھا۔ وہ بھگو بھگو کر اور لپیٹ لپیٹ کر بھی اسی ٹھنڈے انداز میں مارا کرتی تھی اور اپنی نرمی اور نرمی کے باوجود وہ ان کو بہت پیاری تھی۔

”تم ناراض ہو کیا؟“ انہوں نے اس کا سوال شاید سنا ہی نہیں۔ بس کیلی آنکھوں سے دیکھتے اپنی پوچھ گئے۔

”نہیں ابا۔ میں کیوں ناراض ہوں گی؟“

”تم نے سعدی سے کہا کہ تم شادی کر لو گی فارس سے۔ کیا یہ ناراضی میں کہا؟“ زمر کی آنکھوں میں کچیائی سی ابھریں مگر وہ ان کو چھپا کر مسکرا دی۔

”زمر سے کوئی زبردستی کروا سکتا ہے کیا؟“

”پھر بیٹے! تم کیوں شادی کر لو گی اس سے؟ تم انکار کرنا چاہتی ہو تو کرو۔ میں ساری بات یہیں ختم کروں گا۔ وہ بھی پتا نہیں کسے میں مسز کاردار کی وجہ سے وہ سب فارس سے بول گیا۔“ شکستگی سے لہجے میں سر ہلاتے وہ سخت رنجیدہ خاطر لگ رہے تھے۔

”اس روز جس شادی پہ میں سعدی لوگوں کے ساتھ گئی تھی نا، ادھر میں نے حماد کو دیکھا۔ کرن بھی ساتھ تھی اور دنیچے بھی۔“ وہ اداسی سے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

”تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے ورنہ میں صرف خود کو اور باقی سب کو نقصان دوں گی۔ اس لیے اب میں اس فیصلے پہ عمل درآمد کرنے جا رہی ہوں، تاکہ ہم سب کی زندگی میں بہتری آئے، ہم سب اس ناسور سے جان چھڑالیں جو چار برس قبل ہماری زندگی میں آیا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر تم دل سے فارس سے شادی پہ

گھڑے ہیں۔ اس کے ابا کے احسان اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع اس کے دکھوں کی وجہ تمہاری ذات کا ہوتا۔ اونہوں۔ سب بہانے ہیں غازی۔“ وہ بکھرے ڈبے سمیٹتا سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ فارس نہیں مڑا، وہیں رکا کھڑا رہا۔ آنکھیں ہیرونی دروازے پہ لگی تھیں اور گردن میں ڈوب کر ابھرتی مگٹی واضح دکھائی دی تھی۔ اسے پتا تھا اسٹپنی کیا بکنے والا ہے۔

”تم اسے پسند کرتے ہو اور اسے کھوتا نہیں چاہتے۔ یہ پہلی وجہ ہے۔ باقی وجوہات اس کے بعد آتی ہیں۔“

”بکومت!“ وہ بنا پلٹے مدھم آواز میں بولا، تیز قدموں سے باہر نکلا اور دروازہ زوردار ”ٹھاہ“ سے بند کیا تو ڈبے اکٹھے کرتے احمر کے ہاتھ سے کچھ کرتے گرتے بچا۔

”آؤچ!“ اس نے خفگی سے راہداری کی سمت دیکھا۔ ”سچ بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا، اسٹپنی۔ اونہوں، احمر۔“ ناگواری سے تصحیح کرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔



کتنی عجیب بات ہے جو نہ چاہتا تھا میں قسمت سے اس طرح کا مقدر ملا مجھے یوسف صاحب کا بنگلہ رات کے اس پہر خاموش اور اداس پڑا تھا۔ لاؤنج کی کھڑکی سے اندر جھانک تو سب تاریک تھا، سوائے یوسف صاحب کی دھیل چیمڑ کے جسے وہ خود چلاتے راہداری کی سمت لے جا رہے تھے۔ سناٹے میں پیوں کی چیں چیں نے جیسے کوئی مدھم سا نوحہ بلند کیا۔ پھر اس میں زمر کے کمرے کے دروازے کی چرچراہٹ بھی شامل ہوئی جسے دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئے۔

وہ جائے نماز پہ بیٹھی دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹے، سلام پھیر چکی تھی اور اب دعا مانگنے کے بجائے محبتیں جائے نماز پہ انگلیاں پھیرتی کچھ سوچ رہی تھی۔ آہٹ نہ چونک کر گردن موڑی۔ انہیں دیکھ کر نرمی سے ہنسنے لگی اور رخ ان کی سمت پھیرتے ہوئے اکڑوں بیٹھ

بازخواتین ڈائجسٹ 206 مئی 2015

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY

راضی ہو؟“

”قاتلوں کو ہم اس لیے سزا دیتے ہیں ابا! تاکہ وہ مزید موصوم لوگوں کی زندگیوں سے نہ کھیلیں۔ اس شخص نے ہمیشہ ان ہی کو نقصان دیا ہے جو اس کے لیے اپنائیت رکھتے تھے اور اب آپ سب اس کے لیے اپنائیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف میرے لیے نہیں ابا! یہ ہم سب کے لیے ہے۔ ہمیں فارس غازی نامی ناسور کو اپنی زندگیوں سے اسی طرح نکالنا ہو گا۔“ اداسی سے سوچتی وہ دپٹے کی تیس چہرے کے گرد سے کھولنے لگی۔

”میں اپنی زندگی سے یہ ناسور اکھاڑ پھینکنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہوں ابا! فارس سے شادی تو چھوٹی بات ہے۔“ وہ بہت ضبط سے مسکراتی اس کا نام لے کر کہہ رہی تھی۔

”اور تم نے اس کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا کیا؟“ ان کے چہرے پر امید جاگی تھی پھر بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ گھٹنوں کے گرد بازو پیٹے بیٹھی زمر نے سر اثبات میں ہلایا۔

”میرے خیالات اس کے بارے میں بالکل کلیئر ہیں“ اگر کوئی ابہام تھا بھی تو وہ دور ہو چکا ہے۔ میں اس سے ملی تھی شام میں، ہم دونوں نے اس بارے میں بات کی، اپنی ترجیحات بتائیں، اور وہ میری طرف سے مطمئن تھا۔ جب ہی اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس کے متعلق میرے دل میں کوئی میل نہیں، کوئی بغض نہیں، مگر اتنا کہوں گی کہ اس شادی کے بعد کم از کم ہم سب سچائی سے واقف ہو جائیں گے۔“ اس نے سچ سچ بتا دیا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے اور ابا کیا سمجھیں گے۔

”اچھا تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟“ انہوں نے قدرے تسلی بخش انداز میں سر ہلاتے ہوئے صرف اپنی خواہش کا مطلب سمجھا۔

”جی، بالکل۔ اس نے تحمل سے میری فیملینگز سنیں اور پھر وہ رضامند ہو گیا۔ اور اگر وہ راضی ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس سے شادی کر کے ایک نئے سفر کا آغاز کرنا چاہوں گی ابا“ اور یہی سفر ہم سب کو حقیقت پسند بنائے گا۔“

اور پھر وہ نرمی سے مسکراتی۔ بڑے ابا نے بازو بڑھا کر اس کا دپٹے میں لپٹا سر تھپکا اور ہلکی سی مسکراہٹ اور ڈھیروں سکون کے ساتھ واپس پلٹ گئے۔ جب ان کی وہیل چیئر یا ہر نقل گئی تو زمر کی آنکھوں کی نرمی عجیب سی تکلیف میں بدل گئی۔ وہ ست روی سے اٹھی اور دروازہ بند کیا۔ پھر دروازے سے کمر لگا کر چند لمحے کھڑی رہی۔



اتنا بھی صبر و شکر کا قائل نہیں یہ دل کہ ہر کیفیت میں آپ کے گن گائے جائے گا اگلی صبح شہر پہلے سے بھی گرم طلوع ہوئی تھی۔ چھوٹا باغیچہ دھوپ میں جھلس رہا تھا۔ گھاس دیک رہی تھی۔ پھول جل رہے تھے اسے میں گھر کے اندر کولر کی ٹھنڈی، نم ہوائے گرمی کو کم کر رکھا تھا اور وقفے وقفے سے اس کولر سے اڑتے پانی کے چھینٹے کبھی سامنے بیٹھے فارس کو جا چھوتے تو کبھی حنین کو آگتے۔ ندرت لینڈ لائن کا ریسپور کان سے لگائے بات کر رہی تھیں اور ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا فارس، جس کا ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا تھا، انہیں دیکھ رہا تھا۔ مقابل صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی حنین گھٹنوں پہ آم کی پلیٹ رکھے، بیزار سی قاشیں کاٹ رہی تھی۔

”جی۔ یہ فارس نے ہی مجھ سے کہا ہے بڑے ابا۔“ ندرت نے کہنے کے ساتھ فارس کو دکھا۔

”جی وہ اسی اتوار کی بات کر رہا ہے۔ جی ابا! میں نے بھی اس سے کہا تھا کہ اتوار میں صرف تین ہی دن ہیں، مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ دیر نہیں کرنا چاہتا۔ آپ زمر سے پوچھ کر بتادیں، اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے تو۔“ وہ رک کر بات سننے لگیں۔ چہرے پہ سکون اور خوشی تھی۔

”جی ابا۔ ٹھیک ہے۔ میں فارس کو بتا دیتی ہوں۔“

”ای سے کہہ دیں، وہ انکار کر دیں گی۔“ نیا آئیڈیا

پیش کیا۔

”تم کیوں چاہتی ہو میں انکار کروں؟“

”کیونکہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ غلطی کرنے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کو پسند نہیں کرتیں،

پھر کیسے رہیں گے ان کے ساتھ؟“

”تمہیں لگتا ہے میں بھول گیا ہوں جو انہوں نے

میرے ساتھ کیا تھا؟“

حنین نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا نہیں بھولے؟“

”چار سال!“ فارس نے انگوٹھا اندر کر کے چار

انگلیاں اسے دکھائیں۔ ”چار سال اس عورت نے جو

میرے ساتھ کیا، مجھے جس طرح ذلیل کے رکھا، پوری

دنیا کے سامنے مجھے قاتل ثابت کرنے کی کوشش کی،

میرا ساتھ نہیں دیا، وہ سب بھولا نہیں ہوں میں۔“ اور

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں سختی در آئی تھی۔

حنین بالکل ساکت ہو کر اسے دیکھنے لگی، پھر سر نفی

میں ہلاتی پیچھے ہٹی۔

”تو آپ یہ شادی مجبوری میں، زبردستی نہیں کر

رہے؟ آپ ان سے انتقام لینا چاہتے ہیں؟“ اس کی

آنکھوں میں بے یقینی پھیلی تھی۔

”نہیں، صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی

ہیں۔“

مگر حنہ نے ”او نہوں“ نفی میں گردن ہلائی۔ ”یونو

واٹ ماموں، آپ یہ شادی کر لیں۔ آپ دونوں ایک

دوسرے کو ڈیزرو کرتے ہیں۔“

جل کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارس ہلکا پھلکا سا

مسکرایا۔ اسے حنہ کی بات نے لطف دیا تھا۔ گردن اٹھا

کر اسے دیکھا جو پہلے کی طرح اب عینک نہیں لگاتی

تھی۔

”عینک والی حنہ کہاں گئی؟“ اس کے چہرے پہ کچھ

کھوجتے وہ جیسے سوچنے لگا۔

”آپرٹ کروالی تھیں آنکھیں۔ اب تو عینک بھول

بھال گئی۔“ اس نے نظریں چرائیں۔ ادھر ادھر دیکھنے

شکریہ ادا۔ ”منون رکھ کر وہ اس کی جانب مڑیں۔

”وہ کہہ رہے ہیں، نکاح کے لیے اتوار کا دن ٹھیک

ہے۔ من گئے ہیں۔“

فارس نے بوجب سے ابرو اکٹھے کیے۔ ”اپنی بیٹی

سے بات کیے بغیر؟“

”ان کا کہنا ہے کہ باب دوسری طرف سے تاریخ

مانگی جائے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے دو دفعہ بھی تو

یہی ہوا تھا نا۔ اب وہ ڈر گئے ہیں۔ مگر تم مجھے بتاؤ، اتنی

جلدی بچانے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ فرصت سے

اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”زیادہ دیر کی تو شاید میں اپنا ذہن بدل لوں۔“ ہلکے

سے شانے اچکا کر وہ کولر کی سمت دیکھنے لگا۔

”دو دن میں کیا تیاری ہوگی؟ مانا کہ صرف گھر کے

لوگ ہوں گے مگر کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔“

”ای! میرے کپڑے بھی لینے ہیں۔“ حنین نے

قاش کھاتے لقمہ دیا۔

”میرے کپڑے بھی۔“ اندر سے سیم نے گلا پھاڑ

کر پکارا۔

”ہاں، بس زمر کا ڈریس لوں یا نہیں، تم لوگوں کی

چیزیں پوری ہونا چاہئیں۔ اٹھو، نماز پڑھو۔“ جل کر

کہتی، گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر انھیں اور کمرے کی طرف

چل دیں۔

”ابھی بھی وقت ہے، انکار کر دیں، ماموں۔“ حنہ

نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

”میں سن رہی ہوں حنین۔ فضول بکواس مت کیا

کرؤ۔ اٹھو نماز پڑھو۔“ اندر سے امی کی غصیلی آواز

یہاں تک آئی، مگر وہ سکون سے آم کی قاش کو ہاتھوں

سے منہ کے اندر لے جاتی رہی۔

”میں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے مجھ پہ

احسان ہیں۔“ اس نے آواز دھیمی کر لی۔

حنین پہلے رس والے ہاتھوں سے چھلکوں کی پلیٹ

اٹھائے کھڑی ہوئی اور کچن میں چلی گئی۔ جب واپس

آئی تو ہاتھ منہ دھلا ہوا تھا۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتی وہ

اس کے قریب صوفے پہ بیٹھی۔

لگی 'پھر دوبارہ اسے دیکھا تو وہ ہنوز پر سوچ نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

"تم میں کچھ بدل گیا ہے۔" چند دن لگے تھے مگر اس نے بھی بھانپ لیا تھا۔ اور حنین نے بے اختیار سوچا کہ پچھلا ڈیڑھ برس زیادہ اچھا تھا جس میں اتنے رشتے داروں سے میل ملاپ نہیں ہوا اور کسی نے اس سے یہ بات نہیں کہی جو ان ڈھائی ہفتوں میں کئی لوگ کہہ چکے تھے۔

"وہی ہی ہوں۔ اتنا ہی کھاتی ہوں۔ اتنا ہی بولتی ہوں۔ آپ بات کو بدلنے کی کوشش نہ کریں۔" خفگی سے کہتے اس نے ریمورٹ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے اسی کی چنگھاڑ سنائی دی۔

"سیم! حنین! میں جو تانا ماروں گی تو تم لوگ اٹھو گے نماز کے لیے؟"

حنین نے پیرنچ کر ریمورٹ رکھا اور غصے سے بڑبڑائی۔ "پتا نہیں ان زبردستی کی نمازوں کا کیا فائدہ۔" اور سر جھٹک کر کمرے کی طرف چلی گئی۔

فارس لی وی کی اسکرین کو دیکھتا کچھ سوچتا رہا۔



ایک شکست کے بدلے مجھ کو سب کے سب الزام نہ دے کچھ کچھ تیری بات ہے سچی لیکن پوری ٹھیک نہیں! اگلی صبح قصر کاردار پہ سہرے پر پھیلائے یوں روشن ہوئی کہ برآمدے کے اونچے سفید ستون سونے کی مانند چمکنے لگے۔ ایسے ہی ایک ستون کے ساتھ ہاشم موبائل پہ بٹن دیا تا چلا آ رہا تھا۔ گرے پن اسٹرائپ سوٹ میں ملبوس 'بال جیل سے پیچھے کیے' وہ آفس کے لیے تیار تھا۔ ساتھ چلتی جواہرات نے مسکرا کر اسے دیکھا 'وہ کوئی مسیج ٹائپ کرتے' اوپری زینے پہ رکا تھا۔ نیچے سبزہ زار پہ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ایک ملازم نے بریف کیس اندر رکھ دیا تھا 'دو سرائوروازہ کھولنے کھڑا تھا۔ پیغام بھیج کر اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ "آپ آرام سے آئیں گی آفس؟" "ہوں۔ دس بجے تک۔"

"شیرد کو لے کر آئیے گا، میں۔" فون کی بجتی گھنٹی

پہ وہ رکا 'ایک منٹ کا اشارہ کیا اور فون کان سے لگایا۔

"ہاں بولو۔ اچھا۔ ہاں ٹھیک ہے، تم میری انجیو کو دے دو کام وہ سنبھال لے گی۔"

فون بند کر کے جواہرات کا گال جو منے آگے برہا کہ وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ ہاشم پہلے حیران ہوا، پھر جواہرات کی بے یقینی سے پھیلی آنکھوں کو دیکھا تو گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔

"مجھے اس سعدی والے معاملے نے مصروف کر دیا،

ورنہ میں آپ کو بتانے والا تھا۔"

"کیا تم نے کہا، میری انجیو؟" وہ ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب تک آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جانا چاہیے۔"

"کیا تم نے کہا میری انجیو؟" وہ مضطرب مگر بلند

آواز میں بولی۔

"میں نے اسے ڈی پورٹ نہیں کروایا، اس کی انجیو سے بھی بات نہیں کی۔ آپ سے کہا تھا کروں گا، مگر نہیں کیا۔ مجھے فیکٹری میں کچھ لوگوں کی نگرانی کروانی تھی، میری سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا، سو میں نے اسے روک لیا۔"

"تم یہ کیسے کر سکتے ہو ہاشم؟" جواہرات کا اضطراب غصے میں ڈھلنے لگا۔ "کیا تم بھول گئے، اس نے میرا نمکلیس چرایا تھا۔"

"وہی نمکلیس جو ڈیڑھ ہفتے سے سعدی کے پاس ہے؟"

"بات چوری کی ہے، اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا تھا۔"

"یہی بات اس کو زیادہ قابل اعتبار بناتی ہے مہی! اس نے چوری کی، مگر پھر جھوٹ نہیں بولا۔ وہ کتنے سال ہمارے خاندان کے ساتھ وفادار رہی ہے، اس کا بچہ بیمار تھا اس لیے اس نے یہ کر دیا۔"

"تم کیسے اس کو دوبارہ کام پہ رکھ سکتے ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ اب تک بے یقین تھی۔

"ریلیکس مہی۔ صرف ایک مہینے کی بات ہے، میرا

کام ہو جائے میں اسے واپس بھجوا دوں گا۔“
 ”وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرے گی ہاشم! تمہیں اس

پہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“
 ”کیوں فکر کرتی ہیں؟ ہاشم سب سنبھال لے گا۔

صرف ایک مہینہ ہی تو ہے، ممی۔“ اس کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر گویا تسلی دی اور مسکرا کر الوداعی کلمات کہتا برآمدے کے زینے اترنے لگا۔ جواہرات سفید پریشان چہرہ لیے کھڑی، اضطرابی انداز میں لاکٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔

(ڈیڑھ سال لگا اسے ہاشم کی وفادار ملازمہ کا بھروسہ توڑنے میں، اتنی مشکل سے ایسے اس سے جرم کروایا کہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ اس کا اصل جرم کیا تھا۔ اور اس سب کے باوجود بھی وہ اسی شہر میں تھی۔ مگر وہ کھلم کھلا اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاشم کو شک ہو گیا تو۔۔۔ نہیں۔) وہ نفی میں سر بلاتی اندر کی طرف مڑ گئی۔

ہاشم کی گاڑی جب مرکزی گیٹ تک آئی تو ایک دوسری گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈرائیونگ اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھی شہرین کا چہرہ دیکھ کر ہاشم کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ ایک اشارہ ڈرائیور کو کیا، دوسرا مقابل کار میں موجود شہرین کو۔ ڈرائیور نے کار سائیڈ پہ لگا دی اور باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد، پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر شہرین ساتھ بیٹھی۔ وہ صبح کی مناسبت سے سفید بنا آستین کی اونچی قمیص اور بیج ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ سنہرے باب کٹ بال چونچ کی صورت چہرے کے اطراف میں آتے، سائیڈ کی مانگ اور سنہرے چہرے پہ شدید فکر مندی کیفیت۔

”میں تمہیں تین دن سے کال کر رہی ہوں، تم اٹینڈ نہیں کر رہے۔“ اس کی طرف چہرہ کر کے بیٹھی مضطرب سی کہنے لگی۔ ”ہاشم! میں سونیا کی ماں ہوں، میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں اس کے بغیر کیسے رہوں گی؟“

وہ سر جھکائے موبائل پہ ٹن دبا رہا تھا، آخری بات پہ ہاتھ رکا۔ سخت نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں یہاں اس لیے بٹھایا ہے تاکہ ملازموں کے سامنے تماشہ نہ بنے۔“ (شہرین نے بے اختیار چہرہ موڑ کر دیکھا۔ دور کھڑا ڈرائیور۔ داخلی گیٹ پہ مامور سکیورٹی اہلکار۔) ”تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں جن میں سے دو تم ضائع کر چکی ہو۔ جو کہنا ہے کہو اور چھٹے منٹ سے پہلے تمہیں میری گاڑی سے باہر ہونا چاہیے۔“

”میں نے فلائٹ آگے کر والی ہے۔ سوموار اور منگل کی درمیانی رات کو جانا ہے۔ صرف ایک مہینے کے لیے۔ پلیز سونی کو میرے ساتھ جانے دو۔“

”سونی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ بات ختم۔“ تنے ابرو اور خشک لہجے کے ساتھ اس نے کہا تو شہرین کے چہرے کی پریشانی بڑھ گئی۔

”ہاشم! ایک ہفتے سے میں نے سونی کو دیکھا تک نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے گھر ہے، میں۔۔۔“
 ”وہ اپنے باپ کے گھر ہے اور اب یہیں رہے گی۔“

”میں اس کی ماں ہوں۔“

”یہ بات تمہیں میرے خلاف اس لڑکے کی مدد کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“ لٹخی سے کہتے ہاشم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے ہاشم اور اپنے درمیان سیٹ کا فیبرک بے بسی سے بھینچا۔

”وہ میرا دوست ہے، وہ میرے کئی کام کر چکا ہے۔ میں صرف اس کا فیور لوٹا رہی تھی۔ وہ تمہارا دوست ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے خلاف کچھ کر رہا ہو گا، میں تو اسے کوئی ایڈو سخر سمجھی تھی۔“

”ہر چیز ایڈو سخر نہیں ہوتی شہری۔“ درشتی سے کہتے اس نے دور کھڑے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

”اسے کہو، جو اس نے میرا چرایا ہے، وہ واپس کر دے تو میں سونی کو تمہارے ساتھ جانے دوں گا ورنہ نہیں۔“

”وہ تو مجھ سے بات بھی کرنے کا روادار نہیں۔ وہ۔۔۔“

”تمہارے پانچ منٹ تمام ہوئے۔ اب جاؤ۔“ اور

موبائل اٹھا کر بٹن دبائے لگا۔ شہرین بے بسی سے اسے دیکھتی رہی، پھر دروازے کی طرف مڑی اسے کھولا اور ہیل والا پیر زمین پر رکھا ہی تھا کہ سر جھکائے موبائل پر بٹن دیا تاہم دھیسے سے بولا۔

”اور وہ میرا دوست نہیں ہے۔ ہاشم کے دل سے جو اتر گیا، سوا اتر گیا۔“

شہرین ایک پاؤں روش پر رکھے، دروازہ پکڑے چند لمحے کو بالکل سن سی رہ گئی۔ کچلے میں آنسوؤں کا گولا سا پھنسا، مگر پھر آنکھوں کی کمی اندر جذب کر کے وہ گردن اگڑا کر باہر نکلی اور دروازہ دے مارنے والے انداز میں بند کیا۔ کارزن سے آگے بڑھ گئی تو وہ مڑی۔ پتھریلی سڑک اوپر جاتی تھی۔ اور اٹھان پر قصر کاردار تھا، پر عزم آنکھوں سے اس نے اس اونچے محل کو دیکھا اور قدم قدم اوپر چڑھنے لگی۔ اس گھر میں ابھی ایک اور شخص تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔



نہ گنواؤ، ناوک نیم کش، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تن داغ داغ لٹا دیا یوسف صاحب کے بنگلے میں وہ صبح پہلے سے زیادہ مصروف طلوع ہوئی تھی۔ لاؤنج میں بڑے ابا و ہیل چیرے بیٹھے، بار بار فکر مند نگاہ اٹھا کر زمر کے کمرے کی سمت دیکھتے تھے جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ فجر کے ساتھ ہی یہ ہلچل شروع ہو چکی تھی اور اب تک جاری تھی۔

”صداقت“ یہ باکس پکڑاؤ۔ ”صداقت“ یہ کتابیں اس کارزن میں ڈالو۔ ”صداقت“ یہ گیرج میں رکھ آؤ۔ ”ساتھ میں زمر کی ہدایات بھی سنائی دے رہی تھیں۔ بڑے ابا خاموشی مگر بے چینی سے راہداری پر نگاہیں مرکوز کئے بیٹھے اس دوسرے جوتے کا انتظار کر رہے تھے جو زمر نہیں پھینک رہی تھی۔

دفعتا ”وہ آتی دکھائی دی۔ رف کپڑوں میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے، دونوں ہاتھوں میں خاکی کارزن پکڑے اس نے لاؤنج کے فرش پر کارزن دھرا اور

صوفے پر بیٹھ گئی۔

”صداقت۔“ کارزن کا چار ٹکڑوں والا ڈھکن بند کرتے اس نے آواز دی۔ وہ بھاگا آیا۔ ساتھ ہی ڈکٹ ٹیپ اور قینچی اسے تھمائی۔

”اس میں میرے اہم ڈاکو منٹس ہیں، جب فارس صاحب کے گھر جاؤ تو ان کو میرے دوسرے سامان کے اوپر رکھنا، کسی چیز کے نیچے نہ دے دینا۔“ ٹیپ سے ڈھکن کو سیل کرتے وہ سادگی سے ہدایات دے رہی تھی۔

”جی بابی۔“ وہ تابع داری سے سر ہلا رہا تھا۔ جب کارزن بند ہو گیا تو اسے اٹھا کر گیرج میں رکھنے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں واپس جانے لگی کہ ابھی اور بہت کام رہتا تھا۔

”تم یہ کن کاموں میں لگی ہو؟“ وہ آگے چلے تھے۔ زمر گہری سانس لے کر ان کی طرف مڑی۔ ”آپ نے خود ہی کہا کہ سنڈے کو میری شادی ہے، تو اپنا سامان پیک کر رہی ہوں۔“

”کیا تمہیں برا لگا ہے؟ اگر کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ“ میں۔۔۔

”ابا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پریشان مت ہوں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے جلد شادی سے کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے بس آپ کی فکر ہے۔“ ”میں سعدی کے گھر چلا جاؤں گا، یہ گھر مہینے کے آخر تک خالی کر دوں گا۔“

”اور سب کچھ سیٹنا تو مجھے ہی ہے نا۔“ زمری سے مسکرا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تم نے اپنے کپڑے نہیں لیے۔“ ان کی پریشانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

”بھابھی نے کہا تھا، وہ شام کو آئیں گی اور ہم اسٹے جا کر لے لیں گے۔“ وہ نرم آنکھوں سے مسکراتی رسان سے بتا رہی تھی۔ بڑے ابا نے متفکر نظروں سے اس کا چہرہ کھوجا۔

”مگر تم اس جلد شادی سے خوش تو ہونا؟“

”ابا! جو بعد میں ہونا ہی ہے، تو اسے ابھی کر لینا

میں خواتین ڈائجسٹ 212 مئی 2015

چاہیے۔ مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ اچھا میں اب اپنے کپڑے پیک کر لوں۔“ ان کی تسلی کر کے وہ آستین فولڈ کرتی راہداری میں آگے چلتی گئی۔ ابا نے بس سر ہلا دیا۔

وہ کمرے میں آئی اور کھلے سوٹ کیس کو دیکھا جس کے ساتھ ہینگریز میں نیگے کپڑے پڑے تھے۔ اس نے ان کو ہینگریز سے اتار کر تہہ کرنا شروع کیا۔ ابھی راہداری میں قدموں کی آواز آئی۔

”صداقت! یہ جو شاہپرز ہیں“ ان کو۔“ مصروف انداز میں کہتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو یکدم منجمد ہو گئی۔

جو کھٹ میں صداقت کھڑا تھا۔ سر جھکا تھا۔ ذرا شرماتا، ذرا ہچکچاتا۔ دونوں ہاتھوں میں خاکی لفافے میں لپیٹا ہوا کچھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ بالکل ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔

”با جی۔۔۔! وہ جو میری چاچی آئی تھی تا اس دن گاؤں سے؟ کل وہ پھر آئی تھی۔ اس کو بتایا تھا کہ با جی کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ وہ گاؤں سے لائی تھی آپ کے لیے۔“ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا اور خاکی لفافے میں لپیٹی شے برسائی۔

”یہ۔۔۔“ زمر نے اسے تھاما اور لفافہ ہٹا کر دیکھا۔ اندر شیشوں اور کڑھائی والی شال تھی۔

”ہمارے ہاں جی بنیوں کو شادی پہ یہ ضرور دی جاتی ہے۔ تو میں نے چاچی سے کہا کہ ایک با جی کے لیے بھی لے آئے۔“ انگلیاں مروڑ کر، سر جھکائے شرابا کر صداقت کہہ رہا تھا اور زمر بس ہاتھ میں پکڑی شال کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ بہت خوب صورت ہے صداقت۔“ وہ بمشکل پھیکا سا مسکرائی۔ ”چاچی کو شکریہ کہنا، مگر تم نے خواہ مخواہ اتنا خرچ کیا۔ میری شادی۔“ حلق میں کوئی پھندا سا لگا۔ ”کوئی عام شادیوں کی طرح تھوڑی ہے؟“ ”پر با جی! شادی تو ایک ہی دفعہ ہوتی ہے، جیسے بھی ہو۔“ اس نے کوئی فلسفہ گھڑنا چاہا مگر نہیں گھڑ پایا۔ سو جلدی سے شاہپرز اٹھانے لگا۔

”ان کو باہر رکھ آتا ہوں جی۔“ وہ چلا گیا اور زمر کھڑی اس شال کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کرجیاں سی چبھ رہی تھیں۔ تکلیف سی تکلیف تھی۔ پھر شال ہاتھوں میں پکڑے، وہ ایک دم پھر نکلی۔ راہداری میں وہ ٹھہری۔ ابا وہیل چیمپرہ بیٹھنے لی وی دیکھ رہے تھے۔

”ابا! میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ یہ اصلی شادی نہیں ہے۔ میں صرف اس کو برباد کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اتنا ہلکا بریدرائی کہ خود کو بھی سنائی نہ دیا، ابا تو کافی دور تھے۔ پھر یکایک انہوں نے گردن موڑی تو دیکھا، وہ راہداری میں کھڑی، پیکٹ ہاتھوں میں پکڑے، انہیں دیکھے جا رہی ہے۔

”کوئی بات ہے زمر؟“

وہ ”جی“ میں سر ہلاتی قریب آئی۔ ان کے بالکل مقابل آنکھڑی ہوئی۔ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے، پھر بند کر لیے۔

”ابھی فارس کافون آیا تھا۔“ وہ اسے خاموش دیکھ کر خود ہی بتانے لگے۔ ”اس نے کہا کہ کاردار خاندان میں سے کسی کو شادی نہ بلایا جائے۔ گو کہ میں مسز کاردار کو مدعو کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے پھر بھی فارس کی بات مان لی۔ وہ سمجھ دار ہے۔ کچھ سوچ کر کہہ رہا ہو گا۔“

”آپ نے وجہ نہیں پوچھی؟“ زمر کے چہرے کی فکر مندی اور بے چینی اب قدرے ٹھنڈے تاثرات میں ڈھلنے لگی تھی۔

”کوئی بھی وجہ ہو، مجھے فارس پہ بھروسہ ہے۔ وہ غلط فیصلہ کر کے مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ تم کچھ کہہ رہی تھیں؟“ انہیں دوبارہ خیال آیا کہ وہ ادھر کیوں آنکھڑی ہوئی۔ زمر نے گہری سانس لی۔

”جی۔ میں یہ دکھانے آئی تھی۔ دیکھیں صداقت کیا لایا ہے میرے لیے۔“ ٹھنڈے، نرم انداز میں کہتی وہ پیکٹ کھول کر ان کو دکھانے لگی۔

صداقت اندر آیا تو وہ دونوں شال کھول کر دیکھتے اس پہ تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ شرابا کرچن کی طرف بڑھ گیا۔

کوئی تعویذ ہو روپلا کا

میرے پیچھے محبت پڑ گئی ہے

شہرین چیونگم چبائی، آنکھوں پہ ڈارک گلاسز لگائے، گردن اگڑا کر چلتی قصر کاردار میں داخل ہوئی تو سامنے لاؤنج کی اونچی کرسی۔ جواہرات کو بیٹھے دیکھا جو ملکہ کی شان سے براجمان، گھٹنوں پہ رکھا اخبار کھولے دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ سامنے شہرین کھڑی تھی۔

”گڈ مارننگ مسز کاردار۔ سونی کہاں ہے؟“ سن گلاسز اونچے کر کے بالوں پہ چڑھاتے اس نے ادھر ادھر دیکھتے پوچھا۔ یہ سعدی کو گیب ٹاپ کا پاس ورڈ دینے کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی اور اسی لیے جواہرات سے نگاہیں ملانے سے احتراز کر رہی تھی۔

”اے کمرے میں اور یقیناً“ تم اس بات سے واقف ہو گی کہ سونی کویساں سے لے کر نہیں جا سکتیں۔“ وہ پھر سے اخبار پڑھنے لگ گئی۔

شہرین نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھتے جیسے بہت ضبط کیا۔

”بالکل۔“ ملکہ سے کندھے اچکائے اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہیل کی ٹک ٹک ہر زینے کے ساتھ اوپر چلتی گئی۔ جواہرات مسکراتے ہوئے اخبار پڑھتی رہی۔

اور ریٹنگ کے ساتھ کھڑی شہرین نے نیچے دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ نوشیرواں کے کمرے کے بند دروازے پہ مٹھی سے دستک دی۔ نگاہیں نیچے بیٹھی جواہرات پہ مرکوز تھیں جس نے یقیناً ”دستک کے محل وقوع کا اندازہ کر لیا تھا مگر کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔

”شیرو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ تیسری دستک کے بعد اس نے پکارا۔ تب ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے نوشیرواں کھڑا تھا۔ رُواؤ زر اور

شرٹ میں بال ازے ازے سے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ نیند سے جاگا تھا اور شہری کو دیکھ کر پورا جاگ گیا تھا۔

وہ کچھ کہے بنا اندر چلی آئی، گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر آرام سے ایک کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، پیر جھلاتے ہوئے شیرو کو دیکھا۔ ”فریش ہو کر آجاؤ۔ ہمیں بات کرنی ہے۔“ انداز نرم مگر حکم سے بھرپور تھا۔ وہ جزبز سال سے دیکھتا ہوا تھ

”سونیا والے معاملے میں میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ کو مجھ سے امید نہیں رکھنی چاہیے۔“ چند منٹ بعد اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا، دھلے دھلائے چہرے والا شیرو تنے ابرو کے ساتھ قدرے خشکی سے کہہ رہا تھا، البتہ لہجے کی خشکی زبردستی تھی۔ بار بار وہ نرمی میں ڈھلنے لگتی اور وہ اسے پھر سے غصے اور ناواری میں لپیٹتا۔ گاہے بگاہے نگاہیں اٹھا کر شہرین کے خوب صورت سنہرے چہرے کو بھی دیکھ لیتا۔ وہ اسی اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”ناراض تو مجھے تم سے ہونا چاہیے، مگر تم مجھ سے کیوں خفا ہو؟“

”جو آپ نے سعدی کے ساتھ مل کر کیا اسے ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔“ اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہتے وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”تم اس قسم کے انسان تو نہیں تھے شیرو! کہ شہری کی کوئی بات ہی نہ سنو۔ میں ہاشم کو اصل وجہ نہ بتاؤں، مگر تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے پوچھنے پہ میں ضرور تاتی۔“

”اصل وجہ؟“ شیرو نے چونک کر اسے دیکھا۔ شہرین کی آنکھوں میں افسوس اترتا۔

”تو کیا تم نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری طرح میں بھی استعمال کی جا سکتی ہوں؟ میں بھی یہ کرنے پہ مجبور ہو سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری خود غرضی پہ افسوس ہو رہا ہے۔“ اور پھر ایک دم وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جب تم نے میری مجبوری سمجھی ہی نہیں تو میرے بتانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے تو مجھے سخت مایوس کیا ہے شیر۔“ اور وہ تاسف سے کہتی دروازے کی طرف بڑھی۔

نوشیرواں ہڑبڑا کر اٹھا۔ ”نہیں، پلیز۔ آپ جا میں مت۔ مجھے بتائیں تو سہی کہ اصل بات کیا ہے؟“ ساری اکڑ، ناراضی، غصہ اڑنچھو ہو گیا۔ اور وہ ایک دم پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف گھومی۔ سخت نظروں سے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”میں کیوں بتاؤں تمہیں؟ تم کون سا میرا یقین کرو گے؟ تم بھی سعدی کی طرح مجھے ذلیل ہی کرو گے۔“ خفگی سے کہتی وہ خود ہی بیٹھ گئی۔ اب کے نوشیرواں اس کے سامنے بیٹھا تو ذرا متفکر ہو کر بیٹھا تھا۔

”سعدی نے آپ کو۔۔۔؟“ انجھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”میں نے اس دن سعدی کو اپنا دوست کہا، جب تم اور ہاشم سولی کو ڈراپ کرنے آئے تھے۔ غلط کہا تھا میں نے۔ اس لیے تاکہ اسے اصل بات نہ بتانی پڑے۔“ کہتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی، ٹھوڑی تک آتے بالوں کی چونچ نمائٹ انگلی سے پیچھے ہٹائی۔ وہ اچنبھے مگر توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سعدی میرا دوست نہیں ہے۔ تم مجھے جانتے ہو، میں اور تم ایسے لڑکے کو کیسے اپنا دوست بنا سکتے ہیں؟“ اس نے کہتے ناگواری سے تاک سے مکھی اڑائی۔

”اس کے پاس میری ایک ویڈیو تھی۔ ایک پارٹی کی ویڈیو، اب تفصیل مت پوچھنا، بس وہ ویڈیو مجھے اسکیٹڈ لائز کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ویڈیو اس کلب کے سسٹم سے مٹا دو، مگر وہ اتنی آسانی سے مٹانے والا نہیں تھا۔ مجھ سے پانچ لاکھ لے لیے اس کام کے اور اس کے بدلے میں ایک فیور مانگوں گا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بدلے میں مجھے تمہیں استعمال کرنے کو کہے گا۔ اونہوں۔“ نفی میں سر ہلاتے اس نے آنکھیں بند کر کے ماتھے پہ اٹھلیاں رکھیں۔

نوشیرواں بالکل سانس روکے سن رہا تھا۔ دم بخود۔

”میں تو اس سے ملتی بھی نہیں تھی مجھے مال میں جا لیا اس نے۔ سولی کی پارٹی کی صبح اور بولا کہ یہ کام کروں میں نے انکار کیا تو اس نے کہا، کیا میں نے بھی ایسے ہی انکار کیا تھا آپ کو کام کرتے وقت؟ یہ ایک دھمکی تھی اگر میں انکار کروں گی تو میری ویڈیو لیک کر کے میرا اسکیٹڈ بنوائے گا۔ اس کے بعد سولی کو ہاشم میرے سائے سے بھی دور کر دے گا۔ میں تم لوگوں سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔“ شیرو کے چہرے کو دیکھتی وہ دل گرفتگی سے کہہ رہی تھی۔ لفظ ”تم لوگوں“ پہ نوشیرواں کی آنکھوں کی حیرت، برہمی میں بدلنے لگی۔ اس پر بھی میں سعدی کے لیے نفرت اور شیر کی لیے ہمدردی تھی۔

”وہ آپ کو بلیک میل کر رہا تھا؟ تو مجھے یا ہاشم بھائی کو کیوں نہیں بتایا؟“ حسب عادت وہ بھڑک کر آگے ہوا، گویا اٹھنے کو تیار ہو۔ شہرین نے گڑبڑا کر دروازے کو دیکھا جس کے پار، نیچے جواہرات اخبار پڑھ رہی تھی۔ اسے لمحے بھر کو ڈر لگا کہ یہ گھاسڑا گردن دنا تا ہوا یا ہر نکل گیا، تو ساری کہانی گنی فلاپ۔

”ہاشم میرا کچھ نہیں لگتا، شیر۔“ اس نے بظاہر بہت ضبط سے کہا مگر بڑی بڑی سبز لہیز لگی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”ہاشم میرا شوہر نہیں ہے۔ ایسے لڑکوں سے صرف آپ کے شوہر روٹھکتے کرتے ہیں آپ کو، اور میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔ میں۔۔۔“ سینے پہ انگلی رکھ کر بھڑائی آواز میں بولی۔ ”میں اکیلی ہوں، بالکل اکیلی۔“ سانس تاک کے ذریعے اندر کھینچا، انگلی سے آنکھ کا کنارہ صاف کیا۔ ”مجھے نثولا دو۔ میں پتا نہیں کیوں ایموشنل ہو رہی ہوں۔“ گیلی آواز سے ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے اس نے چہرہ پرے پھیر لیا گویا آنسو چھپانا چاہ رہی ہو۔

نوشیرواں فوراً اٹھا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل سے نثولا کا باکس اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔

”آپ۔۔۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

”تھینک یو۔“ اس نے آنکھیں تھپتھپا کر صاف

کیں اور چہرہ اس کی طرف پھیر کر مسکرائی۔ ”میں تم

سے ہمدردی لینے نہیں آئی تھی، نہ اس لیے آئی ہوں کہ تم ہاشم سے سونیا کے لیے بات کرو۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تم اس سے کوئی بات نہ کرو۔ میں تمہیں مزید تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بس تم میری طرف سے دل صاف کرلو۔“

وہ اٹھ گئی، پرس کی لمبی زنجیر کندھے سے ڈالی، ہلکا سا نوشیرواں کے کندھے کو تھپتھپایا اور یاہر نکل گئی۔ وہ بالکل گم صم سا بیٹھا رہ گیا۔

سوئی کے کمرے کی طرف جاتے وہ ریٹنگ پیڑ کی چہرہ جھکا کر نیچے جھانکا۔ جواہرات اب ادھر نہیں تھیں۔ وہ مسکرائی اور پورے کمرے پر اور اٹھی گردن کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔



قاتل سے عشق بھی، مقتول سے ہمدردی بھی تو بھلا کس سے محبت کی جزا مانگے گا ہاشم کاردار کے آفس میں اسے سی کی خنکی اور ٹھنڈ پھیلی تھی اور وہ کوٹ میں ملبوس، پاور سیٹ پہ، براجمان، موبائل کان سے لگائے، سامنے رکھی فائل کے صفحے پلٹتے کہہ رہا تھا۔

”بڑے ہو جاؤ شیرو۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے، بکو اس کر رہی ہے۔“ اکٹا کر اس نے شیرو کی کہانی درمیان سے کاٹی۔ ”وہ اس کی ٹانگ جتنا لڑکا اسے بلیک میل کرے گا؟ پانچ سال گزارے ہیں میں نے اس عورت کے ساتھ، یہی گئی ہوگی اپنے مسئلے اس کے پاس لے کر۔“

”مگر بھائی! وہ سعدی ہے ہی۔“ نوشیرواں جس کی شہرین کے لیے نرم آواز سعدی کے نام پر برہمی سے کانپنے لگتی نے، مزید کچھ کہنا چاہا مگر ہاشم مصروف تھا اور بے زار بھی۔

”سعدی کو میں سنبھال لوں گا، تم بس شہری سے دور رہو۔“

”مگر آپ سونیا کو۔“

”وہ تمہیں دوسری دفعہ بے وقوف بنارہی ہے شیرو!“

پہلی دفعہ اس پر لعنت، دوسری دفعہ تم پر۔“ لہجے میں بے زاری اور غصہ در آنے لگا۔ ”اور اب تم اگلے آدھے گھنٹے میں مجھے آفس میں نظر آؤ۔“ موبائل بند کر کے میز پر ڈالا، اور خفگی سے منہ میں کچھ بدبلا تے قلم دان سے قلم نکال کر کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔ کام ختم کر کے فائل بند کی اور انٹرکام اٹھایا۔

”علیمہ، خاور آفس میں ہے؟“

”جی، وہ شاید نچلے فلور پر ہیں۔“

”اسے میرے پاس بھیجو۔“ ریسپورر کھتے رکھتے وہ

رکا۔ ”وہ اس لڑکے، سعدی یوسف کا کوئی فون آیا؟“

”سر! میں نے دو دن پہلے دوبارہ ان کو کال کی تھی،

انہوں نے کہا کہ اگلے ہفتے آئیں گے وہ۔ دن نہیں

بتایا۔ میں ان کو کال کروں؟“

”اونہوں۔ وہ خود کرے گا۔ بہر حال، جب کہے،

وقت اور دن مت دیکھنا، اسے آنے کا کہہ دینا۔“

ریسپورر رکھ کر اس نے ٹیک لگالی اور کچھ سوچتے ہوئے

اوپر چھت کو دیکھنے لگا۔

خاور اندر داخل ہوا تو وہ سیدھا ہوا۔ سنجیدہ،

ٹھنڈے تاثرات سے اسے دیکھا۔ وہ سیاہ کوٹ اور

پینٹ میں ملبوس اونچا لمبا سا تھا۔ ٹالی نہیں باندھتا تھا۔

بال اور مونچھیں دونوں سیاہ تھیں۔ رنگت سانولی اور

نقش متناسب تھے۔ ہاتھ باندھے، سنجیدگی سے چلتا وہ

سامنے آیا۔

”وہ ملا جو میں نے تلاش کرنے کے لیے کہا تھا؟“

خاور کی آنکھوں میں مایوسی در آئی، نفی میں گردن

ہلائی۔

”نو سر! ابھی تک تو اس لڑکے کے بارے میں کوئی

dirt نہیں ملا۔“

ہاشم قدرے برہمی سے آگے کو ہوا۔ ”تو تم اتنے

دنوں سے کیا کر رہے ہو؟ وہ کچھ دن بعد میرے سامنے

ادھر کھڑا ہو گا“ اور اگر میرے پاس کوئی لیورج ہی نہیں

ہو گا اس کے خلاف تو میں اسے کیسے سنبھالوں گا؟“

”سر! میں نے پوری کوشش کی، مگر وہ ہر طرح سے

صاف ہے۔ اپنے خاندان کا وہ فیورٹ ہے، تو دوستوں کا

آئیڈیل۔ کسی کو کوئی کام ہو تو سعدی ہے نا۔“ وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ ”مکے کا چوکیدار رکھنا ہو یا گلی میں اسپید بریکر بنوانا ہو، ہمسایوں کے لڑکے فوراً“ اسی کے پاس جاتے ہیں، بہترین اسٹوڈنٹ اور جاب۔ ایک ایمان دار اور محنتی ایملپلائی۔ اس کا کوئی ڈرنی سیکرٹ نہیں ملا مجھے۔ وہ لڑکا گویا فرشتہ ہے۔“

ہاشم ہلکا سا مسکرایا۔ سرد تلخ سی مسکراہٹ۔ نفی میں سر ہلایا اور میز پر رکھا پین انگلیوں میں گھماتے بولا۔ ”میں تمہیں بتاؤں خاور! کوئی بھی فرشتہ نہیں ہوتا۔ سب کے راز ہوتے ہیں۔ تم نے درست جگہ نہیں دیکھا ہو گا۔“

خاور ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ آنکھیں سکیڑے کچھ سوچا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک جگہ میں نے واقعی نہیں دیکھا۔“ پھر سوچتے سوچتے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بالکل“ وہ فرشتہ نہیں ہے۔ مجھے ایک دن دس اس کی انسانیت دکھاتا ہوں آپ کو۔“ ہاشم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، اور خاور غجالت میں باہر نکل گیا۔ ہاشم نے گہری سانس لے کر خود کو بہتر محسوس کیا، پھر موبائل اٹھایا اور زمر کا نمبر ملا کر کان سے لگایا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے، وہ اب لیوں میں کوئی دھن گنگناتے چھت کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔



میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں مال میں دوسری نسبت رش تھا۔ مطمئن خوش باش، مصروف لوگ اوپر نیچے آگے پیچھے آ جا رہے تھے ایسے میں دکانوں کی قطار کے سامنے راہداری میں حنین اور سیم بھی چل رہے تھے۔ ایک دکان کے سامنے وہ رکے، حنہ سیم کی جانب گھومی، شرارتی چمک دار آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”اے موٹے آلو! ونڈو شاپنگ کے دو اصول یاد ہیں؟“

کھنگھریا لے بالوں والے دبلے تلمے اور لمبے لڑکے نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔ ”بالکل“ تم ہر چیز مجھے دکھا دکھا کر کہو گی، سیم، یہ لے لو اور میں بگڑے بچوں کی طرح، نہیں نہیں، کرنا آگے بڑھ جاؤں گا۔“

”گڈ!“ وہ مسکرائی، پھر اس کی کہنی میں بازو ڈالے شاپ میں داخل ہوئی۔ قدم بہ قدم دونوں ریکس کی جانب آئے۔ حنین نے مختلف کیمس و سیم کو دکھائی شروع کیں۔ ”وسیم، بچے، دیکھو، یہ آپ پہ کتنی پیاری لگے گی۔“

وہ بگڑے انداز میں نفی میں سر ہلاتے بولا۔ ”نہیں ماما! مجھے یہ نہیں چاہیے۔“

”ماما؟“ اس نے تکتلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب سیلز مین انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

”سیم جان!“ وہ جبراً مسکرا کر پیار سے بولی۔ ”لی ہو یور سیلف“ ورنہ ابھی آپ کے پاپا کو شکایت لگاتی ہوں۔“

”مگر ماما! پاپا تو کئی سال سے اوپر ہیں، اکاؤنٹنگ میں۔ (حساب کتاب میں)۔“

وہ معصومیت سے پلکیں جھپکا جھپکا کر بولا اور اس سے پہلے کہ وہ سارے مشغل بہ لغت بھیج کر اس کا کان مروڑتی، ہینڈ بیگ میں رکھا موبائل بج اٹھا۔

وہ جلدی سے موبائل نکالتی شاپ سے باہر آئی۔ سیم بھی پیچھے لپکا۔

”کیا امی اور پھپھو نے شاپنگ کر لی؟ کیا وہ بلاری ہیں؟“ حنہ موبائل نکال کر دیکھ رہی تھی اور سیم سوال کر رہا تھا۔ یہ زمر کا موبائل تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے حنہ کو اس لیے دیا تھا کیونکہ وہ اور ندرت بالائی فلور پہ نکاح کا جوڑا خرید رہی تھیں اور سیم اور حنین ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے تھے، ایسے میں ان کو ”آزاد“ کرنے سے قبل زمر نے اپنا فون حنہ کو دے دیا کہ جب فارغ ہو تو ندرت کے فون پہ بتا دے۔ اب بھی سیم ہی پوچھ رہا تھا مگر حنین بالکل چپ سی ہو کر بجتے فون کی اسکرین دیکھ رہی تھی۔

”ہاشم کاردار کالنگ۔“ فون پکڑے ہاتھوں پہ پسینہ

آنے لگا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”اٹھانا مت، حنا! پھپھو کا فون ہے۔“ سیم نے تنبیہ کی، مگر جسے دنیا کا بدترین مرض لاحق ہو جائے وہ اور کیا کرے؟ اس نے اٹکھٹے سے سبز دائرے کو سلائڈ کر کے موبائل کان سے لگایا۔

”ہیلو؟“

”ہیلو۔ زمر؟“ وہ ذرا اٹکھٹا تھا۔

”نہیں میں حنین۔“ دھڑکتے دل اور بے قابو ہوتی خوشی سے وہ جلدی جلدی بتانے لگی۔ ”اصل میں ہم مال میں ہیں، پھپھو اور امی دور ہیں، سوان کا فون میرے پاس ہے۔“

”اوکے۔ کیسی ہو تم حنین؟“ وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔

”میں بالکل ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟“ وہ بھی اعتماد سے مسکرا کر بولی۔ ایسے میں وہ سیم کی طرف متوجہ نہیں تھی جو خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں ہمیشہ کی طرح بہت اچھا ہوں۔“ اس کے انداز پر وہ ہلکا سا ہنس دی۔

”تمہارا رزلٹ کب ہے؟“ اگلے سوال پر حنا کی مسکراہٹ پھٹکی پڑی، فوراً ”سیم کو دیکھا جو بے زار سا کھڑا تھا۔“

”اگست میں۔ اور۔۔۔“ وہ رک گئی، تھوک نگلا۔ سارے لمحات پھر سے آنکھوں میں تازہ ہوئے۔ امتحانی مرکز میں ہاشم کو بلانا، پھر وہ سیاہ اور سنہری پارٹی۔

”ڈونٹ وری، تمہارا رزلٹ بہت اچھا آئے گا، اتنا کچا کام تو نہیں کیا ہو گا نا ہاشم نے۔“ اس کے نرم تسلی دینے والے انداز پر وہ پھیکا سا مسکرائی، مگر پرجوش اعصاب اب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور اہفل ثاور کی روخنیاں بھی ماند پڑنے لگیں۔

”میں پھپھو کو جا کرتا ہوں، وہ آپ کو کال بیک کریں گی۔“

”وہ کال بیک نہیں کریں گی۔ میں دس منٹ میں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“ اور فون بند ہو گیا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”مجھے خود نہیں پتا کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہے

تھے۔“ خود سے ابھتی وہ آگے بڑھ گئی۔

جب وہ اس آؤٹ لٹ پہ آئے جہاں زمر اور امی تھیں تو دس منٹ بیت چکے تھے۔ وہ دونوں کاؤنٹر پر کھڑی تھیں۔ ندرت سادگی سے سر پر دوپٹہ لیے کھڑی،

شاپنگ بیگ میں موجود جوڑے کو چیک کر رہی تھیں۔ کلدار جوڑے کا رنگ آف وائٹ تھا، ذرا سی جھلک سے حنین کو اندازہ ہوا۔ پھر وہ زممر کی طرف آئی،

جو بال آدھے کھچو میں باندھے، سر جھکائے، سوٹ کی رسید پرس میں رکھ رہی تھی۔ اس کے ”پھپھو“ کہنے پر سر اٹھایا۔ وہ حنین سے دراز قد بھی، دواچ دراز۔ اور

زیادہ جاذب نظر بھی۔ بھوری آنکھوں سے حنا کو دیکھا اور نرمی سے مسکرائی۔

وہ جب ایسے مسکراتی تھی تو حنین گزرے برسوں کی ساری تلخی اور ناراضی بھولنے لگتی۔

”ہاشم بھالی کا فون آ رہا ہے۔“ دوبارہ بچتے سیل کو اس کی طرف بڑھایا۔ زمر نے موبائل سامنے کر کے دیکھا، پھر گہری سانس لے کر کان سے لگایا۔

”جی ہاشم، کہیے۔“ مصروف سے انداز میں وہ پرس بند کرتی گویا ہوئی۔

”حنین بتا رہی تھی، آپ شاپنگ کر رہی ہیں۔ مجھے گیس کرنے دس، کیا یہ آپ کی شادی کی شاپنگ ہے؟“ وہ گویا مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ زمر نے فوراً ”حنین کو دیکھا، وہ ہاشم کی بات نہیں سن سکتی تھی، مگر جلدی سے بولی۔“

”میں نے کال اٹینڈ کر کے بتایا تھا کہ ہم مال میں ہیں۔“ ایک دم اپنا آپ مجرم لگنے لگا۔ نظریں فوراً ”جھکا دیں۔“

”ہاشم! آپ نے کیسے فون کیا؟“ بے تاثر ٹھنڈے انداز میں پوچھتی وہ حنین کے ہمراہ چلتی باہر نکلی۔ ندرت اور سیم اگلی شاپ میں سیم کے کپڑوں کے لیے چلے گئے تھے۔ ندرت نے حنا کو بھی آواز دی، مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔

”آپ کو شادی کی مبارکباد دینے۔“

”ایک منٹ!“ اس نے فون کان سے ہٹائے بغیر بلند آواز میں حنین کو پکارا۔ ”حنہ! اگر یہ صاحب اگلے پانچ منٹ تک فون بند نہ کریں تو تم اونچی آواز میں مجھے پکار کر کہنا کہ بھابھی مجھے بلا رہی ہیں اوکے؟ جی ہاشم! آپ کیا کہہ رہے تھے؟“

رسالہ سے کہتی وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ (حنہ کا تومنے ہی کھل گیا۔)

وہ جواب میں زور سے ہنسا تھا۔

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ کو اس روز وہ گولیاں میں نے ماری ہوئیں تو کیا آپ مجھ سے بھی شادی کر لیتیں؟“ وہ محظوظ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔ میں آپ کو قتل کرنا پسند کرتی، مگر ہزار حصوں میں۔“

”پھر فارس کو ہزار حصوں میں کیوں نہیں مارا؟“ وہ مزہ لیتے ہوئے مخاطب تھا۔ ”چار سال چپ کیوں رہیں؟“

”اچھا انسان برا کرے تو خاموشی بہتر ہے، لیکن آپ جیسا برا انسان اگر برا کرے تو خاموش نہیں رہنا چاہیے مجھے۔“

وہ جواب میں پھر سے ہنس دیا۔ زمر اور حنین ہنوز ساتھ ساتھ گیلری میں چل رہی تھیں۔ حنہ کے کان ادھر ہی لگے تھے۔

”اور اس برے انسان کو شادی پہ نہیں بلایا آپ نے؟“

”یہ سوال آپ اپنے کزن سے کریں۔ یہ فیصلے ان کے ہیں۔“

”زمر۔“ اب کے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ غلطی کر رہی ہیں۔ اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے آپ کو۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ہاشم!“

”آپ نے اس کو ذاتی نہیں رہنے دیا جب اسے میری مٹی سے ڈسکس کیا۔“

زمر نے تکان سے گہری سانس بھری۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ فارس آپ کے قابل نہیں ہے۔ اس کا جرم بھول بھی جائیں تو اس کی اکڑ طبیعت، غصہ، لارو والی، وہ آپ کی ٹائپ کا آدمی نہیں ہے۔“ قدرے توقف کے بعد اس نے گویا زمر کو پکارا۔ ”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”اوہ! آپ بالکل بھی نہیں جاننا چاہیں گے جو میں سوچ رہی ہوں۔“

اس کے انداز پہ حنہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ایک شاپ کے باہر کھڑی ہو گئی تھیں اور زمر ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ پکڑے، دوسرے سے موبائل کو کان سے لگائے بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔

”مثلاً کیا؟“

”میں یہ سوچ رہی ہوں ہاشم! کہ مسئلہ میں نہیں ہوں، مسئلہ فارس ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کو فارس کی ہر بیوی چھپتی ہے۔ وہ جب بھی شادی کرے گا، آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ بطور ایک فرسٹ کزن، آپ کا اس سے ان کما، لاشعوری سا مقابلہ ہے۔ موازنہ ہے۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ زمر تاشہ کی شادی کے روز بھی جب آپ اسٹیج پہ آئے تھے اور میں وہاں تھی اور فارس وہاں نہیں تھا، تب آپ نے زمر تاشہ سے بھی اس کے غصے اور اکڑ پن کا تذکرہ کیا تھا جس کی وجہ سے دہن کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی ہوں ہاشم! کہ آپ یہ جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ لاشعوری طور پہ تب کرتے ہیں جب آپ کو اپنی شادی کی ناکامی یاد آتی ہے۔“

اور دوسری جانب ہاشم خاموش ہو گیا تھا۔

”ویل۔۔۔ آپ نے کافی سخت باتیں کہہ دیں۔“

جب وہ بولا تو آواز نہ ہم مگر بجھی ہوئی تھی۔

”میں معذرت نہیں کروں گی، اگر آپ میری ذاتیات میں دخل دیں گے تو پھر اپنی ذاتیات کے بارے میں بھی آپ کو سننا پڑے گا۔“ زمری سے کہہ کر اس نے ابرو اٹھا کر حنین کو دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر اونچا سا بولی۔

”پھپھو! امی بلا رہی ہیں۔“ کہہ کر خوب شرمندہ

بہت نہیں بولا کرتے تھے۔

ہوئی۔

”آپ نے سن لیا؟ مجھے جانا ہے۔“ اور موبائل بند کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

”بھابھی کدھر رہ گئیں؟“ عام سا انداز جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

حنین بالکل چپ رہ گئی۔ اور وہ تب تک نہیں بولی۔ جب تک وہ چاروں شاہنگ سمیت اوپر فوڈ کورٹ میں ایک ٹیبل پہ بیٹھ نہیں گئے۔ زمر ندرت سے ان کے ریسٹورنٹ کے حوالے سے باتیں کرنے لگی۔ وہ ریسٹورنٹ ان دنوں بنا تھا جب زمر ان سے قطع تعلق کیے ہوئے تھی، مگر خون کے رشتے ”صلح“ کے بعد پرانی باتوں کا ذکر نہیں چھیڑا کرتے۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہی چیز خون کو پانی سے گاڑھا بناتی ہے۔

ندرت اور سیم اٹھ گئے تاکہ سیم کے جوتے لیں تو حنین جوس میں اسٹرا گھماتی، نگاہیں جھکائے سرسری سا بولی۔ ”ہاشم بھائی نے برا تو مانا ہو گا اتنی سخت باتوں کا۔“

”ہاشم کے برامنے سے کسے فرق پڑتا ہے؟“ زمر نے مسکرا کر شانے اچکائے۔ پھر گردن ترچھی کر کے اسے غور سے دیکھا۔ ”کسی بات پر پریشان ہو حنہ؟“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”نہیں۔۔۔ مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ چہرہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ ڈیڑھ سال قبل کی چھٹنگ سے اب کی چھٹنگ تک زمر کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

”آریو شیور؟ اگر کوئی مسئلہ ہو تو ضرور شیئر کرنا۔“ اس نے نرمی سے حنہ کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

”آپ کو ایسا کیوں لگا؟“

”کیونکہ اب تم بہت خاموش رہتی ہو۔ پہلے تم بہت بولا کرتی تھیں۔“

حنین کے ابو بچھنج گئے۔ ایک سخت نظر اپنے ہاتھ پر دھرے زمر کے ہاتھ پہ ڈالی اور دوسری زمر کی آنکھوں پہ۔

”میں اور آپ پھپھو! کبھی بھی ایک دوسرے سے

اپنا ہاتھ نکالا اور کرسی دھکیلتی اٹھ کر باہر کی طرف چلی گئی۔ زمر گہری سانس لے کر اسے دیکھتی رہی۔ اور خون کی سب سے بڑی خولی اور خامی یہی ہے کہ اگر اسے باہر کی ہوا لگ جائے تو وہ جم جاتا ہے۔ عرب کے اہل زبان اس جھنجھ کو عقد کہتے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ جسے خون کو کوئی پکھلائے کیسے؟“



دنیا کی وسعتوں میں اسے ڈھونڈتا رہا لیکن خدا میری ذات کے اندر ملا مجھے! چھوٹے باغیچے والے گھر کے باہر ابھی رات کا تیسرا پہر تھا۔ گھرے جا منی آسمان پہ ستارے چمک رہے تھے۔ راہداری کے پہلے دروازے سے اندر جھانکنا تو بستر پر چادر تانے سعدی سو رہا تھا۔ پھر نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز آئی، اور وہ آہستہ سے بازو ہٹا کر اٹھا۔ نیند سے بھری آنکھوں کو منٹھی سے مسلا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر روشن کیا۔ فجر میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا۔

وہ لبوں میں کوئی دعا پڑھتا بستر سے اتر آیا اور ہاتھ روم کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ جب باہر نکلا تو کرتے شلوار میں ملبوس تھا، ہاتھ منہ اور پیر کیلے تھے۔ جب وہ راہداری میں دبے قدموں چلتا بیرونی دروازے تک آیا تو ندرت نے اسے کمرے کا دروازہ کھولا۔ خوابیدہ آنکھیں حیرت سے سیکڑ کر اسے دیکھا۔

”سعدی؟ ابھی تو اذان بھی نہیں ہوئی۔ تم جلدی کیوں اٹھ گئے؟ کیا الارم جلدی بچ گیا؟“

”میں تو الارم نہیں لگا تا می! آپ کو نہیں پتا؟“ اسے جیسے معصوم سا تعجب ہوا۔ ”تو پھر کیسے اٹھے ہو؟“

”میں بس اللہ تعالیٰ سے رات میں کہہ دیتا ہوں کہ مجھے صبح اس وقت جگا دیجیے گا، تو اللہ مجھے جگا دیتے ہیں۔“ اور سادگی سے مسکرایا۔ ”لامام صاحب کی

خواتین ڈائجسٹ 220 مئی 2015

طبیعت رات پھر خراب تھی میں نے کہا کہ صبح میں امامت کراؤں۔ اس لیے جلدی جا رہا ہوں۔“

”اچھا نیر سے جاؤ۔“ انہوں نے شاید کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر حسین اور سیم کے کمرے تک گئیں۔ بلند آواز میں ڈانٹنا شروع کیا۔ ”کوئی شرم حیا ہے تم دونوں میں؟ اٹھو، قرآن پڑھو، نماز پڑھو۔“ سعدی باہر نکل آیا تو آوازیں دم توڑ گئیں۔

کالونی کی سڑک ویران، اندھیری پڑی تھی۔ سعدی نے تازہ ہوا کو محسوس کرتے سر اٹھا کر دیکھا۔ زمین والوں کو آسمان پر تارے جھلکاتے دکھائی دے رہے تھے اور آسمان والوں کو زمین پر قرآن پڑھنے والوں کے گھر چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اندھیرے کی وہ گھڑی تھی جس میں سب سے زیادہ نور پھیلا تھا۔

اس نے ہینڈ فری کانوں میں لگایا، قرآن پین نکالا (ایک سفید پین کی صورت کا آلہ جس کی نوک قرآن کے جس حرف پر رکھو وہیں سے تلاوت کی ریکارڈنگ چلنے لگتی ہے) اور سورتوں کا کارڈ نکال کر تمام سورتوں کے ناموں پر سوچتی نظر ڈالی۔ اپنے روز کے فجر کے قرآن میں سورۃ غافر پڑھا۔ اب اصولاً اس سے اگلی سورۃ بڑھنی تھی مگر وہ سوچتا رہا۔ پھر عادتاً اپنی پسندیدہ سورۃ نمل پر قلم کی نوک رکھ دی۔

سر اٹھا کر، ابدا کٹھنے کیے، بے بسی سے آسمان کو دیکھا۔

”او کے اللہ تعالیٰ آئی ایم سوری، مجھے قرآن ترتیب سے پڑھنا چاہیے مگر میں کیا کروں، مجھے یہ سورۃ بہت پسند ہے۔“ پھر مسکرا کر کانوں میں ہینڈ فری پکا کرتے قدم قدم سڑک کنارے چلنے لگا۔

”اللہ تعالیٰ مجھے آج بھی یاد ہے، جب میں ابو کے ساتھ مسجد آتا تھا تو وہ مجھے چیونٹیوں کی قطار دکھایا کرتے تھے۔ تب میں سوچتا تھا، انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے کیوں ملایا جائے؟ مگر بہت سالوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ نمل کیڑوں مکوڑوں کی سورۃ نہیں ہے یہ ”فیل“ ہے۔ خاندان کو کسے جوڑ کر رکھنا ہے، مجھے آپ نے یہ اس سورۃ سے سکھایا ہے۔“

جاسمی اندھیرے میں وہ سر جھکائے، مسکرا کر سرگوشی میں بولتا جا رہا تھا۔

اوپر کالونی میں کسی گھر کی چھت پر کوئی نو عمر لڑکی فون کان سے لگائے، آنسو بار بار پونچھتی، کسی ٹائٹ ہیکس کے طفیل اپنے بوائے فرینڈ سے سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔ سامنے والے ایک اور گھر میں ایک لڑکا بستر میں لیٹا، موبائل دونوں ہاتھوں میں پکڑے، ٹک ٹک میسج کر رہا تھا اور چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو مرض عشق میں مبتلا لوگوں کے چہروں پر اس وقت ہوا کرتی ہے۔ یہ رات کا وہ پہر تھا جب صرف محبوب کے لیے جاگا جاتا ہے۔

”اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان، بار بار رحم کرنے والا ہے۔“

سڑک کنارے چلتے گھٹنگھریا لے بالوں والے لڑکے کے کانوں میں لگے ہینڈ فری میں آواز گونجنے لگی۔ ”طس۔ یہ آیات ہیں قرآن کی اور اس کتاب کی جو روشن ہے۔“

ہاتھ میں پکڑے پین پر اس نے وقفہ کاٹن دیا۔ ”اوہ اللہ۔“ بے بسی بھری مسکراہٹ سے آسمان کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلاتے گردن جھکائے چلا گیا۔ ”مطلب کہ میں کبھی کبھی حیران ہو جاتا ہوں، یہ کتاب مبین“ والی بات آپ نے کتنی دفعہ بتا دی قرآن میں، پھر ہر چند سورتوں کے بعد یہی آیت کیوں لے آتے ہیں آپ اللہ؟ مجھے سوچنے دیں۔“

لب کاتنے آنکھیں ذرا میچ کر وہ واقعی سوچنے لگا۔ ”مہوں۔“ چند لمحے اور سوچتے ہوئے بڑھایا۔ ”ہر دفعہ اس آیت کا مجھے نیا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ دیکھیں اللہ، اتنا مجھے پتا ہے کہ اگر ان الفاظ کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا تو یہ قرآن میں بار بار نہ دہرائے جاتے۔ کتاب مبین۔ کتاب روشن یعنی۔“ وہ سڑک کنارے قدم اٹھاتا، سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

”یعنی آپ مجھے یہ سمجھا رہے ہیں کہ آگے جو آیات آپ مجھے دیں گے، وہ اس کتاب کی ہیں، جس کے علاوہ مجھے دنیا میں کسی چیز سے کوئی روشنی نہیں

ملے گی۔ کہیں سکون نہیں ملے گا۔ کہیں خوشی نہیں ملے گی۔ مجھے اس کتاب کے علاوہ کوئی نہیں بتائے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کوئی نہیں جو انگلی پکڑ کر صحیح فیصلے کرنا سکھائے۔ میرے دل کی بات سمجھ کر اللہ کی بات اور کوئی نہیں سمجھائے گا۔“

مسکرا کر خوش دلی سے بولتے اس کے تاثرات بدلتے گئے۔ آنکھوں میں اداسی در آئی۔ دل بھر سا آیا۔ اپنی زندگی کی پیچیدگیاں، دکھ، خطرات، سب یاد آنے لگے۔ کیا کھویا اور کیا پایا۔ جامنی صبح میں اداسیاں گھلتی گئیں۔

”یہ ہدایت ہے اور خوشخبری ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں۔“

کانوں میں گھلتی وہ مدھر آواز کہہ رہی تھی۔ وہ سامنے دوران اندھیر سڑک کو اداسی سے دیکھے گیا۔

”اللہ! آپ کو کیسے علم ہوتا ہے کہ اس آیات کے بعد میں افسردہ ہو جاؤں گا؟ کیسے آپ فوراً اگلی آیت میں مرہم لے آتے ہیں؟ کیا آپ کو ہر انسان کا اتنا خیال ہوتا ہے یا میں اس کے متحمل ہوں؟“

افسردگی کو زبردستی دباتے وہ شرارت سے خود ہی ہنس دیا۔

”خوش خبری۔“ اور گہری سانس لی۔ ”تو یہ کتاب بڑھنا اس لیے ضروری ہے، کیونکہ یہ ہمیں فیصلہ کرنا سکھاتی ہے، ایسا ہی ہے نا اللہ؟ آپ نے ان آیات کے ذریعے مجھے سکھایا کہ برے دنوں میں انسان کیسے وہ ”آنکھ“ رکھے جو اسے وہ دکھائے جو ابھی پاس نہیں ہے، مگر کبھی تو ملے گا۔ کبھی تو ہم بھی وہ دن دیکھیں گے نا اللہ جس کا وعدہ ہے۔ مگر اللہ۔ کیا یہ خوش خبری میرے لیے بھی ہے؟ آپ نے کہا، یہ ایمان والوں کے لیے ہے۔ مگر مجھے خود بھی نہیں بتا کہ میں مومن ہوں یا نہیں؟ اگر خود کو مومن سمجھوں تو خود پسندی ہے ”عجب“ ہے خود کو منافق سمجھوں تو یہ مایوسی ہے۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میں مومن ہوں؟“

اداسی بڑھنے لگی۔ ارد گرد بھیگتی جامنی رات میں تنہائی بھرا ملال سا چھا رہا تھا۔ دل کی ساری دیرانیاں اس

اندھیرے میں رچ بسنے لگیں۔

”ہدایت اور خوش خبری ہے مومنوں کے لیے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔“ وہ ایک دم بالکل رک کر سننے لگا۔ ”جو اپنی نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔“

اور دل پر سے کوئی سل سی ہٹنے لگی۔

”اوہ اللہ۔ یعنی کہ اگر مجھے قرآن کی خوش خبریوں کی امید رکھنی ہے تو میں کبھی نماز نہیں چھوڑ سکتا۔ جس وقت کی چھوڑوں گا، اس وقت آپ مجھے چھوڑ دیں گے۔ آپ چاہتے ہیں ہم سب نماز پڑھیں، مگر نہیں، نماز صرف ”پڑھنے“ سے افادہ نہیں ہوتا۔ نماز قائم رکھنا اصل چیز ہے۔ ہر نماز اپنے وقت پر اور تمام ارکان کے ساتھ بڑھنا۔ میں نماز نہیں چھوڑتا، مگر جس دن یہ سوچوں کہ نہیں چھوڑتا، اس دن ہی کوئی نہ کوئی قضا ہو جاتی ہے۔ میرے بسن بھالی نماز نہیں پڑھتے۔ مجھے صرف یہی بات تکلیف دیتی ہے کہ اگر قیامت کے دن آپ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم اکیلے مسجد کیوں آتے ہو؟ تمہارے بسن بھالی کیوں نہیں؟ وہ اس وقت سو رہے ہوتے ہیں تو میں کیا جواب دوں گا؟“

وزن بڑھتا جا رہا تھا۔ دکھ، بے بسی، فکر مندی نے اس دم توڑتی رات کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

کانوں میں تلاوت وہیں سے جاری تھی۔

”اور وہ جو اپنی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور وہ جو آخرت پہ یقین رکھتے ہیں۔“

”تھینک یو اللہ!“ اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور خود سے بولا۔ ”میں یہ تینوں کام کرتا ہوں، مگر مجھے پھر بھی اپنے اچھے ہونے کا کوئی یقین نہیں۔ شاید یہی بہتر ہوتا ہے جب تک ہمارے گناہوں کا گلت ہمارے ساتھ ہے، ہم کم از کم توبہ تو کرتے رہتے ہیں، اپنی عبادتوں پہ غور تو نہیں آتا۔ پھر بھی، مجھ سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ آس پاس کے لوگ میری نمازیں دیکھ کر، میرے منہ سے قرآن کی باتیں سن کر مجھے اتنا نیک کیوں سمجھتے ہیں؟“ وہ اداسی سے بتا رہا تھا۔

”اللہ جب لوگ مجھے نیک کہتے ہیں تو مجھے بہت گلت ہوتا ہے۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ ہر نیک

بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ صرف اپنا اعمال نامہ نظر آتا تھا۔

”تو اللہ۔ ایسے آپ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں؟“
بن سے بن آف کرتے ہوئے وہ گویا جھرجھری لے کر کہہ رہا تھا۔

”جب میں نماز نہ پڑھوں، یا قرآن نہ پڑھوں، یا لوگوں پہ اپنے حصے سے خرچ نہ کروں، تو میرا آخرت پہ ایمان کمزور ہو جائے گا؟ اور۔ اور میں ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا جو بہت عمل کرنے والے ہوں گے مگر صرف تھکنے والے ہو گے؟“

تعجب سے اس نے پوچھا جواب اسے خود بھی معلوم تھا۔

”جو چیز مجھے نماز اور قرآن سے دور کرے گی، اللہ کے راستے کے علاوہ جس بے مقصد چیز میں اپنا مال یا اپنا ٹیلنٹ لگاؤں گا، آپ مجھے وہ بے مقصد چیزیں دلچسپ اور خوب صورت بنا کر دکھاتے جائیں گے اور پھر میں ان ہی میں بھٹکتا رہوں گا؟ کیا صرف ایک نماز کا چھوڑ دینا اتنا منگنا بڑے گا؟ نماز جاتی جائے گی، بے مقصد چیزیں آتی جائیں گی؟ ایسے چلا جاتا ہے ایمان؟ صرف ایک نماز کے جانے سے؟ ایک جھوٹ بولنے سے؟ ایک دل دکھانے سے؟“ ایک کنارے پہ وہ ٹھہر گیا۔ تعجب سا تعجب تھا۔ حیرت سی حیرت تھی۔ سر اٹھا کر اس نے گہرے پراسرار آسمان کو دیکھا۔ دل بھر سا آیا۔ ہینڈ فری اتار دیے۔

”اللہ تعالیٰ آلی ایم سوری، ہر اس چیز کے لیے جسے میں نے نماز سے اوپر رکھا۔ میں بار بار معافی مانگوں گا۔ آپ بس معاف کرنا مت چھوڑیے گا۔“

اسی طرح خود سے بڑبڑاتا وہ قدم بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ مسجد کے دروازے تک آن پہنچا۔ گل خان خلاف معمول دروازے پہ ہی مل گیا۔ سعدی اپنے فجر کے قرآن میں الجھا تھا، اسے نہیں دیکھا۔ لبوں میں مدھم سا ابھی تک کچھ بول رہا تھا۔ جوتے اتارے تو ساتھ کھڑے گل خان نے حیرت سے اس کا بازو ہلایا۔

سے نیک آدمی بھی دن میں دس ہزار دفعہ خود کو گناہ کرنے سے روکتا ہے، اور کئی دفعہ نہیں بھی روک پاتا۔ کتنا مزا آتا، ایمان ایک ہی دفعہ خرید لو، اور پھر ساری عمر کی گارنٹی۔ یہ روز روز اپنے آپ سے جنگ، گلٹ، توبہ کا سائیکل تو نہ ہوتا۔ آپ نے زندگی اتنی پیچیدہ کیوں بنائی؟“

نگاہیں اٹھا کر شکوہ کیا۔ دور صبح کی چڑیاں بولنے لگیں۔ ان کی اپنی تسبیح تھی۔ ہر ایک کی تسبیح مختلف ہوتی ہے۔

”ہاں مگر اللہ مجھے اتنا یقین ہے کہ ایک دن زندگی اپنی ساری نا تمام خواہشات اور تکالیف کے ساتھ ختم ہو جائے گی، سب دکھ مرجائیں گے اور وہ بڑا دن آئے گا۔ جب ہم اور آپ مقابل کھڑے ہوں گے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ نماز کے بغیر، اور اپنا مال اور ٹیلنٹ لوگوں پہ خرچ کیے بغیر میں یہ کہوں کہ مجھے آخرت پہ یقین ہے تو جھوٹ ہو گا۔ علم الیقین تو سب کو ہوتا ہے۔ مگر مجھے یہ کام کرتے رہنا ہوں گے۔ آپ کو یقین دلانے کے لیے۔ خود کو یقین دلانے کے لیے۔“

وہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا بولتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی ساتھ سے گزرتے اسے دیکھتا تو سمجھتا وہ ہینڈ فری لگائے، فون پہ بات کر رہا ہے۔ مگر ہریات لوگوں کے سمجھنے کی ہوتی تھی نہیں ہے۔

تلاوت کی بارعب، مگر خوب صورت آواز سماعتوں میں ہنوز بکھر رہی تھی۔

”البتہ وہ لوگ جو آخرت پہ ایمان نہیں لاتے، ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے خوب صورت بنا کر پیش کر دیے ہیں اور وہ ان ہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بے شک ان کے لیے برا عذاب ہے، اور وہ آخرت میں شدید نقصان میں رہیں گے۔“

دم توڑتی رات کا وقت تھا، ماحول کی ہیبت تھی، یا تلاوت کی آواز کا سحر، اسے لگا اس کی جلد کے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کوئی عجیب سا رعب تھا جو ہر جگہ چھانے لگا۔ یہ وہ لمحے تھے جب وہ سب کچھ بھول گیا۔ زمر، فارس، ہاشم۔ اپنی زندگی کی پیچیدگیاں۔ کچھ

”کس سے بول رہے ہو سعدی بھائی؟“

وہ جو اپنی ”دعا“ ختم کر کے درود پڑھ رہا تھا جھک کر جوتے اتارے، پھر اس چھوٹے پٹھان لڑکے کی جانب متوجہ ہوا۔

”میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہا تھا۔“ اور ننگے پاؤں اندر صحن میں قدم رکھا۔ دم توڑنی رات کی اس گھڑی صحن کی اینٹیں ٹھنڈی تھیں۔

”توبہ۔ توبہ۔“ گل خان دو انگلیوں سے باری باری دونوں کان چھو تا پیچھے آیا۔

”اللہ سے ایسے بات نہیں کیا جاتا۔ اور (ادھر) مصلے پہ بیٹھ کر ادب سے بات کرتا ہے۔“

”میں ادب سے ہی بات کرتا ہوں، جیسے اپنے بیٹوں سے کرتا ہوں۔“ وہ نرمی سے کہتا اندر چلا آیا۔ گل خان کو خوب غصہ آیا۔

”سادی بھائی۔ ابھی مولوی صاحب دیکھ لیتا تم کو ایسے بات کرتے تو تمہارے پہ فتویٰ لگ جاتا۔“

”اچھا تم بتاؤ مجھے کہ دعا کیسے مانگتے ہیں؟“ وہ پرسکون سا مسکراتا ہوا جماعت والے مرکزی کمرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔

”ادب سے، تمیز سے، اور اور مصلے پہ بیٹھ کر دعا مانگا جاتا ہے۔ سر جھکا کر، رو کر۔ ہاں!“ ہاتھ ہلا ہلا کر خفگی سے اشارہ کر رہا تھا۔ سعدی نے مسکرا کر اس چھوٹے پٹھان لڑکے کو دیکھا جو سفید پشاور ٹوپی پہنے پائینچے اوپر چڑھائے کھڑا تھا۔

”اللہ ہماری وہی دعا قبول کرتے ہیں گل خان! جو ہم نے دل سے مانگی ہوتی ہو، اور دل سے نکلی باتیں نیچل ہونی چاہئیں۔ مصنوعی لفاظی، اور ٹی وی پہ بیٹھے علماء والی مشکل گاڑھی اردو۔ نہیں یار۔“ اس نے بے چارگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں عام زندگی میں جو ساہ زبان بولتا ہوں، مجھے اسی نیچل انداز میں اللہ سے بات کرنی چاہیے۔“

”توبہ۔ تم جلتے پھرتے کون سا بات کر رہا تھا؟“ اس کے اندر کے مفتی کو ہضم نہیں ہوا، گھور کر مشکوک انداز میں پوچھا۔

”میں فجر کا قرآن سن رہا تھا، ہر آیت کے بارے میں اپنے خیالات اللہ کو بتا رہا تھا، اور اس کے بعد میں ان کو وہ بتا رہا تھا جو میں نے کل کیا، اور جو آج کروں گا۔“ جالی دار ٹوپی سر پہ لیے اس نے رمان سے جواب دیا۔

برآمدے میں لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ کوئی اسے سلام کرنے رکا تو وہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ فارغ ہو کر واپس گھوما تو گل خان سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے بھائی! تم ایسے خود سے بول رہا ہوتا ہے۔ تم کو ایسے اللہ تعالیٰ سے بات کرنا کس نے سکھایا؟“

وہ ہلکا سا مسکرایا، مگر وہ اداس مسکراہٹ تھی۔

”میری پھپھو نے۔ وہ بھی ایک زمانے میں ایسے ہی دعا مانگی کرتی تھیں۔“ مسکراہٹ آہستہ آہستہ لبوں سے غائب ہوئی۔ ”اب نہیں مانگتیں۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ دل سخت ہو جاتے ہیں۔“ پھر سر جھٹکا۔ بہت سے خیال بھی جھٹکے۔

”تم بتاؤ، آج تمہارے تایا نے کس جگہ تھپڑ مار کر تمہیں نماز کے لیے اٹھایا ہے؟“ اب کے اس نے آنکھیں سکیڑ کر گل خان کے چہرے کو ادھر ادھر سے جانچا۔

”ہا!“ گل خان نے غصے سے آنکھیں پھیلانیں۔

”ہم ایسا کوئی نشانی ہے جو خود نہیں اٹھ سکتا، ہاں؟“ کمر پہ ہاتھ رکھے، ناراضی سے اسے گھورا۔

سعدی نے ”اچھا“ والے انداز میں ابرو اٹھایا۔ گل خان اسی طرح گھورتا رہا، پھر قدرے جزبہ سا گدی پہ ہاتھ رکھ کر قریب کھسکا۔

”کیا گردن ابھی تک سرخ ہے؟“ رازداری سے پوچھا۔ سعدی بے اختیار ہنس دیا، اس کے سر پہ چست رسید کی اور امامت کی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ گنتی کے لوگوں کی صفیں ترتیب دی جا رہی تھیں۔ نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

بس گنتی کے لوگ! السابقون السابقون!



موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو

پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے
اور پھر فخر کی وہ گھڑیاں انسان کو کبھی دوبارہ نہ ملنے
کے لیے کھوپچکی تھیں۔ روز فجر طلوع ہوگی مگر اس دن
کی پھر نہیں آئے گی۔ سورج پوری آب و تاب سے
نپکنے لگا تھا جب وہ سارہ کے گھر گائیٹ عبور کرتے اندر
آیا۔ آفس کے لباس میں تیار سیاہ سنہری کی چین
انگلیوں میں گھماتے اس نے داخلی دروازہ بجایا تو فوراً
کھل گیا۔ سامنے نور اسکول یونیفارم میں تیار کھڑی
تھی۔ وہ اس کو پیار کرتا اندر آیا تو لاؤنج میں ذکیہ بیگم
اٹل کے بال بنارہی تھیں۔ ایک آنکھ اس کے بالوں پہ
اور دوسری لی دی پہ شور کرتی کسی عورت پہ تھی۔ اس
کے سلام کرنے پہ چونکیں پھر مسکرا کر خوش دلی سے
اسے خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی ملازمہ کو آواز دی کہ
ناشتہ لائے۔

”تھینک یونانی! میں ناشتا کر کے آرہا ہوں۔“ اپنی
امی کی خالہ سے شائستگی سے معذرت کرتے وہ صوفے
پہ بیٹھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھی اور ادھر ادھر متلاشی
نظروں سے دیکھا۔

”ارے سعدی۔ تم؟“ سارہ اندر سے پرس اور
بیگ اٹھائے عجلت میں چلی آرہی تھی اسے دیکھ کر
رکی حیرت سے سوال کیا ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں
پکڑے کاغذ بیگ میں رکھے وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔
”آفس کے راستے میں سوچا آپ سے ادھر مل
لوں۔ پھر وہاں تو وقت ہی نہیں ملتا پاس!“

”کیا ہوا؟ خیریت؟“ وہ سامنے آئی۔ بالوں کا فریج
جوڑا بنائے بسی تھیں دوپٹے اور کانوں میں ٹاپس پہنے
سعدی کی پراجیکٹ ڈائریکٹر آفس کے لیے تیار لگ
رہی تھی۔

”کل کے پروگرام کا پوچھنا تھا۔ آپ آئیں گی نا؟
زمر اور فارس کا نکاح ہے کل۔“

بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اس نے
احتیاط سے لفظ نہنے۔ سارہ کے بیگ میں کاغذ گھسیڑتے
ہاتھ ذرا کی ذرا ڈھیلے پڑے گردن موڑی۔ ادھر ادھر
بھاگتی بچیوں کو دیکھا۔

”اپنے بھگڑ لو اور گاڑی میں بیٹھو فائنٹ۔ میں
آرہی ہوں۔“ پھر چہرہ اس کی طرف پھیرا ڈرا پھیکا سا
مسکرائی۔

”ہاں“ ندرت آپا نے فون کیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی
سن کر۔ ہاں تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ فارس کو رہا
ہوئے ابھی تین ہفتے تو ہوئے ہیں۔ مگر ضرور یہی اچھا
ہوگا۔“ سر ہلا کر کہتے اس نے موبائل بیگ کے زپ
والے خانے میں رکھا۔

”آپ۔ آئیں گی نا؟“
”اصل میں میری پلاننگ کمیشن کے کچھ
عمدیداروں کے ساتھ کل میٹنگ ہے۔“
”کل اتوار ہے خالہ!“

”تو بچ پہ ہے نا میٹنگ۔“ (ذکیہ بیگم نے نفی میں
تکان سے سر جھٹکا)

”آپ کو پتا ہے میں پندرہ منٹ میں پلاننگ کمیشن
والوں سے لیج کی تاریخ اور وقت معلوم کر لوں گا۔“
”اوکے سعدی!“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر
سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”میں نہیں آسکوں گی۔“

”ہم لوگ آپ کی فیملی ہیں آپ کو آنا چاہیے۔
میں جتنا سب کو جوڑ کر رکھنا چاہتا ہوں اتنے ہی سب
ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔“ اس نے
شاکی نظروں سے سارہ کو دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے میں گیدرنگز میں نہیں جاتی۔“

”مجھے یہ پتا ہے کہ آپ فارس ماموں سے اپنے
آپ کو اور اپنے بچوں کو دور رکھنے کی کوشش کر رہی
ہیں۔“ حیرت بھرے دکھ سے وہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ قابل
نہیں ہیں یونوویٹ!“ (آپ جانتی ہیں یہ)

”مگر فارس وجہ ہے اس سب کی!“ وہ قدرے بلند

آواز سے بولی۔ آنکھوں میں درو بے بسی، نمی، سب
ایک ساتھ ابھرا۔ ”اس کو پھنسانے کے لیے اس کے
بھائی اور بیوی کو مارا گیا۔ فارس کا مطلب ہے
”مہصیت“ اور میں اپنے بچوں کو ہر قسم کی مہصیت

سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ جب ایک دفعہ کوئی
مرجاتا ہے تو واپس نہیں آتا، بھلے تم اس کے لیے کتنے

انتقام لیتے پھرو۔“

سعدی چند لمحے کے لیے خاموش رہ گیا مگر پھر مضبوطی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

”یونوداٹ‘ سب سے زیادہ مصیبت میں کون لوگ رڑتے ہیں؟ جو سب سے زیادہ مصیبتوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سی یوان آفس۔“

اور اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہ ذکیہ بیگم کو سلام کرتا باہر نکل گیا۔

سارہ نے افسوس سے سر جھٹکا پھر مڑی تو ذکیہ بیگم غلطی سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”امی! میں کسی ٹیکچر کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں نے کہا، ہم نہیں جائیں گے تو نہیں جائیں گے۔“ ان سے نگاہ ملائے بغیر وہ بیک اٹھائے دروازے کی جانب پیڑھ گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو سعدی کی کار دور جا رہی تھی۔



قیس تھا لا جواب لیلیٰ بھی جب سوال ایک کی بقا کا تھا

اتوار کی شام یوسف صاحب کے گھر پہ کوئی ایسی دھن فضاؤں نے بکھیر رکھی تھی جس میں نہ آواز تھی نہ موسیقی صرف کیفیت تھی۔ خوشی کی کیفیت۔ لاؤنج میں رونق سی لگی تھی گوکہ مہمان کوئی نہیں تھا سب اپنے ہی لوگ تھے۔ ادھر سامنے صوفے پر ندرت اور فارس کے کزن جمال بھائی تھے۔ ان کی بیگم تھیں۔ سارہ کی والدہ ذکیہ خالہ تھیں۔ ان کے ہمراہ شفون کا جوڑا بیٹے عرصے بعد تیار سی ہوئی ندرت بیٹھی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے ان لوگوں سے محو گفتگو تھیں۔ گاہ بگاہ نگاہ اٹھا کر مقابل صوفوں کی سمت بھی دیکھ لیتیں جمال فارس بیٹھا تھا۔ اس نے آف وائٹ کرتا پہن رکھا تھا تین ہفتے قبل جیل سے رہا ہوتے وقت کے بے حد چھوٹے بال اب قدرے بڑھ کر اچھے لگ رہے تھے۔ البتہ خاموش تھا سنجیدہ اور خاموش۔ بس گردن بڑے ابا کی طرف موڑے

دھیان سے ان کی کوئی بات سن رہا تھا۔

بڑے ابا خوش تھے دھیما مسکرا بھی رہے تھے۔ انہوں نے بھی آف وائٹ نئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ تازہ دم اور صحت مند دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی فارس سے کوئی بات کہتے تو کبھی قریب بیٹھے نکاح خواں قاری صاحب سے۔ ایسے میں سیم ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے سب سے زیادہ اداس بیٹھا تھا۔ اگر ندرت اس کو غلطی سے دیکھ لیتیں تو ہنا آواز کے ہونٹ ہلا کر پوچھنے لگ جاتا۔

”کھانا کب لگے گا؟“ اور دو تین دفعہ تو ندرت کا ہاتھ جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔

راہداری سے آگے بڑھتے جاؤ تو زمر کے کمرے کا دروازہ آ جاتا۔ وہ بند تھا۔ اس کے پار اندر بھی گویا مصروف سا انداز لگتا تھا۔ حنین اپنے گلابی لمبے گاؤں میں ملبوس کھلے بالوں میں ہمو بند لگائے سر جھکائے ڈریسنگ ٹیبل پہ کھلا میک اپ کا سامان ٹھیک کر رہی تھی۔ ساتھ ہی امی کی کزن فرزانہ کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔ فرزانہ کے شوہر امجد بھائی جو زمر کے بھی کزن ہوتے تھے سعدی کے ہمراہ سامنے کاؤچ پہ بیٹھے تھے۔

سعدی جو بھورے کرتے میں ملبوس تھا قلم کھولتے ہوئے نکاح کے کاغذات لیے کاؤچ سے اٹھا اور جھک کر انہیں زمر کے گھٹنوں پہ رکھا جو ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پہ بیٹھی ان کی طرف رخ کیے ہوئے تھی۔ اس نے ہلکے کام کی سفید لمبی میکسی پہن رکھی تھی۔ نیچے سلک کا پاجامہ ٹخنوں کو ڈھکے نظر آتا تھا۔ کلاہ اردوٹے کے کناروں کی سبز پانپنگ اور کہیں کہیں سبز اسٹونز کے سوا پورا لباس سفید تھا۔ بال سیدھے کر کے اونچا جوڑا بناتا تھا جس پہ دوپٹہ نکاتا تھا میک اپ ہلکا تھا کانوں میں اور گردن میں سہمے ہیرے تھے۔ وہ خوب صورت لگ رہی تھی اور پرسکون بھی۔ سکون سے چہرہ جھکائے نکاح کے کاغذات کے صفحے پلٹے پھر کاجل سے گہری کی ہوئی بھوری آنکھیں اٹھا کر سعدی کو دیکھا اور سوالیہ ابرو اٹھائی۔

”یہ کیا ہے؟“ امجد بھائی کی موجودگی کے باعث

مسکرا کر پوچھا۔ وہ بھی شرارت سے مسکراہٹ دبائے
اتنی ہی معصومیت سے بولا۔

”اے نکاح نامہ کہتے ہیں۔“

”جی، مگر سعدی۔۔۔ یہ سیکشن کاٹنے سے میں نے
غالبا منع کیا تھا۔“ مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں
گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کا اشارہ حق طلاق کی
جانب تھا۔

”یہ آپ کے والد کی خواہش تھی، جو مجھ جیسے تابع
دار پوتے نے پوری کی۔ آپ کو کوئی اعتراض؟“

زمر نے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے اسے
دیکھا۔ ”میرے والد سے کہیے، جس طرح میں نے کہا
تھا، ویسا ہی نکاح نامہ تیار کر کے مجھے بھجوائیں، میں
دستخط کروں گی۔“ کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔

سعدی نے مسکرا کر کاغذ کے بجائے اس کا ہاتھ تھاما
”اے آہستہ سے اسٹول سے اٹھایا، اور دروازے تک
لے آیا۔ دروازہ کھولا اور سامنے لاؤنج کا منظر دکھایا۔
یہاں سے بڑے ابا اور فارس نظر آ رہے تھے، کیونکہ وہ
مرکزی جگہ پر بیٹھے تھے۔“

”آپ یہ بات اپنے والد سے خود جا کر کیوں نہیں
کہہ دیتیں۔ کتنے خوش ہوں گے وہ سن کر، ہے نا؟“
اسی معصومیت سے سعدی نے زمر کو دیکھا۔ زمر نے
اس طرف چہرہ کیا۔ ابا مسکراتے ہوئے فارس سے کچھ
کہہ رہے تھے۔ خوش، اُمید، پہلے سے جوان۔ اب
کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تماشا نہیں کر سکتی تھی۔ زمر
نے گھور کر سعدی کو دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے، کسی کی مرضی کے خلاف ڈاکومنٹ
پر دستخط کروانا کتنا بڑا جرم ہے؟“

”جی۔ تو آپ مجھے اس جرم میں گرفتار کیوں نہیں
کروا دیتیں؟“ وہ پھر سے مسکرایا۔ زمر لب بلبچنے وہیں
کھڑی اسے گھورتی رہی۔ تب ہی بڑے ابا کی بات سننے
فارس نے انہیں دیکھنے کے لیے سر اٹھایا، تو نگاہ
پھسلی۔ راہداری کے سرے پر کمرے کے کھلے
دروازے پر وہ سعدی کے ساتھ کھڑی تھی۔ نیم رخ
نظر آتا تھا۔ دوپٹہ سر پہ نکاتا تھا اور نیچے پاؤں تک گرتا

میکسی کافلینٹر۔ وہ سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ فارس نے
ایک نظر اوہر دیکھا، پھر فوراً ”چہرہ موڑ کر ابا کو دیکھنے لگا۔“

”میں ابا سے حساب بعد میں لے لوں گی۔ اور یہ
مت سمجھنا کہ ایک سیکشن کاٹنے یا نہ کاٹنے سے
میرے حقوق پر کوئی فرق پڑے گا۔“

دروازے میں کھڑے انگلی اٹھا کر دہلی آواز میں اسے
تنبیہ کی۔ ”وکیلوں کو ایک ہزار ایک طریقے آتے
ہیں، اپنی مرضی کے مطابق قانون کو ڈھالنے کے
لیے۔“

خفگی سے اسے دیکھ کر مڑی اور رسمی مسکراہٹ کے
ساتھ واپس اسٹول پر آکر بیٹھ گئی۔ کمرے کے باقی
لوگ اپنی آوازوں کے باعث ان کی گفتگو سے یکسر
انجان رہے۔ وہ بیٹھی تو سعدی نے نکاح نامہ اس کی
گھٹنوں پر رکھا، اس کے قریب جھک کر اس نے دعائیہ
کلمات پڑھے۔ قلم اس کے ہاتھ میں دیا۔

”کیا آپ زمر یوسف ولد یوسف خان، فارس غازی
ولد ظہیر غازی کو دس لاکھ روپے حق مہر سکہ رائج
الوقت اپنے نکاح میں۔“ وہ لڑکا سنجیدگی سے عقد
نکاح کی سطور پڑھ رہا تھا۔ زمر کا سر جھکا تھا اور قلم
انگلیوں کے درمیان تھا۔

”میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا۔ صرف
ایک گولی۔ آئی ایم سوری زمر۔“
”قبول ہے۔“ اس نے سر ہلا کر ہلکے سے کہا۔
”میں بے گناہ تھا سیڈم زمر! میں بے گناہ تھا۔“
”قبول ہے۔“

”میں۔۔۔ معافی نہیں مانگوں گا۔“

”قبول ہے۔“ آخری دفعہ کہتے اس کی جھکی

آنکھوں میں گلابی سی نمی ابھری۔ مگر اس نے وہ سب
اندرا تارلی۔

دھڑا دھڑا مطلوبہ جگہوں پر دستخط کیے۔ قلم اور
کاغذات سعدی کی طرف بڑھائے۔ وہ کوئی دعا پڑھتے
اٹھا، زمر کے سر پر ہاتھ رکھا، جھک کر اس کے بال
چوڑے اور کاغذات لیے، امجد بھائی کے ہمراہ باہر نکل
گیا۔ زمر نے سر اٹھا کر دیکھا تو حنین اسی طرح کھڑی

تھی اور فرزانہ باجی اپنی بیٹی کے ہمراہ اسی طرح بولے جا رہی تھیں، مگر وہ جانتی تھی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہے گا۔

”مبارک ہو پھپھو۔“ حندہ نے آہستگی سے نگاہ ملائے بغیر کہا تو زمر نے مسکرا کر سر کو خم کیا۔ سرخ واپس ڈریسنگ کے آئینے کی جانب موڑا۔ اپنا عکس دیکھا۔ کام دار لباس میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ادھر کھلے دروازے سے باہر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایجاب و قبول کے الفاظ۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے جبراً مسکراتے وہ آوازیں سنیں۔ فرزانہ باجی اور ان کی بیٹی باہر نکل گئیں۔

حنین وہیں کھڑی رہ گئی۔ باہر دعا ہو رہی تھی۔

زمر نے جھک کر ڈریسنگ کی دو سری دراز کھولی۔ دو ڈبیاں نکالیں۔ ایک سیاہ مخملیں ڈلی اور دو سری سرخ۔ پہلی ڈلی کھولی تو وہ اندر سے خالی تھی۔ سوائے ننھے سے کارڈ کے جس پر فارس کے لکھے الفاظ کی سیاہی ابھی تک دیکھی ہی نہ تھی۔ حندہ نے ذرا چونک کر اسے دیکھا جو ساتھ ہی دو سری نی ڈلی بھی کھول رہی تھی۔ اس کے اندر وائٹ گولڈ کی ننھی سی ننھہ رکھی تھی۔

”دیکھو حندہ! ابانے مجھے شادی کا کیا تحفہ دیا۔“ زمر دو انگلیوں سے ناک کی لونگ اتارتے ہوئے بولی۔ یہ واپس رکھنی تھی اور نئی پہننی تھی۔ حنین ایک دم بے چینی سے سیدھی ہوئی۔

”آپ یہ مت اتاریں۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہے۔

لونگ کھولتے اس کے ہاتھ رکھے۔ سوا یہ نگاہوں سے حندہ کا چہرہ دیکھا۔ ”کیوں؟“

”یہ۔۔۔ یہ اچھی لگ رہی ہے۔ بس آپ یہ ننھہ مت پہنیں۔“

”کیوں نہ پہنے؟“ آواز پہ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ندرت بڑے ابا کی وہیل چیر لا رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے زمر کے قریب آئے، اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، مدھم آواز میں کوئی دعا دی۔ حنین اس دوران بے چینی سے انگلیاں موڑتی رہی۔

”ہاں تو کیوں نہ پہنے میری بیٹی میرا تحفہ؟“ انہوں نے مصنوعی خفگی سے حندہ کو دیکھا۔

”کیونکہ۔۔۔ یہ ننھہ مجھے پسند آگئی ہے۔ پھپھو کے پاس تو اس سے زیادہ قیمتی والی پہلے ہی ہے۔ یہ میں رکھ لوں ابا؟“

لیک کر ننھہ کی ڈلی اٹھائی اور معصومیت سے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ بڑے ابا مسکرا دیے۔

”میں نے اپنی بیٹی کے لیے خریدی تھی۔ اب کون سی بیٹی اسے رکھے؟ یہ تم دونوں خود طے کر لو۔“

کہتے ساتھ انہوں نے زمر کے چہرے کو بھی دیکھا۔ وہ بھی نرمی سے مسکرا دی۔

”شیور حندہ! یہ تمہاری ہوئی۔“ وہ ڈھیلی کردہ لونگ دوبارہ کئے گئی۔ اور ندرت کا ہاتھ جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔

”تمیز ہے تم میں؟ ابا نے زمر کو شادی کا گفٹ دیا ہے، کسی کا گفٹ لینا کہاں سے سیکھا ہے تم نے؟“ غصے سے لال پیلی ہوتی ندرت کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ تھپڑ لگا دیں اسے۔

”تو باقی سب بھی تو ابانے دیا ہے پھپھو کو۔ اب مجھے اچھی لگ گئی تو کیا کروں؟“ وہ نروٹھے پن سے کہتی ڈلی مٹھی میں جکڑے کھڑی رہی۔

”ہم گھر کو پہنچو،“ کہیں سیدھا کرتی ہوں میں۔“

ندرت نے اشارۃ مدعا سمجھا دیا۔ وہ ڈھبٹوں کی طرح دو سری جانب دیکھنے لگی۔ زمر بڑے ابا سے بات کر رہی تھی۔ پھر وہ مسکرا کر دوبارہ اسے کوئی دعا دیتے، ندرت کے ہمراہ باہر کی طرف ہو لیے تو زمر اس کی طرف گھومی۔

”تو تم ناک چھدوا رہی ہو؟ اچھی لگے گی تم پہ۔“

مسکرا کر کہتے وہ کھڑی ہوئی۔ ابھی بس چند منٹ میں اسے باہر جا کر مہمانوں کے سامنے بیٹھنا تھا۔ فارس کے ساتھ بیٹھنا تھا، وہ آئینے میں اپنا سر لپا دیکھتی، کندھے سے دوٹے کی پن درست کرنے لگی۔

حنین ڈلی کھول کر ننھہ کو یونہی چھیڑنے لگی۔ اور یہ تب ہی تھا جب ان دونوں نے وہ آواز سنی۔

کھلی کھڑکی کے باہر گھڑکی چار دیواری تھی اور درمیان کی چار فٹ کی گلی میں سعدی موبائل پہ غجلت میں بات کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”مس حلیمہ! میں سوموار کو یعنی کہ کل، صبح دس بجے آنا چاہتا ہوں۔ آجاؤں؟“ وہ موبائل کلن سے لگائے چہرہ جھکائے کہہ رہا تھا۔ حنین اور زمر بے اختیار اسے دیکھنے لگیں۔ نکاح کے فوراً بعد اتنے مصروف وقت میں بھی وہ کسی کو یوں باہر نکل کر کال کر رہا تھا۔ زمر آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتی کھڑکی کے قریب آئی۔

”اوکے۔ پھر میں دس بجے پہنچ جاؤں گا۔ آپ۔۔۔“

کہتے کہتے نگاہ اٹھائی تو کھڑکی کی جالی کے پیچھے دلہن بنی زمر کھڑی تھی۔ وہ ”آپ ہاشم کو۔۔۔“ کے بجائے ”آپ اور بتا دیجیے گا“ کہہ کر جلدی سے کال بند کر کے زمر کو دیکھ کر مسکرایا۔

”ہوت۔ تو یہ حلیمہ کون ہے؟“ اس نے شرارتی مسکراہٹ دبائے پوچھا۔ سعدی نے ”اف“ کے انداز میں بھنوس بھینچ کر اسے دیکھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک میٹنگ کا ٹائم لے رہا تھا۔“

”اور کس سے میٹنگ؟ حلیمہ کے والدین سے؟“

”اللہ زمر۔ آپ بھی نا۔“ اس نے شرمندہ سا ہوتے ہوئے سر جھٹلایا۔ ”مجھے واقعی اس کے پاس سے ملنا ہے۔“

”اچھا تو کون ہے حلیمہ کا پاس؟“ وہ اسی طرح مطمئن پُرسکون سی پوچھ رہی تھی۔ سعدی نے سوچتے ہوئے ٹھوڑی کھجالی۔ کیا جواب دے؟ سات سالوں کی ساری یادیں اٹھ کر آنکھوں کے سامنے آئیں اور پھر۔

”وہ۔۔۔ نیکس کام کا ایک سائنس دان ہے کام کے سلسلے میں ملنا تھا اس سے۔ آپ بھی نا۔“

اور بہت خفگی سے سعدی ذو الفقار یوسف خان نے جھوٹ بول دیا، پھر واپس مڑ گیا، یہ جانے بغیر کہ آج اس نے اپنی زندگی کی دسری بڑی غلطی کر دی ہے۔ پہلی

اسے کل عین اسی وقت کرنا تھی۔

زمر مسکراہٹ دبائے اسے جاتے دیکھتی رہی اور حنین نے گھڑکی سانس لے کر کندھے اچکا دیے۔

وہ دونوں ”اور لاؤنج میں بیٹھے مسکراتے بڑے ابا“ اور شجیدہ سا بیٹھا فارس ”اور کھانا کھانے کا انتظار کرتا سیم“ اور خوشی سے بار بار نرم ہوتی آنکھوں کو پونچھتیں ندرت ”اور کچن میں بھاگ بھاگ کر کام کرنا صداقت“ وہ سب اس بات سے ناواقف رہے کہ ٹھیک تیس گھنٹے اور بارہ منٹ بعد وہ سعدی یوسف کو کھودیں گے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناؤز

300/-	ساری بھول ہماری تھی	راحت جبین
300/-	او بے پروا جن	راحت جبین
350/-	ایک میں اور ایک تم	عزیزہ ریاض
350/-	بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی
300/-	دیکھ زوہ محبت	صائمہ اکرم چوہدری
350/-	کسی راستے کی تلاش میں	میمنہ خورشید علی
300/-	ہستی کا آہنگ	نمرہ بخاری
300/-	دل موم کا دیا	سائرہ ۱۰۰
300/-	ساڈا چڑیا دا چنبا	نصیبہ سعید
500/-	ستارہ شام	آمنہ ریاض
300/-	صحف	نمرہ احمد
750/-	دست کوڑہ گر	فوزیہ یاسمین
300/-	محبت من عمر	سمیرا حمید

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

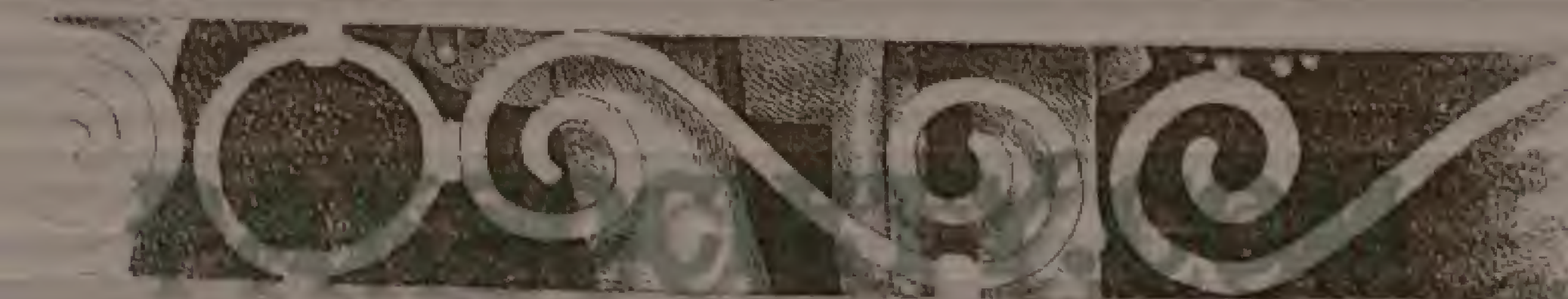
37، اردو بازار، کراچی

پن سنا کی صدا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معییز، زار اور ایزد۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیت تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ، ہنسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی، نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً "صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے گزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ، امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا رہا تھا۔ وہ جواہری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور بڑا بڑا دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً "آجائے میں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا میٹا معییز احمد باب کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ سر جاتی ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر بائٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معینز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زار اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معینز اسے بے عزت کر کے گیت سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زار کی مندر باب ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے 'ان سے پیسے بنور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب معینز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معینز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معینز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا ریس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ بڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں زور زدستی کر کے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معینز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید تلخ پا ہوتی ہیں۔ معینز ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معینز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون معینز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھر ملا جلسے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور با اعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے جہاں معینز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز جلسے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلا وجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً "سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معینز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معینز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معینز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتی ہی ہاتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجلنے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوٹی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معینز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معینز احمد ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور میم اسے اپنا رانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا رہا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے مگر وہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعتا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معینز احمد سے طے کر دیتی ہے مگر معینز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوی پار لگئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا ثانیہ کو فون کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوی پار لگچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم حنا کو بیوی پار لگچ دیتی ہے مگر ثانیہ ابیہا کو وہاں سے

نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیذ اسے اپنے گھر انیلیسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم
 بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیذ سمیت زارا اور ایزوا نہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیذ احمد اپنے باپ کی
 وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی
 ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ
 کرتی ہے۔ عون نادوم ہو کر کچھ اسیائے خورد نوش لے آتا ہے۔ معیذ احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ توجہ رہا کے ساتھ
 گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیذ
 کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارح کرتی ہیں اور اسے
 بے عزت کرنے کے لیے اسے نذراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی
 ہے۔ معیذ کو برا لگتا ہے مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر
 تشدد بھی کرتی ہیں۔

راے نے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے
 لیے بھیجے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے
 شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے
 ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن سلیم ایک اچھی لڑکی ہے، وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے
 پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے
 لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی
 ہے۔ تاہم ہندی میں کی گئی ثانیہ کی بد تمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رہا اب سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی
 تھجک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ
 آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے پھڑپھڑاتی ہیں جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب
 وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیذ اگر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آکر اس کی بینڈیج کرنا
 ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیذ کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیذ سے ابیہا کو طلاق
 دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

19 انیسویں قسط

جس طرح ثانیہ کو تھسٹ اور کھینچ کر گاڑی میں ڈالا گیا تھا، اس کا سر بری طرح گاڑی کے دروازے سے
 ٹکرایا۔ مگر اس وقت اسے اس تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ میں اغوا ہو گئی ہوں۔“
 پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ شخص اگر بیٹھا ہی تھا کہ ثانیہ نے اس پر پلکی کی طرح
 غرا کر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔
 مگر عون پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ پہلا اطمینان تو یہ ہوا کہ اغوا سے بچ گئی، عون نے گاڑی چلا دی تو ثانیہ
 کا غصہ بھی عود کر آیا۔
 ”کیا بد تمیزی تھی بلکہ بد تمیزی۔“ سر کی چوٹ جیسے ابھی ابھی لگی ہو۔ ایسی ٹیس اٹھی تھی دماغ میں۔ پیشانی
 کا درد الگ۔

”تم جیسوں کے ساتھ جو بھی کیا جائے وہ کم ہے۔“ عون کا لہجہ۔ اف۔ پتھر رسا تا۔ ثانیہ ہلبلا اٹھی۔ روح تک چوٹ گئی تھی۔ زبان سے برسنے والے پتھر روح کو ہی زخمی کیا کرتے ہیں ناں۔

”مجھ جیسوں سے کیا مراد ہے تمہاری۔ اور یہ گاڑی۔ روکو۔ روکو اسے۔“

تلملا کر بے حد غصے سے کہتے ہوئے ثانیہ نے اسٹیرنگ تھامے عون کے ہاتھوں پہ ہاتھ مارے تو گاڑی سڑک پر لہرا سی گئی۔ وہ ابھی مین روڈ پہ داخل ہوئے تھے۔

”پاگل ہو گئی ہو۔ ایکسپلینٹ کرو اوگی؟“ عون نے بائیں ہاتھ سے اسے پیچھے دھکیلا۔

”ہاں۔ ایک ہی بار کا مرنا قبول ہے مجھے۔“ ثانیہ نے چلا کر کہا تو عون نے ناگوار سی سے اسے دیکھا۔ وہ ویسی ہی دکھائی دی۔ ہٹ دھرم اور ضدی۔

”کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ڈیٹ پہ نہیں لے جا رہا ہوں۔ کچھ باتیں واضح کرنی ہیں تم پر اور کچھ حقیقت۔“ کلیلے انداز میں کہا۔

بھالا سیدھا ثانیہ کے دل میں کہا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ ”مخالف“ کی خاموشی کا مطلب ”سب ٹھیک“ ہے تو وہ سوچ غلط نکلی۔ اور اتنا درست تو وہ بھی بہت سخت تھی۔ اخروٹ کا سا خول فوراً ہی خود پر چڑھا لیا۔

لو بھلا۔ لڑکیاں موسم کی گڑیاں تھوڑی ہوتی ہیں۔ ذرا اسی بات پر گرم ہو کر پگھلا ڈالا انہیں۔

”خوش فہمی میں تو تم گھرے ہو عون عباس۔ میرا رویہ تو اول روز سے ہی یہی ہے۔ گھٹنے تو تم نے ٹیکے تھے۔ میں نے نہیں۔“

کیا پرف تھی لہجے میں۔ عون تو تڑپ ہی اٹھا گیا۔ کتنے آرام سے وہ باور کرا گئی تھی کہ وہ نہ کل عون عباس کو کچھ سمجھتی تھی اور نہ آج سمجھتی ہے۔ زہر آلود تیر۔

”شٹ اپ۔ میں اگر تم سے نرمی سے پیش آتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھٹنے ٹیک چکا ہوں تمہارے آگے صرف تمہارے لڑکی ہونے کا احساس ہے مجھے۔“

عون کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیرنگ وہیل پر سخت تھی دانت کچکچا کر بولا۔

ثانیہ نے اپنا مضروب سر ہاتھ سے سہلایا۔

”ویری گڈ۔ واپسی پہ مجھے ماموں جان سے ضرور ملوانا۔ یہ سر کی چوٹ تو میں ضرور ہی دکھاؤں گی۔ جو تم نے اغوا کرنے کے دوران لگائی ہے مجھے۔“

”ہنہ۔ اغوا کرنے کے لیے تم ہی رہ گئی ہو نا اس دنیا میں۔“ عون نے تشف سے ہنکارا بھرا۔

”تمہارا عمل تمہارے لفظوں سے میل نہیں کھاتا ہا مسٹر عون۔“ تلخی ثانیہ کے لہجے میں بھی برابر کی تھی۔

”کب سے پیچھا کر رہے ہو میرا۔ یونہی تو دل بن کے نہیں ٹپک پڑے ایسہا کے گھر کے باہر۔“

اس قدر تمسخر۔ اف۔ اف۔ عون کا دل چاہا سامنے درخت میں گاڑی دے مارے۔

”یہ کیا تماشا لگا رہا ہے تم نے شادی کے نام پر؟“ اچھی طرح دانتوں کو پیس اور کچکچا لینے کے بعد عون نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”میرے خیال میں آخری فون کال پہ ہم یہ بات ڈسکس کر چکے ہیں۔“ ثانیہ نے برجستہ جتایا۔

”ثانیہ یہ مذاق نہیں زندگی ہے۔“ عون سنجیدہ تھا۔

”اس زندگی کو مذاق تم بنا رہے ہو میں نہیں۔“ وہ سامنے اندھیرے میں گھورتے ہوئے تلخی سے بولی۔

”ہم ایک اچھا فیصلہ کر کے اپنی زندگیوں کو بہتر بنا سکتے تھے۔“

COCKROACH NIL قتل



6 سال تک لال بیک کا دعویٰ
نہ ہوگا دوبارہ

لال بیک بھگائیں۔۔ سکون پائیں



قیمت صرف 695 روپے

ملک کے تمام چھوٹے بڑے
شہروں سے ڈسٹری بیوٹر درکار ہیں

کچن، ریسٹورانٹ، بیکری، دکان، گودام اور
فیکٹری سے لال بیک کا خاتمہ ہمیشہ کیلئے
لال بیک کو مارنے کیلئے جتنے بھی جتن کریں اور
کوئی بھی سپرے کریں یہ چند دنوں بعد دوبارہ
پیدا ہو جاتا ہے۔ کا کروچ نل کے استعمال سے
6 سال تک اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے کا کروچ نل
انسانی صحت کیلئے بے ضرر ہے اور اس کا استعمال
انتہائی آسان ہے گھر کے کچن، ہوٹل، ریسٹورانٹ
، بیکری، دکان، گودام یا جہاں بھی لال بیک پایا
جاتا ہو اس کو استعمال کریں اور ایسے گندے
کیڑے سے ہمیشہ کیلئے نجات حاصل کریں

فری ہوم ڈیلیوری کیلئے صبح 9 بجے سے رات 9 بجے تک آرڈر بک کروائیں

COCKROACH NIL بہت جلد تمام چھوٹے بڑے شہروں کے جنرل سٹورز پر دستیاب ہوگا

051-2803226-9 0312-5565662, 0323-5008715

عون نے جتنی آسانی سے کہہ دیا، ان لفظوں کو سنتا، ثانیہ کے لیے اتنا آسان ثابت نہ ہوا۔ دل جیسی کسی نے چیر سا دیا ہو۔

”میری زندگی کی فکر تم میرے لیے چھوڑ دو۔ اور اپنی زندگی کا جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو وہ کر لو۔“
بڑے حوصلے سے ثانیہ نے اپنے دل کے ٹکڑے کر کے عون کا حصہ الگ کرنا شروع کیا تھا۔ آنسو تھے کہ اٹھ پڑتے، ہنسنے کی تمام تر برداشت آزمانے پر مجبور تھی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں حلق دکنے لگا۔
”یہی تو کر نہیں سکتا۔“ عون نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس پر تنگی مارے۔ اور سلگتے ہوئے بولا۔
”یہ ہم دونوں کی مرضی سے ہونے والا فیصلہ ہے۔ تم اپنی بات پر اڑ جاؤ اور باقی کا درد سر میرے لیے چھوڑ دو۔“
عون نے بات ختم کرتے ہوئے گاڑی روک دی۔ پھوپھو کا گھر آگیا تھا۔

عون نے اس کی طرف دیکھ کر جھپٹے لہجے میں کہا۔
”ویسا ہی انکار۔ جیسے تم نے پہلے کیا تھا۔“ ثانیہ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی۔
عون نے نیچے اتر کر کچھلی نشست پر بکھرے ثانیہ کے شاہجہاں نکال کر اس کی طرف برعنائے۔
ثانیہ نے ہنسنے کی طرف دیکھا۔

”میں نے جو فیصلہ کرنا تھا وہ کر چکی عون۔ اب تمہاری باری ہے۔“
ثانیہ نے حوصلے سے اسے ”آزاد“ کیا تھا۔ مگر عون کی توجہ اس کے الفاظ پر نہیں، اس کی پیشانی پر تھی۔ جہاں شاید گاڑی کی رگڑ سے ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ عون کا دل کٹنے لگا۔
اس نے بے اختیار اور بلا ارادہ ہی ثانیہ کا ہاتھ تھامنا تو وہ جو گیٹ کی طرف مڑ رہی تھی، کرنٹ کھا کر پلٹی۔ ”ایک سیکنڈ ٹھہرو۔“

وہ اپنے والٹ میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ ثانیہ بڑے ضبط سے کھڑی رہی۔ عون نے سنی پلاسٹ نکال کر اس کی پیشانی کے زخم پر لگایا تو وہ ساکت سی رہ گئی۔
عون کو درد حقیقت یہ چوٹ اپنے دل پہ لگتی محسوس ہوئی تھی۔
وہ ثانیہ کو ایک کانٹا چبھنے جتنی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر جب ثانیہ کو غصے سے ٹھیسٹ کر گاڑی میں ڈالا تو اس وقت شاید وہ انسان نہیں رہا تھا۔
”آئم سوری۔“ نرم اور بہت ہار اہوا سا لہجہ۔

ثانیہ کا دل پھل پھل کر موم ہوا اور آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔ اس کے بالکل نزدیک کھڑا یہ شخص اب اس کے لیے کیا تھا وہ اگر ابھی جان جاتا تو اپنے ہونے پر فخر کرتا۔ ”اور جو چوٹ دل پہ لگا رہے ہو اس کا کیا۔؟“ رندھے ہوئے لہجے میں کہتی وہ ایک سخت پلٹی اور ڈور نیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔ فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ عورت کے لیے اپنی شکست کا اظہار کرنا کس قدر مشکل کام تھا۔

آپس میں محبت اور مان ہو تو عورت کے لیے شکست کا اظہار ”رو مینس“ کہلاتا ہے، لیکن اگر یہی کام وہاں کرنا پڑے جہاں معاملہ یکطرفہ ہو تو عورت کو ایسا اظہار ”ذلت“ کے مترادف لگتا ہے۔
ثانیہ بھی اسی مقام پر کھڑی تھی، جہاں آج یہ اظہار ذلت لگ رہا تھا۔ وہ دروازہ کھلنے پہ مڑ کے دیکھے بنا اندر چلی گئی۔ اور عون عباس اس کے پسلی نما لفظوں کے دریا میں چک پھیریاں کھا رہا تھا۔
یہ عورت بھی کیسی پسلی ہے۔ جس کا جواب مرد کے پاس تو ہرگز نہیں ہے۔
عون کو بھی رندھے ہوئے اس لب و لہجے کا جواب نہیں مل سکا تھا۔

جیتی ہوئی عورت کا اتنا ہارا ہوا انداز؟ ماؤف ذہن لیے وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔



اندر آتے ہی اس نے لاؤنج میں صوفے پر شاپنگ بیگز پھینکے اور خود بھی وہیں گر کے ہاتھوں میں منہ چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

خالہ جان جو اس کے انتظار میں وہیں میگزین لے کے بیٹھ گئی تھیں، ٹینک کے اوپر سے جھانکتی حیران و پریشان ہو گئیں۔

”ہائیں۔ تمہیں کیا ہو گیا آتے ہی۔؟“ وہ میگزین سائیڈ پر رکھتی اٹھ کے اس کے پاس آ بیٹھیں۔ تو ثانیہ کے آنسو تو کیا سانس بھی گھم سی گئی۔ شدید جذباتیت میں اس نے خالہ کی موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

پسینا چہرہ سرخ ہوتی آنکھیں اور سوس سوس کرتی ناک، خالہ کا دل کسی نے مٹھی میں کر لیا۔ انہوں نے بے اختیار اسے تھام کے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”ثانیہ! میری بچی۔ کیا ہوا ہے؟“

ان کے ذہن میں کئی وہم چھکا چھک ریل گاڑی کی طرح گزرے تھے۔ وہ یونہی خاموش ان کے ساتھ لگی ان کی محبت اور شفقت کو محسوس کرتی خود کو سنبھالتی رہی۔ اور خالہ بے چاری ہولتی رہیں۔

”تم تو اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھیں نا۔“ وہ آہستہ سے ان سے الگ ہو کر دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کھنکھاری اور پھر صاف مگر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”جی۔ کرلی شاپنگ۔“

”تو پھر رو میں کیوں؟“ انہیں اچنبھا ہوا۔ وہ اٹھتے ہوئے اپنے شاپنگ بیگز ان کے سامنے الٹ کر بات برائے بات بولی۔

”ایسے ہی دکان دار اتنی مہنگی مہنگی چیزیں بتا رہے تھے، اب ہا کے ساتھ میں نے اپنی بھی کچھ چیزیں لے لیں۔“

”تو تم اس وجہ سے رو میں کہ دکان دار نے چیزیں مہنگی بتائیں؟“ خالہ کی آواز مارے حیرت کے کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی۔ ثانیہ سٹیٹائی۔

”نہیں۔ روٹی تو ایسے ہی تھی بس۔“

”ہائی۔!“ خالہ نے تارسی انداز میں اسے پکارا۔ اور اس پکار کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھی اور لاڈ سے ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

”ایسے ہی خیال آیا کہ کل آپ کو چھوڑ کے چلی جاؤں گی واپس۔“

”بے وقوف۔ شادی پہ میں بھی انوائٹڈ ہوں۔“ خالہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

ثانیہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اب تو ہمانہ بنانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔



”کب مل رہی ہو سوٹ ہارٹ؟“ سیفی بے قرار تھا۔ رباب نے کوفت سے بھنویں اچکائیں۔ شکر ہے کہ ویڈیو

کال نہیں تھی۔ ورنہ سیفی کو اپنی ”اوقات“ ضرور بتا چل جاتی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”تم کب آئے تمہارا تو ڈیڑھ ہفتے کا (قیام) Stay تھا ابو ظہبی کا۔“

”بس۔“ وہ آہ بھر کے بولا۔

”تمہاری یاد اب کہیں ہفتہ بھر سے زیادہ نکلے ہی کہاں رہتی ہے ہنی۔ تمہارے لیے شاپنگ کی ہے۔ بہت اعلیٰ۔“ رباب کے ہونٹوں پہ خوب صورت سی مسکراہٹ کھل گئی۔

”نہ کیا کرو سیفی۔! کیوں روپیہ ضائع کرتے ہو میرے پاس چیزوں کی کمی ہے کیا۔“ وہ بن کر بولی۔
”ضائع۔؟“ سیفی گویا برا مان گیا۔

”حسن کا صدقہ نکالتا ہوں میں تو۔ محبت ہے یہ میری۔“

”ادفوہ۔ ایک تو تم ناراض بہت جلدی ہو جاتے ہو۔ اوکے آئی دل ایکسپٹ۔ (میں قبول کر لوں گی) لیکن آئندہ کے لیے احتیاط کرنا۔“

رباب نے گویا اس پر احسان دھرا۔ دوسری جانب سیفی زیر لب اسے بے آواز گالی دے کر رہ گیا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا میرا فلیٹ دیکھنے آؤ گی؟“ وہ اسے یاد دل رہا تھا۔ رباب بڑے ناز سے ہنسی۔

”کون سا میرا ہے جو میں اسے دیکھنے جاؤں۔“

”خزانہ بھرا پڑا ہے سوئس بینک میں اپنا جانم۔ منہ دکھائی میں ہلینک چیک دوں گا تمہیں۔ اور روپیہ تو اتنا ہے اپنے پاس کہ ہنی مون یہ تمہیں واقعی چاند پہ کے جاسکتا ہوں میں۔“ ادھر اگر خواہشات کی ماری۔ نفس کی غلام تھی تو دوسری طرف سیفی بھی شیطان کا آلہ کار تھا۔

وہ لڑکیوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا۔

اپنے ”بزئس“ کے دوران اس کا ہر طرح کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا۔ کچھ ایسے مراد جیسی تھیں جو ان کی قید میں رہ کر بھی عزت کا سودا نہ کرتی تھیں اور کچھ رباب احسن جیسی جو دولت کی چکا چوند سے متاثر ہو کر گھٹنے ٹیک دیتی تھیں۔

اور بہت سی ”حنا“ جیسی تھیں۔ حالات اور رغبت کی ماری۔ جن کے لیے عزت سب کچھ ہوتی ہے، مگر ایک بار عزت جانے کے بعد وہ احتجاج کرنا چھوڑ کر اس دلدل میں دھستی چلی جاتی ہیں۔ شاید قدرت سے بدلہ لینے کے لیے؟ یونہی تو ان کو خسارے میں نہیں کہا گیا تھا۔

اس کی لاف زنی۔ کوئی عقل مند لڑکی ہوتی تو پھونک پھونک کے قدم رکھتی۔ مگر رباب کی عقل تو سونے کا پانی چڑھے زیورات اور مٹکے گفٹس نے سب کر رکھی تھی۔

اس کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا۔ چہرہ شرمنا اٹھا۔

”ادو سیفی۔ یو آر ڈارلنگ۔“

وہ ستارے توڑ لانے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ چاند پہ لے جانے کا کہہ رہا تھا اور رباب کو یقین تھا کہ وہ واقعی اسے لے جاسکتا ہے۔ معیز کے ناروا رویے کا دکھ ہلکا پڑنے لگا۔

”تو پھر ڈن کرو یا ر۔ کب آرہی ہو فلیٹ دیکھنے؟“ سیفی بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔ رباب کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ کھل گئی۔ وہ سیفی جیسے ”چیک“ کو ”کیش“ کرنے کا طریقہ جانتی تھی۔



ثانیہ نے بذات خود دفن کر کے معیز سے ہزار ہا وعدے لیے تھے ایسے مراد جیسی شادی میں ساتھ لانے کے۔ اور معیز

کی کیا مجال ثانی جیسی ”زبردست“ خاتون کے ساتھ آنا کالی کر سکتا۔ مگر شاید اتنے عرصے میں تبدیلی آہی گئی تھی۔ معیز کو ایسہا کے لیے اب نفرت نہیں محض کوفت کا احساس ہوتا تھا۔ جو کہ ابھی بھی ہوا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ثانیہ نے ایسہا کے ساتھ اچھا خاصا بہنایا گانٹھ رکھا ہے۔

عون سے شکایت کی تو اس کا جلا گٹا انداز۔
 ”تمہیں تو بس زبردستی ایسہا کو ساتھ لانے کو کہہ رہی ہے، میرے ساتھ تو زبردستی شادی کر رہی ہے وہ۔ اور میں بے چارہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

معیز ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا کہ دنیا میں بڑے بڑے دکھی بھرے بڑے ہیں۔
 کھانے کے بعد سفینہ سونے کے لیے چلی گئیں۔ زارا اور ایرازہ بچوں کی طرح جلی وی کے ریموٹ کے لیے لاؤنج میں جھگڑ رہے تھے۔ عمر اور معیز لان میں پہلنے نکل آئے۔ کچھ عمر کی طبیعت صاف کرنے کا بھی ارادہ تھا، مگر نہ معیز نے پچھلی دوستی کو تو اس بار ذرا بھی ملحوظ خاطر نہ رکھا تھا۔

”موسم کالی گرم ہو گیا ہے اب تو۔“ عمر بولا۔
 ”خیر۔ شامیں ٹھنڈی ہیں ابھی۔“ معیز نے اختلاف کیا۔ ”جواباً“ وہ ایک لمبی سی ”ہوں“ کر کے چپ ہو گیا۔
 ”تم ایسہا سے کیا بلکواس کرتے رہے ہو۔ غریب بہن اور شادی کے مسائل وغیرہ۔“
 معیز نے حساب صاف کر لینا مناسب سمجھا۔

”وہ۔“ عمر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔
 ”وہ تو بس ایک جوک تھا۔ مگر یار۔ اس ویری اسٹریج (یہ بہت حیرت انگیز ہے) آج کل کے دور میں اتنی سیدھی ساوی لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ تمہاری محترمہ اپنی طرز کا آخری پیس رہ گئی ہیں بس۔“
 وہ متاثر ہونے والے انداز میں بولا تو معیز نے بے رخی سے اسے جھڑک دیا۔

”اب اپنی فضول حرکتوں کی پٹاری بند ہی رکھنا۔ وہ دوسری لڑکیوں جیسی نہیں ہے۔“
 ”شکی کی پری ہے وہ۔ ایک منٹ نہیں لگا اسے پانچ ہزار نکال کے مجھے تھمانے میں۔“
 عمر مسکرایا۔ معیز نے چاند کی روشنی میں اس کی مسکراہٹ کو کھوج کر جیسے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی

خفیف سے شانے اچکا کر بولا۔
 ”میں ہمیشہ اپنا ایکسٹ مو بائل پہلے والے سے بہتر لیتا ہوں۔ ہم میں سے ہر کوئی ایسے ہی کرتا ہے۔ ہمارا اگلا قدم پہلے سے مضبوط ہوتا ہے۔“

وہ عجیب سی باتیں کر رہا تھا، معیز نے نہ سمجھنے والے انداز میں عمر کو دیکھا۔
 وہ سنجیدہ تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ جسے تم ایسہا پر فوقیت دے رہے ہو، وہ ایسہا سے بڑھ کے خوبیوں سے مالا مال ہوگی۔ اتنی ہی انوسینٹ (معصوم) اور باکروار۔“ معیز کا ذہن سنسناتا تھا۔
 وہ کس پس منظر میں یہ باتیں اسے سنا رہا تھا؟ یقیناً سفینہ بیگم اسے رباب میں معیز کی دلچسپی کے متعلق بتا چکی

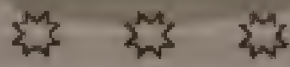
ہوں گی۔
 ”میں اپنی زندگی کی ترجیحات اچھی طرح جانتا ہوں اور اس کے لیے مجھے کسی سے ڈکٹیشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ معیز کا لہجہ سرد تھا۔
 ”تم عون کی شادی میں شریک ہونے جا رہے ہو؟“ لمحہ بھرا سے دیکھتے رہنے کے بعد یکایک ہی ہلکا سا مسکرا کر عمر

نے ٹاپک ہی تبدیل کر دیا۔
وہ ایسا ہی تھا ہمیشہ سے لہجوں کی زبان سمجھنے والا۔ کوئی بات دل پہ لیتا ہی نہیں تھا۔ معیز نے بھی گہری سانس بھر کے خود کو قدرے معتدل کیا۔ اور اثبات میں سر ہلایا۔
”ہوں۔“

پھر کچھ سوچ کر معیز نے اسے گھور کے دیکھا۔
”ایک بات تو بتاؤ۔ ماما نے تمہیں یہ رشتہ ختم کرنے کے لیے بلوایا ہے یا پکا کروانے کے لیے؟“
”مجھے وہ لڑکی بہت مظلوم لگی ہے معیز! زمانے اور حالات کی ستانی ہوئی۔“
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد عمر سنجیدگی سے بولا۔
اس کا قطعاً ارادہ نہیں تھا معیز کو یہ بتانے کا کہ وہ ایسہا کے حالات زندگی کی اصل رپورٹ عون عباس سے حاصل کر چکا ہے۔

معیز اسے یونہی تیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ تو عمر صفائی پیش کرنے والے انداز میں دوبارہ بولا۔
”جب پھوپھو نے مجھے بتایا کہ اس طرح تم کسی لڑکی کے چنگل میں پھنس گئے، مجھے لگا شاید کوئی غلط قسم کی لڑکی ہوگی۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک خاندانی لڑکی ہے۔ انکل کا اس سے ہٹ کے ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ تب ہی انہوں نے اپنا سب سے عزیز بیٹا اس کے حوالے کر دیا۔“
معیز کو یاد آیا۔ امتیاز احمد کو معیز کے ساتھ ایسہا کے نکاح والے فیصلے پر بہت اطمینان تھا۔
”کبھی اس سے ملو گے تو میرے فیصلے کو بہترین بناؤ گے۔“ وہ کہا کرتے تھے۔
”وہ ایک پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی ہے۔ کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں جس کی بنا پر تم اسے چھوڑنا چاہتے ہو؟“ عمر محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔

معیز نے خالی الذہن کیفیت میں اسے دیکھا۔
وہ خوب صورت نہیں۔؟ بہت خوبصورت تھی۔ معیز نے پل بھر کو سوچنا چاہا۔
واقعی۔ سفینہ بیگم کے دباؤ کے علاوہ اور کیا وجہ تھی ایسہا سے جان چھڑانے کی؟ اس نے دل کو ٹٹولا۔
کیا میں اس سے اس لیے نفرت کرتا ہوں کہ وہ صالحہ کی بیٹی ہے؟ وہ صالحہ جو میری ماں کی زندگی کی خوشیوں کی قاتل ہے؟ وہ دنگ رہ گیا۔
اس نے اپنے دل کو ایسہا کی نفرت سے خالی پایا تھا اسے خود سے الجھتا چھوڑ کر عمر خاموشی سے اندر چلا گیا۔



”سفیر کی واپسی کی خوش خبری سنی ہے میں نے۔“ ناشتے کی میز پر سفینہ نے گویا دھماکا ہی کر دیا۔ بہت سرخوشی کا ساعالم تھا ان کے لہجے میں۔
معیز کو بھی خوشی ہوئی جبکہ عمر اور ایراز نے خواجواہ کھانس کھانس کے زارا کو نروس کر دیا۔
”یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔“ معیز مسکرایا۔

”وہ لوگ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔“ سفینہ مسکرائیں۔
”ہاں۔“ عمر نے حسرت سے آہ بھری۔ زارا کو مارے شرم کے وہاں سے بھاگنا ہی پڑا۔
”ناشتا کر لو۔ ہم اس کے کمرے میں بھی جائیں گے تنگ کرنے۔“ عمر نے ایراز کو جیسے تسلی دی۔

"ہوں۔" سفینہ بیگم کے چہرے پر فلمی انیت بھری مسکراہٹ تھی۔

”بہت عرصے بعد گھر میں خوشی کا موقع آ رہا ہے۔“

”تو لگے ہاتھوں کچھ اور خوشیاں بھی مناؤ ایسے۔“ ایراز نے دبے لفظوں اپنی طرف اشارہ کیا۔ سفینہ یکدم اس کی بات اچھے سے سمجھیں مگر اطمینان سے بولیں۔

”ہاں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ زارا کے ساتھ معین کو بھی نمشا دوں۔ سفیر کو اچھا لگے گا اگر ہم رباب کے لیے یروپوزل دیں گے۔“

آرازنے بے اختیار معین کا چہرہ دیکھا جہاں تاثرات فوراً "تبدیل ہوئے تھے۔
(افسردہ کشتیوں کا سوار)۔

اے ازل دل ہی دل میں کڑھایا۔

”نی الحال تو آپ زارا کو دیکھیں ماما۔ اتنے اہم موقع پر میں کسی بھی قسم کا کوئی ایسا نہیں چاہتا۔“

معین نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے چائے کا خالی کپ ساسر میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کوئی ایٹو نہیں ہو گا معزز۔! ایٹو تو تب بنے گا جب سفیر کو پتا چلے گا کہ اس لڑکی کا تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے۔“ سفینہ بیگم کا لبو لہجہ بہت ٹھنڈا تھا مگر معزز کا تو تن بدن ہی سلگ گیا۔

”میرے خیال میں آپ فی الحال زارا کی شادی پر ہی فوکس رکھیں۔ میں جب فارغ ہوں گا تو آپ کو بتا دوں گا۔“

وہ اللہ حافظ کہتا آفس کے لیے نکل گیا۔ اور پیچھے تڑپتے تڑپتے وہ حسرت زدہ دل رہ گئے۔
اراز احمد اور عمر۔

”آپ کیا ادا ہے بھائی کی۔ اور جو پہلے سے فارغ بیٹھے ہیں انہیں کوئی پوچھ نہیں رہا۔“

”قاسم غ۔ بلکہ دہلے تھے۔“

لقمہ عمر کا تھا۔ پھر ساتھ ہی تڑکے کے طور پر اضافہ بھی کیا گیا۔

”تنی ترسا ترسا کے اگر میری شادی کی گئی تو میں اکٹھی دوہی کروں گا۔“ یہ عمر کا مصمم ارادہ تھا۔ سفینہ کو ہنسی

”تمنہ۔ بتاتی ہوں میں بھائی صاحب کو۔“ انہوں نے دھمکایا۔

”بھائی صاحب کیوں بھابھی صاحبہ کو ڈائریکٹ کال ملائیں، جو میرے سوبر اور سیریس ہونے تک میری شادی کو حکم دے۔“

عمر نے تڑپ کر کہا۔ ارا نے مسکراہٹ دیائی اور بظاہر بڑی ہمدردی سے بولا۔
 ”یعنی بھرتہ کبھی آپ کا شادی نہیں ہو سکتا۔“

”اف۔ یعنی پھر تو کبھی آپ کی شادی نہیں ہو سکتی۔ چہ چہ۔“

عمر نے خالی گلاس اٹھا کر اسے دھمکایا تو ایراز اور سفینہ بیگم ہنسنے لگے۔

وہ آفس کے لیے نکلا تو الجھن کا شکار تھا۔ ان دنوں کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی دل پہ۔
وہ ریاب کے لیے سنجیدہ تھا۔ مگر اس کے رنگ ڈھنگ کہتا تو وہ بیوی والے سانچے میں پوری نہ آتی تھی۔

گزشتہ لڑائی کے بعد تو دونوں میں سے کسی نے بھی ابھی تک صلح کا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔
وہ گاڑی باہر نکال رہا تھا جب اس نے ایسہا کو گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھامے
دوسرے سے اپنا پرس چیک کرتی۔ مصروف سا انداز۔

معین نے گاڑی اس کے قریب لا کر زور سے ہارن بجایا تو وہ بدک کر ایک طرف ہوئی۔ پھر معین کو دیکھا تو اس
کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔

”تم کہاں جا رہی ہو۔ وہ بھی اکیلی؟“ ایسہا ہچکچا کر کھڑکی کے پاس آئی۔
”مجھے اپنا جو تائبديل کرانا تھا۔ ثانیہ تو واپس جا چکی ہیں اس لیے اکیلے ہی جانا پڑا۔“
اس نے تفصیل بتائی تو معین نے اسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جھک کر فرنٹ ڈور ان لاک کرنے لگا۔
وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔
”کہاں سے لیا تھا جو تائبديل؟“

معین نے پوچھا تو ایسہا نے مشہور برانڈ کا نام بتایا اور ساتھ ہی شاپنگ بیگ بھی دکھایا جس پہ اس برانڈ کا نام
جگمگا رہا تھا۔

”تو چیک کر کے لیتیں۔ زہر لگتا ہے مجھے لڑکیوں کا یوں اکیلے بازاروں میں گھومنا۔“ وہ ناگواری سے بولا۔
”میں گھومنے نہیں جا رہی تھی۔“ وہ بے اختیار ہی اسے ٹوک گئی۔ معین نے اس کی طرف دیکھا تو وہ حواس
باختہ سی ہوئی۔

”میرا مطلب ہے کہ میں تو ضروری کام سے جا رہی تھی۔“
”اکیلی۔“ معین نے پھر حتمی والے انداز میں کہا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔ ”جو اکیلا ہو وہ اکیلے ہی جاتا ہے۔“
”اف۔“ معین سلگا۔ ”ڈیم اٹ۔ یہاں تو سب ہی پسلیاں بکھوانے والے۔ طنز کے تیر چلانے والے ہیں۔“
”دنیا میں رہنے کے لیے دنیا میں رہنے کے آداب بھی آنے چاہئیں انسان کو۔“
وہ پتا نہیں کیوں غصے میں تھا۔ ایسہا نے ذرا سا چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ بے حد الجھا ہوا۔ اور دوسرے کو الجھا
دینے والے موڈ میں تھا وہ۔

”اسی لیے تو اکیلی جا رہی تھی۔“
بات گوزرا سی تھی مگر معین کو ٹھنڈا کر گئی۔

وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ شاپ پہ جا کے ایسہا نے جوتے کا نمبر تبدیل کرایا۔
بڑے سے شاپنگ مال میں ساری دکانیں ہی برانڈڈ اشیا کی تھیں۔

”سنو۔“ وہ باہر کی جانب چل رہی تھی۔ جب معین نے اسے آواز دی، مگر شاید وہ اپنے دھیان میں تھی۔
چونکی تو تب جب اس کا ہاتھ ایک ملائم سی گرفت میں آگیا۔ اس نے کرنٹ کھا کر دیکھا۔ وہ قدرے جھنجھلایا ہوا تھا۔
”آواز دے رہا ہوں تمہیں اور تم منہ اٹھائے چلی جا رہی ہو۔“ ایسہا نے غیر محسوس کن انداز میں اپنا ہاتھ
اس کے ہاتھ سے نکال کر خواہ مخواہ ہی ماتھے پہ دوپٹا ٹھیک کیا۔

”جی۔“

”ثانیہ کی شادی ہے۔ شاپنگ کرلو۔ تمہیں ساتھ نہ لے کے گیا تو شاید میرے لیے بھی نواہنٹری کا بورڈ لگ
جائے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

ثانیہ کے حوالے پر ایسہا کا دل اسی مان سے بھرا جیسے لڑکیوں کا اپنے میکے کے کسی رشتے کے مان سے بھرتا ہے۔

ٹائیپ اسے معیز پر ترجیح دیتی تھی۔ یہ سوچ ہی اس کا خون برہا گئی۔
 معیز نے اس کے چہرے پر پھیلتی دلفریب سی تمنا ہٹو دیکھی۔
 ”شاپنگ تو مجھے ساری کروادی تھی ٹائیپ نے۔“ معیز کو اپنے کندھوں سے کوئی بوجھ ہٹا ہوا محسوس ہوا۔
 ”ڈش گنڈ۔“ وہ ریلیکس سا اسے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اگلی شاپ سے نکلتے ہوئے کوئی معیز سے
 ٹکرایا۔

”اوہ۔ سوری۔“ وہ گڑبڑایا۔ پھر خوش گواری حیرت کا شکار ہوا۔
 ”رباب۔“ مگر رباب کی حیکمی اور تلخ نگاہ ایسا پرکڑی تھی۔ جو کچھ خائف سی ہونے لگی تھی۔
 ”شاپنگ کرنے آئی ہو۔؟“

معیز نے قصداً ”اس کے حلیے کو نظر انداز کیا۔ بنا دوپٹے کے بغیر آستین کی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس وہ
 دعوتِ نظارہ دیتی محسوس ہو رہی تھی۔

”سوری۔ پھر بات ہوگی۔ میں اس وقت کسی کے ساتھ شاپنگ میں بڑی ہوں۔“
 وہ بڑی نخوت سے کہتی، ٹک ٹک کرتی اگلی شاپ میں گھس گئی۔ معیز کئی لمحوں تک یونہی کھڑا رہ گیا اور ایسا
 کا دل تو اوپچی نیچی لہروں میں گویا ہچکولے کھا رہا تھا۔

وہ جانتی تھی رباب اور معیز کے تعلق کو۔ اسے محسوس ہو گیا تھا۔
 ”بچلو۔“ اس نے بت بنی کھڑی ایسا کو اشارہ کیا تو وہ ہڑبڑا کر بے دار ہوئی۔ بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے معیز
 نے سرسری سی نگاہ ایسا پر ڈالی۔

پوری آستینیں اور نقیس سا دھڑا بہت سلقے سے اوڑھے وہ اپنی زینت کو ڈھانے ہوئے تھی۔ ایک کھل
 عورت اس کے ذہن میں عمر کے کل رات کے کبے جملے چکرانے لگے۔ کھلے عام رباب کے اس حلیے نے معیز کا
 دل پھر سے مکدر کیا تھا اور وہ اس معاملے پر رباب سے بحث کرنے کا پورا ارادہ رکھتا تھا۔
 ایسا کو گھر کے سامنے اتارا۔

”بہت شکریہ۔“ وہ مشکرانہ کہہ کر گاڑی سے اتری اور آگے بڑھ کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ معیز نے
 سائیڈ مرر میں دیکھا۔ اس کا خود کو سمیٹ کر چلنے کا انداز اور دوپٹے سے ڈھکا وجود وہ خود سمجھ نہیں پایا کہ ذہن میں کیا
 چل رہا ہے۔



”آ رہی ہونا پھر مجھے ایرپورٹ پہ ریسیو کرنے۔“ سفیر کی زندگی سے بھرپور آواز گونجی تو کان سے موبائل لگائے
 زار ا بے اختیار ہنس دی۔

”بہت اچھا لگے گانا دلہن خود دو لہا کو ریسیو کرنے آئی ہے۔“ سفیر کو بہت اچھا لگا۔
 ”آہا۔ میری دلہن۔!“ اس نے گویا مرثیت کرنا چاہی۔ زار ایک تخت ہی جھینپ سی گئی۔ سفیر کو اس کی پر حجاب
 سی خاموشی نے مزادیا۔

”بلکہ میں تو چاہتا ہوں مجھے ریسیو کرنے فقط تم ہی آؤ۔ کیوں کہ گھر میں سب کے سامنے تو تم ملو گی نہیں۔“ اسے
 چھیڑا۔

”تو پبلک میں کیا ہم ڈسٹ (دو گانا) گا کر ملیں گے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

پھر دونوں ہنسنے لگے۔ مسلسل ٹیلیفونک رابطے کی وجہ سے دونوں کی کیمسٹری خوب ملنے لگی تھی۔ سفیر میں اچھے شوہروں والی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ بچن میں سب سے پہلی خوبی ان کا آپس میں دوستی کا رشتہ تھا۔
 ”تم سامنے آؤ تو سہی۔ ملنے کا طریقہ خود بخود آجائے گا۔“ سفیر نے لطیف سی شرارت کی ”تو وہ حجاب آلود انداز میں مدھم سا ہنس دی۔ پلوں پہ جیسے کسی نے منوں بوجھ لا دیا ہو اور سامنے۔ سامنے سفیر احسن بیٹھا اسے تک رہا ہو۔“

اس کی وارفتی اس کی بے تابی دل میں اتر رہی تھی اور اس کی میٹھی باتیں زار کی سماعتوں میں رس گھول رہی تھیں۔ وہ لبوں پہ نرم سی مسکراہٹ لیے اس کی باتیں سنتی کبھی بے ساختہ بول اٹھتی اور کبھی کھٹکناٹی ہنسی بکھیر رہی تھی۔



”تم سیفی سے پیچھا چھڑا کیوں نہیں لیتیں رباب۔ مجھے تو کچھ خاص اچھا آدمی نہیں لگا۔“ اس کی دوست علیشہ نے ناگواری سے کہا۔ بہت دنوں کے بعد آج رباب کو کسی دوست کے ساتھ چائے پینے کا موقع ملا تھا اور بیٹھتے ہی یہ فرمائش۔

رباب ٹھٹکی۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔
 ”اچھا تو ہے۔“

”اچھا؟“ علیشہ نے تمسخرانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو نہیں لگا۔“
 ”کیوں۔ اچھوں کے سروں پہ سینگ ہوتے ہیں؟ یا ماتھے پہ تین آنکھیں۔“ رباب نے پیشانی پہ ایک بل ڈال لیا تھا۔

”کم آن رباب سنسیری (خلوص سے) تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ اچھا بھلا ہے معیز احمد۔ کیوں تباہی کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔“

علیشہ خاصی منہ پھٹ تھی۔ صاف منہ بہ بات کہنے والی۔
 ”اس سے پہلے بھی ٹاسک کرتی رہی ہو، مگر وہ جسٹ فار انجوائے منٹ (محض تفریح) تھے۔ کلج لائف ختم ہو گئی تو یہ سب چکر بھی ختم ہو جانے چاہئیں ڈر۔“

”شٹ اپ۔ بور کر رہی ہو تم مجھے۔“ رباب کو اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔
 ”تم ہی سب نے مجھے سیفی کے پیچھے لگایا تھا۔ اب جب میں اس کی دوستی سے مطمئن ہوں تو تمہارا کیا مسئلہ ہے۔“

”میرا مسئلہ یہ ہے کہ تم میری اچھی دوست ہو۔ اور میں فیوچر میں تمہیں معیز احمد جیسے اچھے شخص کے ساتھ دیکھنا پسند کروں گی۔“

وہ صاف گوئی سے بولی۔ رباب نے تیز نظروں سے چند لمحوں تک اسے گھورا اور پھر تلخی سے بولی۔
 ”اور معیز احمد وہ ”اچھا“ شخص آج کل بغل میں ایسا مراد کو لے کے گھوم رہا ہے۔“ علیشہ نے چونک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”وہ کہاں سے آگئی؟“
 ”کہیں سے بھی آئی ہو واٹ ایور، لیکن اس پردے کی بوہو کی وجہ سے اب وہ میری ڈر سینگ اور لبرٹی (آزادی) کے طعنے دینے لگا ہے مجھے۔“

علیشبہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔ جو خود کنوئیں میں گرنا چاہے اسے کون روکے؟
 ”تم نہ کھنا معیز نے میرا دل توڑا ہے نا۔ اب میں کس کس کا دل توڑتی ہوں۔“
 رباب کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور لبوں پر اسرار سی مسکراہٹ تھی۔
 علیشبہ کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے شاپنگ بیگزا کٹھے کرنے لگی۔ جبکہ سیفی کے متعلق علیشبہ کے شک کے اظہار کو رباب نے علیشبہ کی جیلسی قرار دیا۔
 وہ بے وقوف تھا جو رباب پہ لاکھوں وار تاجارہا تھا؟ رباب دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پہ مسرور تھی۔ اور ایسے لوگوں کے پاس کھڑی قسمت اکثر ہاتھ مل رہی ہوتی ہے۔



”ماما! آپ بھی چلیں نا۔ عون نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔“ معیز اپنی پیکنگ زار اسے کروا چکا تھا۔ آج سہ پہر وہ عون کی سسرال جانے والے تھے۔ رات کو مایوں ہندی کا فنکشن رکھا گیا تھا۔
 سفینہ مسکرا دیں۔

”ولہمے میں شریک ہو جاؤں گی بیٹا! وہ لوگ یوں بھی وہاں رات رکنے والے ہیں۔ اتنا لشکر کہاں سنبھالیں گے لڑکی والے۔“

بات ان کی صحیح تھی۔ عون کے ابا نے بہت قریبی رشتہ داروں کو انوائٹ کیا تھا۔ دوستوں میں محض معیز تھا اور ایسہا کے ساتھ جانے کی تو معیز نے سفینہ بیگم کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ ورنہ تو قیامت ہی آجاتی گھر میں۔

ایسہا اپنا بیگ لے کر گھر سے باہر نکلی وہیں سے معیز نے اسے پک کر لیا۔
 اس سے پہلے بھی وہ معیز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی ڈری سہمی۔ دروازے سے لگی۔
 مگر آج اس کا عجیب سا چمکتا ہوا انداز تھا۔ سرخوشی لیے۔ سیاہ آنکھوں کی چمک تھمتاتے چہرے کے ساتھ بڑا ماورائی سا تاثر دے رہی تھی۔ فیروزی بکھر کے پرنٹڈ لباس میں وہ بالکل سادہ تھی مگر یوں دمک رہی تھی جیسے راستہ دکھانے والا ستارہ۔

معیز کو اس سے اچھی تشبیہ نہ سوجھی تھی۔
 ”اف۔“ ہاتھوں کو مسلاتی وہ خود ہی بے اختیار بول اٹھی۔ ”کتنا مزہ آئے گا نا۔ میں نے کبھی کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی۔“

معیز نے گہری سانس بھری۔ اس کے وجود پہ چھائی سرشاری کا معمہ حل ہو گیا تھا۔
 ”ہوں۔“ معیز نے سر ہلایا۔

”آپ تو بہت سی شادیوں میں گئے ہوں گے نا۔“ وہ باقاعدہ اس کی طرف رخ موڑ کے بیٹھ گئی تھی۔
 ”ظاہر ہے۔ دنیا میں آئے ہیں تو دنیا داری میں شریک بھی ہونا پڑتا ہے۔“

معیز کا اسے بہت نرمی دکھانے یا لفٹ دینے کا کوئی موڈ نہیں تھا بلکہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی احتراز ہی برت رہا تھا کیوں؟ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

”پتا ہے وہاں ہمارے محلے میں کبھی کسی نے امی کو اوپر مجھے بلایا ہی نہیں کسی شادی میں۔“ وہ ادا سی ہو گئی۔
 ”ابا کی وجہ سے۔۔۔ صرف زرینہ خالہ سے امی کی دوستی تھی اور بس۔“ معیز عجیب سے احساس میں گھرنے لگا۔
 دفعتا وہ پھر سے ذرا پر جوش ہوئی۔

”اور آپ کو پتا ہے میں نے شادی کا کارڈ بھی دیکھا ہے۔ ثانیہ خود مجھے دینے آئی تھیں۔ مہندی کا الگ سے، بارات اور ولیمے کا الگ۔ اتنی چمک اور ملائمت ہے اس میں۔ میں نے تو اسے سنبھال کے رکھ لیا ہے۔“

”فریم کراؤ کی کیا ہے؟“ معیز نے اس عجیب سے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”ایک ہی تو کارڈ ہے میرے پاس اور آپ نے دیکھا نہیں، مہندی کے کارڈ پہ ثانیہ کی فرینڈز میں سب سے پہلا نام میرا ہے۔“

اس کے انداز میں تفاخر تھا۔ معیز کو افسوس ہوا۔ اس نے واقعی نہیں دیکھا تھا۔

”مجھے دراصل عون کی طرف سے کارڈ آیا ہے تو اس میں ایسا کچھ نہیں تھا۔“ معیز نے بتایا۔

”اچھا۔۔۔ ان کا کارڈ علیحدہ تھا۔ مطلب کہ ایک شادی کے دو کارڈز۔؟“

ایسہا بے چاری کی سادگی کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ معیز کے ہونٹوں پہ بے اختیارانہ مسکراہٹ آئی۔

”لڑکی والے اپنے مہمانوں کے لیے کارڈز چھپواتے ہیں اور لڑکے والے اپنے مہمانوں کے لیے۔“

”اچھا۔۔۔“

معیز نے اس خواب ناک سے ”اچھا“ پر بے اختیار ہی اسے دیکھا تو ادھر حیرت کا ایک انوکھا ہی انداز تھا۔ حیرانی سے پھیلی سیاہ پلکوں کی باڑ سے جی آنکھیں اور نیم والب۔ جیسے خلا میں ان دیکھا منظر دیکھ رہی ہو۔

معیز کے یوں اچانک دیکھنے پر وہ سٹپا کر سیدھی ہو بیٹھی، مگر یوں سٹپا نے اور جھینپ کر سیدھے ہونے کے دوران جو رنگ اس کے چہرے پر پھیلے انہوں نے معیز کو متحیر کر دیا۔

وہ لڑکی اس کے نکاح میں تھی اور چلو آپسی تعلقات جیسے بھی ہوں مگر اس کا اپنے شوہر سے یوں جھجکنا شرماتا۔ معیز کے لیے بہت انوکھا تھا۔

لڑکیاں تو اجنبیوں سے بھی یوں نہیں شرماتیں۔

معیز کو بے ساختہ رباب کے انداز یاد آئے۔



حسب توقع عون منہ پھلائے ہوئے تھا۔ ایسہا اور معیز سیدھے ان ہی کی طرف پہنچے وہاں سے پھر قافلہ سیدنگر کی طرف نکلتا۔ عون کی امی اور بھابھی بڑے پتاک سے ملیں۔

”یہ بھابھی ہیں۔“

ایسہا کا عون نے سیدھا سادہ تعارف دیا تو معیز بس دانت پیس کر رہ گیا۔

”ویسے یار معیز! قسم سے کیا کمال کی جوڑی بنی ہے تم دونوں کی۔“ عون نے دل سے کہا تھا، مگر پھر معیز کی تیوری کے بل دیکھ کے دھیمہ پاڑا۔

”یونہی۔ اپنا خیال ظاہر کر رہا ہوں۔“

”تم اپنے خیالات اپنی ”نصف بہتر“ کے لیے سنبھال کر رکھو۔“ معیز نے اسے یاد دلایا تو وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

اچھا لباس اور اچھا ”ساتھ“ انسان کو کس قدر پر اعتماد بنا دیتا ہے۔ یہ ایسہا نے اس دن جانا۔ وہ بہترین لباس میں ملبوس تھی اور وہاں اس کا تعارف معیز کی بیوی کے طور پر ہوا تھا۔ اسی وجہ سے عون کی امی اور بھابھی نے اس سے کسی معزز مہمان کی طرح رویہ رکھا تھا۔ ایسہا کے اعتماد کا گراف قدرتی طور پر بڑھا۔

اسے اپنی بیس سالہ زندگی میں ایسی قدر دانی کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

”بڑے خوش ہو۔“ معیز نے عون کے تمقنوں پر چوٹ کی۔
 ”طوفان سے پہلے کی علامات ہیں ساری اور یوں تبھی زندگی میں ایک بار شادی ہونی ہے۔ ایک ہی مودی میں کام کا موقع ملنا ہے وہ تو اچھی ہے۔“

اس نے تفصیل سے جواب دیا تو معیز کو ہنسی آگئی۔ عون کی فیملی اپنی گاڑی میں تھی۔ ایسہا اور معیز کی گاڑی ان کے پیچھے اور پھر مہمانوں کی ہائی ایس نکلی۔

”تم تیار نہیں ہو میں۔؟“ معیز کو راستے میں دھیان آیا۔

”مجھے تو تیار ہونا ہی نہیں آتا۔ ٹانیہ نے کہا تھا وہاں آجاؤں تو وہ خود کریں گی۔“

وہ سادگی سے کہتی معیز کو چپ کروا گئی۔ باقی کا سفر ایسہا نے بڑے اشتیاق سے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اور معیز نے جانے کس چپ کے حصار میں گزارا۔

ان کا قافلہ سیدھا حوٹلی پہنچا تو وہاں ان کا ریتاک استقبال ہوا۔ ایسہا کو بہت اچھا لگا۔ ساری خواتین مہمان خواتین سے گلے مل رہی تھیں۔ بناو واقفیت کے کئی ایک نے ایسہا کو بھی گلے سے لگا کر استقبال کیا تو خوا خواہ ہی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

بھابھی نے ایسہا کو تیار کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ تو ایسہا نے فوراً ”ٹانیہ کو کال ملا کر ساری تفصیل بتائی۔
 وہ ایسہا کے جوش اور خوشی پر ہنستی رہی۔



”بانشاء اللہ۔“ وہ کپڑے تبدیل کر کے تیار ہونے بھابھی کے پاس آئی تو اسے دیکھتے ہی جس طرح بھابھی نے اسے
 توصیفی انداز میں کہا ایسہا تو کانوں تک لال پڑ گئی۔

”وہ۔ میں تیار ہونے آئی تھی۔“ وہ نموس سی ہو کر انہیں یاد دلانے لگی۔

”تیار تو ہمیں ہونا پڑتا ہے ڈیر تمہیں تو اوپر ہی سے اتنا سنوار نکھار کے بھیجا گیا ہے۔“ بھابھی اسے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ گھبراہٹ میں آدھی بات سمجھی اور آدمی نہیں۔

”تو پھر۔ میں تیار نہ ہوں؟“

بھابھی نے اپنا مشہور زمانہ قہقہہ لگایا۔ بچوں کو دادی کے پاس بھجوا کر وہ اطمینان سے ایسہا کو تیار کرنے لگیں۔

ہلکا سا میک اپ۔ اور وہ یوں نکھری کہ بقول بھابھی آج کا فنکشن تو تمہیں ”لٹ“ لوگی معیز تو بے ہوش ہو ہی جائے گا۔ وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتی اپنے کمرے کی طرف بھاگی جہاں اس کا سامان رکھا تھا۔ بیگ میں سے میچنگ جوتی نکال کے موڑھے پہ بیٹھی وہ جھک کر اسٹریپ بند کر رہی تھی۔ سیاہ بال شانے سے پھسل کر آگے کو بکھر گئے۔

واش روم کا دروازہ حریف سی کلک کی آواز سے کھلا۔ اپنے کام میں مصروف ایسہا نے یونہی سرسری سی نگاہ اٹھا کے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔

معیز سفید شلوار اور بنیان میں ملبوس بالوں کو تیلے سے رگڑتا واش روم سے باہر نکلا تھا۔ ایسہا قدرے سائیڈ پر تھی اس لیے ابھی معیز کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مگن تیزی سے بال خشک کر رہا تھا۔

تھوک نکل کر حلق تر کرتے ایسہا نے جلدی سے اپنی توجہ پیروں کی طرف کر لی اور دو سری سینڈل پہننے لگی۔

وہ چوڑیوں کی حریف سی جلت رنگ تھی جس نے آئینے کے سامنے کھڑے معیز احمد کو پورے کا پورا مڑنے

پر مجبور کر دیا۔

سینڈل کا اسٹریپ بند کرتے ایسہا کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ معیز حیران و پریشان۔ یہ کون محترمہ کمرے میں گھس آئیں۔ جلدی سے لپک کر بیڈ پر پڑی گئیں اٹھا کر بدن پر چڑھائی۔

”اے سکھوڑی۔“ معیز ان ”محترمہ“ کو متوجہ کر کے بتانا چاہتا تھا کہ یہ کمرہ معیز کو الاٹ کیا گیا ہے۔

تب ہی وہ سینڈل کا پیچھا چھوڑ کر مجبوراً ”سیدھی ہوئی تو معیز کی آنکھیں لمحہ بھر کو تو چند حیا ہی گئیں۔

ایک خوب صورتی چہرے کی ہوتی ہے۔ محض چہرے کی اور اصل خوب صورتی جو چہرے کی خوب صورتی کو نکھارتی ہے وہ کردار کی خوب صورتی ہے۔ انسان کی معصومیت اس کی سادگی۔ سب اس کے چہرے سے جھلکتا ہے۔

ایسہا اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ پھرتی سے واپس آئینے کی طرف پلٹ گیا۔ اب ایسا بھی کیا مبہوت ہو کر بت بن جاتا۔

”اوہ۔ تم ہو۔ میں سمجھا پتا نہیں کون کمرے میں گھس آئیں محترمہ۔“

وہ فوراً ہی خود کو سنبھال گیا تھا۔ ایسہا نے بھی اس کی توجہ دوسری طرف محسوس کر کے سکھ کا سانس لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے تبدیل شدہ کپڑے تہہ کر کے رکھنے لگی۔

معیز کے کپڑے واش روم سے نکال کے سنبھالے اور اب وہ وہیں بیڈ کے کنارے نکی معیز کے تیار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

اس کا دل عجیب سی خوشی کی لپیٹ میں تھا۔ دل چاہ رہا تھا ”اڑ کے ثانیہ کے پاس پہنچ جائے۔ وہی تو تھی جس کی وجہ سے آج وہ بھی عام انسانوں کی طرح ”دنیا داری“ کو ”برتنے“ کے قابل ہوئی تھی۔

وہ یونہی بال برش کرتے معیز کو دیکھے گئی۔ سفید شلوار کے ساتھ ”جنید جمشید“ کرتا۔ گرین اور براؤن لاکنگ سے مزین تھا۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خود پر بے دریغ پرفیوم چھڑک رہا تھا۔ ایسہا کی مشام جان معطر ہو گئی۔ اس نے گہری سانس اندر کھینچ کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

اسے یاد آیا۔ یہ خوشبو معیز احمد کے ملبوس میں سے پھوٹی تھی۔ جب وہ اسے یاد تھا۔ کب کب وہ اس کے اتنے قریب آیا تھا کہ وہ اس خوشبو کو محسوس کر سکتی۔

معیز نے آئینے میں دیکھتے ہوئے ایسہا کی نگاہ کے ارتکاز کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر آخری جائزہ لیتا وہ اس کی طرف پلٹا تو اس نے جلدی سے سر جھکا لیا۔

معیز کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”جلدی سے اٹھ جاؤ۔ عون مجھے کوس رہا ہوگا۔“ اس کی نزدیکی کو ختم کرنے کی خاطر معیز اس کی طرف کم ہی توجہ کر رہا تھا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا تو ایسہا کا معصوم سادل او اس ہو گیا۔ بھا بھی اس کی اتنی تعریفیں کر رہی تھیں اور معیز نے ایک نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔ بے ہوش ہونا تو دور کی بات تھی۔

وہ مجھے مجھے انداز میں معیز کی تقلید میں باہر نکل گئی۔



باہر رنگ و نور کی الگ ہی دنیا تھی۔

ایسہا تو حیران و پریشان ہی رہ گئی۔ مہندی کی جی ہوئی تھالیوں میں جلتی موم بتیاں، ڈھول کی تھاپ اور رنگ و بو

کی دنیا۔ بھابھی نے اس کے ہاتھ میں بھی مہندی سے بھی تھالی تھما دی۔
 ثانیہ کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ سب مہندی کے گانے گاتی اور لڑکے ڈھول کی تھاپ پہ بھنگڑے ڈالتے
 لڑکی والوں کے گھر پہنچے۔

ایسہا تو معیذ جیسے سنجیدہ (سٹرل) مزاج بندے کو ڈھول کی تھاپ پر عون کے ساتھ بھنگڑا ڈالتے دیکھ کر حیران رہ
 گئی۔ ہنستا مسکراتا وہ بنا دستک دیے سیدھا اس کے دل میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ لڑکیوں اور خواتین نے پھولوں کی
 پتیاں برساکر ان کا استقبال کیا تھا۔ بھابھی نے اندر جاتے ہی ایسہا کو ثانیہ کے کمرے میں بھجوا دیا۔ پہلے اور سبز
 مہندی کے سوٹ میں ملبوس۔ پھولوں کے زیور اور چوڑیوں سے بھی سنوری وہ ثانیہ تھی۔
 ایک الگ ہی دل فریب سے روپ میں بسی۔ ایسہا سے لپٹ کے ملی۔
 ”بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“

(اور او اس بھی) ایسہا آدھی بات دل میں دیا گئی۔
 ”اور تم تو قیامت ڈھا رہی ہو۔ معیذ بھائی پر بھی ڈھائی ہوگی۔“ ثانیہ مسکرائی تو وہ جھینپ گئی۔
 ”قسم سے انہوں نے تو دیکھا بھی نہیں مجھے۔“

ثانیہ نے اسے امی اور دادی سے ملوایا۔ دادی کو تو وہ نیک روح اور کوئی فرشتہ ٹائپ شے لگی۔ وہ ثانیہ سے اس
 کی دوستی پر حیرانگی کا اظہار کر کر کے ثانیہ کا دل جلاتی رہیں۔
 ”عمون کا سوڈ کیسا ہے؟“ ثانیہ نے سرسری پوچھا تو وہ ہنسنے لگی۔
 ”وہ تو بھنگڑا ڈال رہے تھے باہر۔“ ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔
 دادی کی خواہش کے عین مطابق پہلے دوپٹے کی چھانوں میں ثانیہ کو لا کر سجے سجائے جھولے پر بٹھایا گیا اس کے
 بعد لڑکے عون کو لائے۔

ثانیہ کا بڑا جی چاہا گھونگھٹ اٹھا کر ایک بار تو عون کے تاثرات دیکھ ہی لے، مگر دل مسوس کے رہ گئی۔ ہاں وہ
 ساتھ آکر بیٹھا تو پہلی بار ثانیہ کا دل عجیب سے انداز اور ایک الگ سی لے میں دھڑکنے لگا۔
 سب باری باری تیل مہندی لگاتے اور انہیں مٹھائی کھلا کھلا کے بے حال کر رہے تھے۔
 ایسہا نے بھی سب کی دیکھا دیکھی بڑے شوق سے یہ رسم ادا کی تھی۔ رات گئے تک سب فارغ ہوئے۔ سب
 واپسی کے لیے نکلے تو ایسہا بھابھی اور امی کے ساتھ ہی حویلی آگئی کہ سارا سامان تو یہیں پڑا تھا۔
 شدید تھکاوٹ پر ایک بہترین دن اور بہترین لمحات گزارنے کی خوشی حاوی تھی۔
 معیذ تو عون کے ساتھ تھا۔ ایسہا اپنے کمرے میں آگئی۔ میک اپ صاف کر کے منہ ہاتھ دھو کر اس نے
 کپڑے تبدیل کیے۔

کمرے کے وسط میں کھڑی وہ تو لیے سے منہ خشک کر رہی تھی۔ اس کا بے ساختہ گھومنے کو جی چاہا بلکہ جھومنے
 کو۔

”زندگی ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ ٹینشن فری؟“ مسکراتے ہوئے وہ لائٹ آف کر کے بستر پہ آگئی۔
 (یہاں اکیلے۔ وہیں ثانیہ کے پاس ہی رک جاتی۔) آخری خیال اسے یہی آیا تھا۔ پھر وہ نیند کی وادی میں
 کھو گئی۔ جانے رات کا کون سا پل تھا۔ جب عجیب سے احساس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے بالکل پاس
 آکے گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا بے اختیار ایسہا کی چیخ نکل گئی۔
 آنے والا بھی بدک کراٹھا۔

اس نے فوراً ”ہی لائٹ آن کی سوہ معیذ تھا۔“

ایسہا سراسیمہ سی منہ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ معیز نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
 ”تم کب تک یہاں کیا کر رہی ہو۔؟“ ہونق سے انداز میں معیز نے پوچھا۔ اوہرا ایسہا کا تو حلق میں انکا دل ہی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

”سورہی تھی۔“ سادہ سا جواب۔ معیز کا دماغ گھوما۔
 ”تم میرے کمرے میں کیوں ہو۔؟“

”مجھے تو آئی نے اسی کمرے میں رہنے کا کہا تھا۔ میرا سامان بھی انہوں نے ہی رکھوایا تھا۔“ ایسہا نے عون کی امی کا حوالہ دیا۔

معیز کو یاد آیا۔ عون خبیث نے اس کا کیا تعارف پیش کیا تھا۔ اب ظاہر ہے میاں بیوی کو وہ ایک ہی کمرہ دیں گے نا۔ ابھی آتے ہوئے بھی عون نے بہت معنی خیزی سے ”سوٹ ڈریز“ کہا تھا۔ اب سمجھ آئی تھی۔
 نیند سے گلابی ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ سراسیمہ تھی۔ معیز خاموشی سے بیڈ کے کنارے ٹک کر جوتے اتارنے لگا۔ تھکاوٹ اور نیند سے برا حال تھا اوپر سے عون کی یہ شرارت، مگر اس کا واپس عون کے کمرے میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جہاں نہ جانے کون کون آڑا تر چھالینا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ واش روم میں جا کر کپڑے تبدیل کر کے آیا تب بھی وہ یونہی چادر بکھینچ کر سینے سے لگائے پریشان سی بیٹھی تھی۔
 ”سو جاؤ۔ اب تم کیا مراقبہ کرو کی ساری رات۔“

معیز نے نارمل سے انداز میں کہا۔ وہ خواجہ خواہ اس مسئلے کو کوئی ”بریا معاملہ“ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ سوائے بھی پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

”آپ۔ سو جائیں یہاں۔ میں کہیں اور۔“ وہ جلدی سے نیچے اترنے لگی۔ معیز نے ناچاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

”یہ اصل زندگی ہے کوئی ڈرامے کا سین نہیں۔ کہ میں بیڈ یہ لیٹوں اور تم زمین پہ جالیٹو۔“ ایسہا نے خائف ہو کر اسے دیکھا۔

”اپنی جگہ پر لیٹو اور سو جاؤ۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ”کوئی بات نہیں۔ آپ کو برا بھلا ہوگی۔ میں منہج کر لوں گی۔“ وہ انکی۔
 معیز نے اسے گھور کے دیکھا۔

”واٹ ڈویو میں۔ مجھے برا بھلا ہوگی؟“ وہ سٹیٹائی۔
 ”مطلب۔ آپ کھلے ہو کے سو جائیں۔ میری وجہ سے تنگ ہوں گے۔“
 اللہ۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔

معیز نے اسے اپنے حواس پہ طاری ہوتا محسوس کیا۔ خوب صورتی اور معصومیت مل جائے تو وہ ایسہا مراد بنتی تھی۔

معیز کو جیسے آج ابھی بتا چلا کہ سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا چہرہ کیسے چاند سا دکھتا ہے اور نیند کا کچا پن لیے گلابی آنکھیں۔ ایسا گلابی رنگ تو اس نے سارے رنگوں میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔
 اس کی نظر کے ارتکاز نے ایسہا کی ہتھیلیاں پہنچ دیں اس نے کسمسا کر اپنا ہاتھ معیز کی گرفت سے چھڑانے کی سعی کی تو وہ چونکا اور ایسہا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”چلو اب سو جاؤ آرام سے۔“

وہ اپنے اندر کے شور کو دبانے کی خاطر ڈانٹنے لگا۔ ایسہا خاموشی سے اپنی جگہ پہ جا کے بیٹھ گئی۔ لائٹ میں تو وہ

بڈ خواتین ڈائجسٹ 251 مئی 2015

اس کے سامنے بے تکلفی سے نہیں لیٹ سکتی تھی۔
 معیز لائٹ آف کر کے ٹائٹ بلب آن کرتا اپنی جگہ پہ آکے دراز ہو گیا۔ تب ایسا بھی آہستہ آہستہ لیٹ ہی
 گئی۔ شدید تھکاوٹ کے باوجود اس صورت حال کی وجہ سے معیز کو کافی دیر سے نیند آئی۔
 کسی کے جھنجھوڑنے سے وہ بمشکل آنکھیں کھول پایا۔ وہ اس پہ جھکی ہاتھیں کیا کہ رہی تھی۔ معیز کو اس کے
 الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔

مگر اس کا دھلا ٹکمراروپ اس قدر دل فریب اور اس کے اتنے قریب تھا کہ نیند ہی کی کیفیت میں بلا ارادہ وہ بے
 اختیار ہی معیز نے اس کا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

معیز کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہتا نہیں کتنے محبت کرنے والے میاں بیوی رہے ہوں۔
 اور ایسا۔ اس کی تو مانوسانسیں ہی تھم گئی تھیں۔ نور سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا اور ساتھ ہی معیز کے
 موبائل کی رنگ ٹون نے بجنا شروع کیا۔ تو وہ جیسے چونک کر حواس میں لوٹا۔ تو ایسا کو اپنے پاس۔ بہت پاس پایا۔
 وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔

اسے جیسے اپنی بے اختیاری پر یقین نہ آیا تھا۔ ایسا جلدی سے اٹھ کر دوسری طرف چہو کیے کھڑی ہو گئی۔ اس
 کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ معیز نے اٹھا کے دیکھا، عون کی کال تھی۔ خود کو نارمل کرتے ہوئے اس نے کال
 اٹینڈ کی تھی۔

”جناب عالی۔ اگر زندگی کی حسین صبح طلوع ہو گئی ہو تو باہر آجائیں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ عون نے
 شرارت بھرے مودبانہ انداز میں کہا تو وہ دانت پیسنے لگا۔

”یہ بہت بے ہودگی کی ہے تم نے عون۔“
 ”ارے چل۔ ایک تو روٹیننس کا موقع فراہم کیا“ اوپر سے ہم ہی کو طعنہ۔ ”وہ چکنا کھڑا تھا۔ معیز نے موبائل
 آف کر کے بستر پہ اچھال دیا۔

وہ کچھ سوچ کر چلتے ہوئے ایسا کی طرف آیا۔
 ”آتم سوری۔ میں نیند میں تھا۔“
 ”ہوں۔“ ایسا نے مارے حیا کے سر نہیں اٹھایا۔

معیز کو ٹوٹ کر کسی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ اور وہ ایسا کو کسی خوش فہمی میں نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔
 ”ہمارے درمیان اول روز سے جو معاملہ طے ہے ویسے ہی رہے گا۔ تم میرے راستے میں کہیں نہیں ہو ایسا۔
 آتم سوری اگیں۔“

وہ شخص ایک لمس کے تعلق کو کوئی نام نہیں دینا چاہتا تھا سو سرد مہری سے اسے جتا کر۔ واش روم میں گھس گیا
 اور ایسا خالی ہاتھ اور خالی دل کھڑی رہ گئی۔



حویلی سے عون عباس کی بارات اور مختصر سے باراتی پوری دھوم دھام سے نکلے اور دلہن کے گھر جا پہنچے۔ ایسا
 کی چھب آج بھی نرالی تھی مگر ایک حزن تھا جو اس کی خاموش نگاہوں سے چھلکا جاتا تھا۔
 پچھلے دو دنوں سے خواجواہ مسکرا نے والے ہونٹ بالکل خاموش تھے اور ساکت۔ معیز کا کئی بار اس سے
 سامنا ہوا مگر اس نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر معیز کو نہ دیکھا تھا۔ عون کی ضد پر نکاح کی سنت ادا کی گئی۔
 (بچپن کے نکاح کا کیا بھروسہ ساجی)

پتا نہیں کون کون سی رسمیں ہوئیں۔ ہنسی مذاق قوتیں۔ سب خوش تھے۔ ایت میں ایسہا کی خاموشی کو کون دیکھتا۔

ٹانیہ پر دلہنا پے کاروب ٹوٹ کر آیا تھا۔ تو عون بھی اس کی ٹکر کا تھا۔
داوی جان کی اجازت پا کر دلہن کی رخصتی چاہی گئی اور یہ قافلہ واپس آوا۔ معیذ نے آتے ہوئے سامان گاڑی میں رکھ لیا تھا تاکہ دوبارہ حویلی نہ جانا پڑے اور اب بارات کی واپسی تھی۔ معیذ کا ارادہ عون کی طرف جانے کا تھا۔
”مجھے گھر ڈراپ کر دیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ایسہا کی آواز میں بھیگاہن تھا مگر معیذ چپ رہا۔ وہ اسے اس کا کوئی جگنو تھماتا نہیں چاہتا تھا۔
وہ آنسو پتی خاموشی سے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتی رہی۔

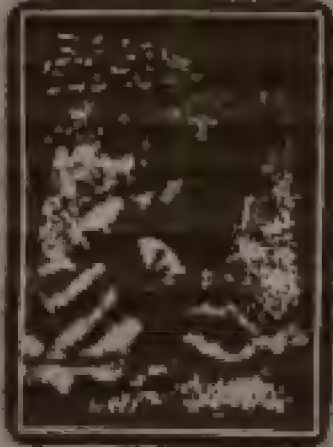


دلہن دینی بیٹھی ٹانیہ نے جتنی قرآنی آیات یاد تھیں پڑھ کے خود بہ دم کر لیں بلکہ اپنے گرد حصار بنا لیا۔
عون تو یہی سمجھتا ہے کہ میں اس شادی پہ راضی نہیں ہوں، ایسے میں یوں جج سنور کر اس کا انتظار کرتا۔ کتنا آگورڈ لگتا ہے۔
اسے یکایک دھیان آیا تو وہ جلدی سے اپنا لہنگا سمیٹتی اٹھی اور بستر سے اتر گئی۔
”اوفوف۔ سینڈل کدھر گئی۔“
اس نے جھک کر دیکھنا چاہا۔ تو لہنگے میں ابھی لڑکھرائی اور اس سے پہلے کہ زمین بوس ہوتی وہ ہاتھوں نے بے اختیار ہی نرمی سے اسے تھام لیا۔
ٹانیہ نے کرنٹ کھا کر مقابل کی طرف دیکھا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول
ہماری تھی



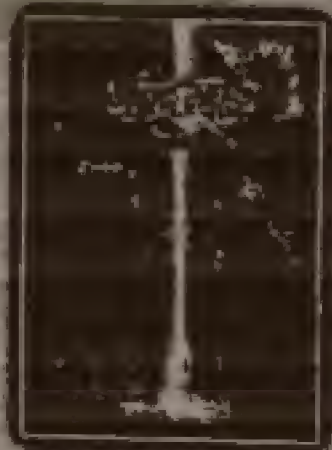
راحت جبین
قیمت - 300 روپے

شریک سفر



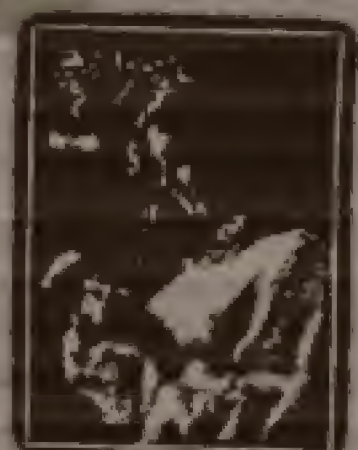
زمرہ ممتاز
قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

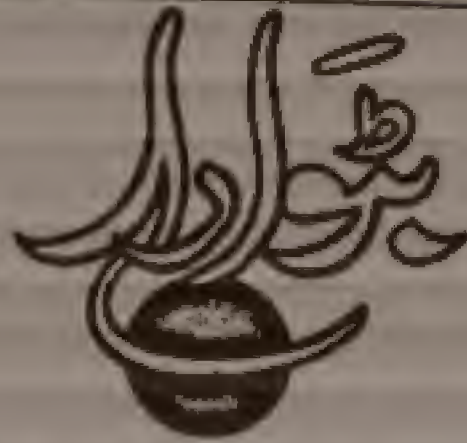
فون نمبر:

32735021

منعوانے: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

کا پتہ:

بذخواتین ڈائجسٹ 253 مئی 2015



”عروج بھا بھی!“ گرو پیش سے بے خبر وہ دونوں اپنی ہی باتوں میں مگن تھیں۔ جب دروازہ بجا اور عروج کی منہ مشام نے اندر جھانکا۔

”اندر آ جاؤ مٹی۔ ان سے ملو۔ یہ سارہ ہے میری پیسٹ فرینڈ۔ ایک بار پہلے بھی آپکی ہے ہمارے گھر۔ مگر تم چونکہ گھر پہ نہیں تھیں۔ اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ابھی بھی تم شاید باتھ لے رہی تھیں۔“ بولنے کی بے حد شوقین عروج نے بات کے آخر میں اس کے ہلکے نم بالوں کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ دھکیل کر اندر چلی آئی۔ ڈارک میرون کمر کے لباس میں تیار وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ سارہ سے رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد وہ دوبارہ عروج کی طرف مڑی۔

”وہ ایک جو نیلی بھا بھی! منال کی شادی کے لیے میں نے اس ڈریس کے ساتھ جو ایرنگز لیے تھے ان میں سے ایک کالا کٹوٹ گیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے آپ مجھے اپنا جو سیٹ دکھا رہی تھیں وہ اتفاق سے میرے ڈریس کے ساتھ بالکل میچ ہے تو اگر آپ۔۔۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ سر ہلاتے ہوئے پھرتی سے اٹھی اور نہ صرف لا کر میں سے اپنا بیٹ قیمت سیٹ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بلکہ سوٹ کے ساتھ کی میچنگ کچھ اور چیزیں بھی بنا اس کے کمرے حاضر کر دیں۔ سیٹ پر تو سارہ کی نظریں گویا جم کر رہ گئیں۔ میرون سیٹ پر لگے سفید نلینے گویا ہیروں کی مانند دمک رہے تھے۔

”ارے نہیں بھا بھی! مجھے تو صرف یہ سیٹ ہی چاہیے تھا۔ آپ نے خواہ مخواہ اتنی ساری چیزوں کا ڈھیر لگا دیا اور اس سیٹ کے لیے بھی بہت بہت تھینکس! سچ میں آپ نے تو میرا پر اہلم ہی سولو کر دیا۔“ باقی چیزوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے وہ ممنون سے سمجے میں بولی تو عروج کھل کر مسکرا دی۔

”مینشن ناٹ ڈیر! یہ بتاؤ کچھ اور تو نہیں چاہیے آپ کو؟“ بیڈ سے چیزیں اٹھا کر وہ الماری میں رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ سارہ نے دیکھا کہ ایک رُخلوص مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔

”بالکل نہیں جناب! ساری چیزیں مکمل ہو گئیں۔ اب بس علیشا کی بچی سے اس کا ہینڈ بیگ لینا باقی رہ گیا ہے۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ جانے کے لیے مڑی لیکن عروج کی آواز پر پھر سے رکن پڑا تھا۔ اپنی الماری میں سرگھسائے وہ شاید کچھ نکال رہی تھی۔ الماری کے پٹ بند کر کے جب وہ مڑی تو اس کے ہاتھوں میں ایک بے حد اسٹائلش اور برانڈڈ بیگ دیکھ کر مشام کی آنکھوں میں پہلے ستائش اور پھر کچھ حیرت ابھری۔

”بہت خوب صورت ہے بھا بھی۔ بے حد خوب صورت۔ مگر یہ آیا کہاں سے؟“ نظریں بیگ پر ہی جمائے وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”تمہارے بھائی صاحب نے کل تحفے میں دیا ہے“ مشی ڈارلنگ بھول گئیں کل ہماری دوسری ویڈنگ اپنی دوسری تھی یا۔۔۔“ بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ شوخی سے بولی تو مشام بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنا تو وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ سب یقیناً اس

کی بھابھی کی وسیع القسبی اور اچھائی ہی تھی جو اس جیسی تک چڑھی اور اکھڑ مزاج لڑکی کے ساتھ بھی اس کے تعلقات مثالی اور دوستانہ تھے۔ اس نے ایک بار پھر اس کا رُجوش شکریہ ادا کیا اور شرارت سے اس کا گال چوم کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

سارہ جو ابھی تک بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ مشائے کے باہر جاتے ہی اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور عروج کا بازو کھینچ کر اپنے

سامنے بیڈ پر بیٹھا۔

”تم۔ تم الو کہیں کی۔ تم نے اپنی اتنی قیمتی اور اچھی چیزیں کس طرح اس کے ایک دفعہ کہنے پر اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ پھر چیزیں بھی وہ جو تم نے خود بھی ابھی تک استعمال نہیں کیں۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہارے اندر عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟“ اس نے شدید حیرت اور اشتعال کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جس پر



اپنی قیمتی نئی اور غیر استعمال شدہ اشیا کسی اور کو سونپ دینے کا کوئی قلق نہ تھا۔

”جے بالکل ہے۔ جب ہی تو چیز جتنی بھی مہنگی ہو، میں پروا نہیں کرتی، کیونکہ رشتے ان مادی چیزوں سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ میرے لیے بھی میرے رشتے ان چیزوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور پھر اس سب میں میرا جانا کیا ہے؟ چیزیں استعمال کے بعد واپس کر دی جاتی ہیں اور پھر سے میری ہو جاتی ہیں۔ سسرال اور شوہر کی نظر میں میری جو قدر بڑھتی ہے وہ الگ۔ بتا ہے اب یہ مٹی گھر میں ایک ایک شخص کو بتائے گی کہ بھابھی نے اپنی نیو برانڈڈ چیزیں میرے ایک دفعہ کہنے پر مجھے دے دیں اور رات کو یہ بات جب وہ اپنے بھائی صاحب کو بھی بتائے گی تو جانتی ہو کیا ہو گا؟ ایسی اور کتنی ہی اچھی اور برانڈڈ چیزیں پھر سے میری ہماری کی نہنت بن جائیں گی۔“ وہ آسودگی سے مسکرائی۔ مگر سارہ اس کے فلسفہ سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔

”جو بھی ہے۔ میں تو اپنی کوئی استعمال شدہ اور دوسرے درجے کی چیز بھی کسی کے پاس برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا تو دل سکڑنے لگتا ہے۔ تم بتا نہیں کون سی احمقوں کی دنیا سے تعلق رکھتی ہو۔“ اس کی اس بات پر وہ محض مسکرا ہی سکتی تھی۔ اس لیے مسکرا دی۔

”چھوڑو یار۔ اچھا سنو! تم اپنے آفس کو لیگ حذیفہ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں نا۔“ اسے پھر سے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا دیکھ کر وہ جلدی سے بولی تو اس کا انداز سمجھ کر سارہ نے پہلے تو ایک شکایتی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور پھر سے حذیفہ کاشف کے نام کا قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔



اس دن اتوار تھا۔ سب گھر والے چچا کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ چچا کے بچھلے بیٹے کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ سارہ کا موڈ نہیں تھا جانے کا اور

چونکہ وہ بہت موڈی تھی اور زیادہ تر اپنے موڈ ہی کی مانتی تھی، اس لیے اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ امی نے ایک دو دفعہ کہا بھی اسے ساتھ چلنے کو، مگر وہ نہیں مانی۔ وہ بھی اپنی بیٹی کی عادت اور ضد سے بخوبی واقف تھیں۔ جب ہی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اپنے کمرے میں لیٹ کر ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب ڈائجسٹ اپنے منہ پہ رکھے وہ اونگھنے لگی تھی۔

”سارہ۔ اٹھو پلیز، میری بات سنو۔“ اپنے نام کی یکار پر اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور مندی مندی آنکھوں سے تیار کھڑی عمارہ کو دیکھا۔

”مجھے تم سے ایک ریکویسٹ کرنی تھی۔“ ہونٹ چپاتی انگلیاں مروڑتی وہ کچھ نروس دکھائی دے رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔ یو لو کیا ہے؟“ نیند سے بو جھل آواز میں اس نے استفسار کیا۔

”وہ۔۔۔ وہ سارہ۔ مجھے آج کے فنکشن کے لیے تمہارا وہ بلیک نیکلس چاہیے جو تم نے پچھلے سال ملتان سے خریدا تھا۔ صرف ایک دو گھنٹوں کے لیے۔ پلیز۔۔۔ یقین کرو، فنکشن سے واپس آتے ہی۔“

ہن کی شکل پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی نیند سے بری طرح بو جھل اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔

”واٹ؟ کیا کہا؟ نیکلس دے دوں۔ ایک بات بتاؤ عمارہ۔ تم کیا سوچ کر یوں مجھ سے نیکلس مانگنے چلی آؤ ہو؟ تم تو یوں فرمائش کر رہی ہو جیسے پہلے بھی میں بخوشی تمہیں اپنی چیزیں سونپتی رہی ہوں۔ یہ نیکلس تو تمہیں میرے مرنے کے بعد ہی مل سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ محض عمیر بھائی کی بیٹی کی سالگرہ کا فنکشن اٹینڈ کرنے کے لیے تو تم مجھے مارنے سے نہیں۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“ مگر دل جلانے والے انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور اطمینان سے اس کے چہرے پر نظریں جما کر اس کی مایوس حالت کا مزہ لینے

بھابھی؟“ ایرپیس سے اس کی چھوٹی نند زوہا کی نرم سی آواز اس کی سماعتوں میں منتقل ہوئی۔

”میں کھیک سوئی۔ آپ سناؤ۔ آپ کیسی ہو اور کیا کر رہی تھیں؟“ اسے بھی بادل نخواستہ اخلاق کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

”میں الحمد للہ بالکل فٹ فٹ ہوں اور جہاں تک بات ہے دوسرے سوال کی کہ کیا کر رہی تھی تو پیاری بھابھی جان! آج کل تو ہم دن رات بس شادی کی تیاریاں ہی کر رہے ہیں، وہ تو شکر ہے کہ کل تک تیاری مکمل ہو جائے گی اور رات تک ہم ان شاء اللہ واپس بھی آجائیں گے۔“ اس کے تفصیلی جواب پر وہ مسکرانے لگی۔

”پتا ہے بھابھی! آپ نے ٹاپ کے لیے جو اپنا ریڈ کلر کا جوٹا بھجوا دیا تھا نا، وہ بے حد خوب صورت اور نفیس ہے۔ یہاں سب ہی کو بہت پسند آیا ہے۔ سب کہہ رہے تھے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دلہن کی پسند کتنی اعلیٰ ہوگی۔“ اس کی بات سن کر جہاں اس کی گردن احساسِ تفاخر سے تنی، وہیں اس نے دل ہی دل میں خود کو اپنی اس چالاکی پر داد بھی دی کہ اس نے جان بوجھ کر ٹاپ میں اپنا سب سے مہنگا لباس اور جوٹا دیا تھا، تاکہ اس کے سسرال والے بری بھی ان چیزوں کے معیار اور قیمت کو دیکھ کر بنا میں وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ زوہا کی اگلی بات سن کر اس کو دھکا سا لگا۔

”وہ بھابھی! دراصل پرسوں میرے کالج میں فنکشن ہے، آپ کا جوٹا مجھے بہت اچھا لگا اور مجھے پورا بھی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں پرسوں وہ جوٹا پہن جاؤں۔ فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد میں جوٹا حفاظت سے آپ کے سلمان میں رکھ دوں گی۔“

ہونے والی نند کی اتنی کڑی فرمائش پر اس کے نو گویا تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس وقت اسے وہ نازک رشتہ بھی بھول گیا جو ان دونوں کے درمیان تھا۔

”نہیں زوہا۔ بالکل نہیں۔ میں وہ جوٹا آپ کو پہننے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی، وہ میرا سب سے اچھا اور پسندیدہ جوٹا ہے۔ پتا بھی ہے اس کی قیمت

کتنی ہے؟ پورے ساڑھے تین ہزار کا جوٹا ہے وہ۔ آپ لوگ کل جب واپس آؤ تو جوٹا مجھے فوراً واپس بھجوا دینا، اوکے۔ مجھے عادت نہیں ہے اپنی چیز کسی سے شیئر کرنے کی۔ ویسے بھی ابھی آپ چھوٹی ہو۔ اتنا مہنگا جوٹا پہن کر خراب ہی کرو گی نا۔ فیصل آباد سے جہاں اتنی شاپنگ کی ہے وہیں اپنے لیے ایک جوٹا بھی خرید لیتا۔ اوکے گڈ بائے۔ میں اب فون رکھتی ہوں، پر ہاں۔ جوٹا لازمی بھجوا دینا ڈیر۔“ بے حد تیز لہجے میں بولتے بولتے آخر میں اس نے خیال آنے پر اپنا انداز نرم کیا، جبکہ دوسری طرف فون ہاتھ میں پکڑے ساکت کھڑی زوہا کا وجود اس کے آگ برساتے لہجے اور الفاظ سے بھلس کر رہ گیا تھا۔



اگلے دن سارہ کمپنی کی عمارت میں داخل ہوئی تو سامنے ہی کھڑے حذیفہ کو دیکھ کر اسے بے حد خوش گوار حیرت ہوئی کل شام تک تو وہ فیصل آباد میں تھا اور اب۔ اس نے گنا۔ پورے پندرہ دن رہ گئے تھے شادی میں اور آج وہ جاب سے ریزائن کرنے کے سلسلے میں آئی تھی۔ کسی خوش گوار سوچ کے زیر اثر اس نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا سر جھٹکا اور چلتے ہوئے نگاہیں اسی پر ٹکا دیں جو تب سے وہیں کھڑا اسے بڑی سنجیدگی سے دیکھتا، بس دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اس کا انداز نوٹ کیے بغیر اس کے قریب چلی آئی۔

”ہیلو حذیفہ۔ کیسے ہیں آپ؟ اور آج یہاں کیسے؟ آپ تو شاپنگ کے سلسلے میں فیصل آباد میں تھے نا اور واپسی آپ کی غالباً رات کو ہوئی تھی۔“ وہ بڑے خوش گوار موڈ میں اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی کہ ایک دم حذیفہ نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بے اختیار جوگی اور ایک انجھی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، مگر اس کے تاثرات سنجیدہ اور نہ سمجھ میں آنے والے تھے۔

”یہ کیا ہے حذیفہ؟“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر استفسار کیا۔ نہ جانے کیوں اسے اس کا

گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نیکلس عمارہ کو کتنا پسند آیا تھا۔ مگر اس کے کہنے سے پہلے ہی سارہ وہ نیکلس اپنے نام کر چکی تھی۔ آج اس کے تھوڑی دیر کے لیے نیکلس مانگنے پر بھی اس نے انکار کر دیا تھا۔

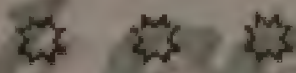
وہ ایسی ہی تھی۔ رشتوں سے زیادہ مادی چیزوں پر جان دینے والی۔ کتنے ہی ایسے واقعات تھے جو اس کی چیزوں سے محبت کا ثبوت ہے۔ چند روپوں کی چیزوں کے لیے کتنی ہی بار وہ اپنے پیاروں کا دل توڑ چکی تھی۔ مگر اسے پروا ہی کب تھی۔ شگفتہ بیگم اس کی اس عادت بلکہ بد عادت سے زیادہ ہی عاجز اور خوف زدہ تھیں۔ انہوں نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر بے سود وہ سستی تو پھرنا۔

ایک دفعہ ایسی ہی کسی بات پر شگفتہ بیگم کا ضبط جواب دے گیا تھا اور وہ چیخ گئیں۔

”سارہ۔ تمہیں کس طرح سے سمجھاؤں بیٹا کہ اپنی ترجیحات کی ترتیب کو بدلو۔ انسانوں کو انسانوں کی اور چیزوں کو چیزوں ہی کی اہمیت دو بیٹا۔ دونوں کی اہمیت مختلف ہے۔ ان کی جگہیں تبدیل مت کرو۔ تمہاری یہ عادت کتنی بری اور نقصان دہ ہے۔ تمہیں شاید خبر ہی نہیں ہے۔“ وہ اپنا سر پکڑے بڑی بے بسی سے بولی تھیں۔

”کم آن امی! آپ ماؤں کو تو جیسے مرض ہوتا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹینشن لینے کا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جس پر آپ فکریں اور اندیشے پالیں۔ بس نہیں ہے مجھے اپنی کوئی چیز سیر کرنے کی عادت میں اپنی چیزوں کے لیے حد سے زیادہ پوزیو ہوں۔“ چیونگم چباتے ہوئے اس نے کچھ اتنی بے نیازی سے کہا کہ چند لمحوں تک وہ بول ہی نہ سکیں۔

”اے پوزیو ہونا نہیں کہتے بیٹا جی! اسے تنگ دل، کم ظرف، گہینہ اور ماریت پرست ہونا کہتے ہیں۔“ ان کی بات پر لمحے بھر کے لیے اس کا چیونگم چبا مانہ رکھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے شان بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔ کیا مجال کہ ذرا سا بھی اثر ہوا ہو اس پر۔



ایم اے آکٹائمس کرنے کے بعد وہ ایک کمپنی میں جاب کرنے لگی تھی، ایک روز اسی کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز اس کے کولیگ حذیفہ کاشف کا اس کے لیے پروپوزل آگیا۔ گوکہ وہ پہلے ہی سے حذیفہ کی اپنے لیے پسندیدگی بھانپ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے جیسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنا اچھا ویل اسٹیمبلشڈ اور ہینڈ سم لڑکا بھلا برا کیسے لگ سکتا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی دل ہی دل میں اسے بے حد پسند کرتی تھی۔ حذیفہ کے والدین نہیں تھے والد چند سال پہلے ایر کریش میں جاں بحق ہو گئے تھے اور ابھی چھ ماہ قبل ہی ان کی فوج زدہ ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ خاندان کے نام پر صرف دو چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی تھا، رسمی کارروائی اور چھان پھٹک کے بعد اس کے رشتے کو ہاں کہہ دی گئی۔ کب منگنی ہوئی اور کب شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی۔ پتا ہی نہ چلا۔ ماریج کے مہینے کا آخری عشرہ چل رہا تھا اور شادی اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو تھی۔

تیار یوں کے سلسلے میں بازار کے چکروں نے سب ہی کو ہلکان کر رکھا تھا، مگر شاپنگ اور نت نئی قیمتی چیزوں کی شوقین سارہ کو تو جیسے تھکن چھو کر نہیں گزرتی تھی۔ اسے تو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کی مندریں گھر میں کسی بڑے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی شادی کی شاپنگ فیصل آباد جا کر اپنی خالہ کے ساتھ کر رہی تھیں اور یوں وہ بازار میں گھوم پھر کر اپنی پسند کی چیزیں خریدنے سے محروم رہ گئی تھی۔

اس شام بازار سے واپس آکر ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ اس کی مندر زریاب کا فون آگیا۔

”بھابھی! ایک منٹ رکے ذرا۔ زوہا بھی آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ اوہراوہر کی چند باتوں کے بعد اس نے فون بند کرنا چاہا تو زریاب جلدی سے بولی جس پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رکنا پڑا۔ دونوں بہنوں میں ایک سال کا فرق تھا اور دونوں ایک ہی کالج میں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھیں۔

”ہیلو۔ السلام علیکم! میں زوہا۔ کیسی ہیں آپ

انداز بڑا کھٹک رہا تھا۔

”تمہاری امانت ہے یہ۔ وہ سب چیزیں جو تم نے میری بہنوں کو بطور ناپ دی تھیں اور ہاں و حیان سے اس میں تمہارا ساڑھے تین ہزار کا جوتا بھی ہے۔ وہی جوتا جو کل تم نے بڑی بے مروتی سے زوہا کو کالج پہن کر جانے سے روک دیا تھا،‘ بھی‘ آخر تمہیں اپنی چیزیں شیر کرنے کی عادت جو نہیں ہے۔“

اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اپنے دوسرے ہاتھ سے اس میں شاپنگ بیگ تھماتے ہوئے وہ کچھ اس انداز میں بولا کہ سارہ کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ بیگ تمہا کروہ سیدھا ہوا اور کتنے ہی لمحے اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں کا سامنا کرنا اس وقت سارہ کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگا تھا۔

”پتا ہے سارہ! اپنے والدین کے بعد میں اپنی بہنوں اور بھائی کا واحد سہارا ہوں۔ وہ سہارا جس کے سہارے وہ پھر سے زندگی کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں‘ یعنی ان کا بڑا بھائی زمانے کی سختیوں اور مصائب کے خلاف ان کے آگے ڈھال بن جاؤں گا۔ آسان نہیں تھا۔ سارہ ہمارے لیے مہی کی ڈبٹھ کے بعد خود کو سنبھالنا، مگر ہم نے یہ کام بھی ایک دوسرے کے لیے انجام دے ہی دیا۔ میں اگر انہیں محبت، توجہ اور ضروریات زندگی فراہم کر رہا ہوں تو بدلے میں وہ بھی میری خدمت، حوصلہ افزائی اور مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے اپنا ہر رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔ ہم اب ایک دوسرے کے لیے سب کچھ ہیں۔ تم۔ ختم سارہ! تم میری پسند تھیں۔ جسے میں نے بڑی محبت سے بڑے مان سے اور خاصی توقعات کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا تھا۔ سوچا تھا، تم میرے گھر کو پھر سے گھر بنادو گی، میری چھوٹی بہنوں کو، بھی ان کی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دو گی کہ آخر بھابھی بھی تو ماں ہی ہوتی ہے نا۔ مجھے لگا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو اس محبت میں میرے بہن، بھائی کو بھی اپنا ہی سمجھو گی

اور انہیں وہ محبت اور شفقت دو گی جس کے وہ تم سے طلب گار ہیں۔ مگر۔ مگر تم تو پیسے اور مادی اشیا سے محبت کرنے والی ایک عام اور سطحی سی لڑکی لکھیں سارہ۔ جس کی ترجیحات کی فہرست میں چیزیں پہلے اور انسان بعد میں آتے ہیں۔ کل تم نے جس انداز میں زوہا کو محض تھوڑی دیر کے لیے اپنا ایک جوتا پہننے کے لیے سختی سے منع کر دیا۔ اس سے نہ صرف میرا اندر زخمی ہو گیا، بلکہ مجھ پر یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ تمہارے نزدیک — ایک جوتے کی قدر بھی میری بہنوں سے زیادہ ہے۔ سو میں نے درست وقت پر ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا سارہ۔ میں نے ایک غلط اور سطحی لڑکی کا انتخاب کیا۔ جس کے نزدیک جذبات، احساسات اور رشتے بالکل بے معنی تھے۔ اگر تم میری بہنوں کے ساتھ اپنی کوئی چیز شیر نہیں کر سکتیں تو سوچو میری بہنیں تو تمہارے ساتھ اپنا بھائی شیر کر رہی تھیں۔ وہ تو شاید مجھے یہ بات کبھی نہ بتائیں اگر جو میں خود اپنے کانوں سے فون پر تمہاری گفتگو اور انداز نہ سن لیتا، یاد رکھنا سارہ! جس دن تم نے چیزوں کی قربانی دینا سیکھ لی اسی دن تم لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گی۔ اوکے۔ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔“

ایک آخری بے حد کٹیلی نگاہ اس پر ڈال کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

جبکہ اس کی حالت تو یوں تھی جیسے کانٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ساکت کھڑی وہ کتنی ہی دیر تک اس جگہ پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی، جہاں ابھی کچھ دیر قبل اس کے قدم تھے اور پھر جب آنکھوں کے آگے آنے والی آنسوؤں کی چادر نے کچھ دیکھنے کے قابل نہ چھوڑا تو وہ وہیں قریب رکھی کرسی پر ڈھسے سی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



گکھٹ

کسی نے دروازہ اتنے زور سے دھڑ دھڑایا کہ میرا نازک سادل سینے کے بجنے میں پھر پھڑا کر رہ گیا۔ ہاتھ میں چھری سبزی جو بھی تھا اچھل دیا۔ کدھر کس طرف کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس یا اللہ یا رحمن کا ورد کرتی دروازے کی طرف دوڑ لگلی۔

”یہ کیا ابھی تو آپ گئے تھے ابھی واپس بھی آگئے خیریت تو ہے نا۔“

میاں صاحب کو دیکھ کر مس ٹینشن کی ہمیشہ والی ٹینشن شروع۔ میاں صاحب ہانپتے ہوئے کیراج کے سامنے پڑی پلاسٹک چیرے ڈھے سے گئے۔ دل مزید ہول گیا۔ لوتی ٹھنڈے پینے شروع۔ لی پی لو۔ وہیں زینن یہی بیٹھ گئی۔ میاں صاحب ہمیشہ کی طرح میری حالت سمجھ گئے۔ اٹھ کر فوراً پاس آئے۔

”تمہارے لیے خط آیا ہے۔ بس وہی دینے آیا تھا۔ تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہو۔“ وہ ساتھ ہی زینن پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

”لیس خط بعد میں نہیں لاسکتے تھے۔ جس انداز میں لائے ہیں وہ تو ہے ہی پریشان کن۔“ میں خفا ہوئی۔

”ارے ایسا دسا خط تھوڑی ہے۔ خواتین کی طرف سے ہے۔“ خوشی ان کی آواز سے زیادہ ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

”ہائے اللہ ہی میں۔“ میں پوری قوت سے اچھلی۔ وہ بے چارے پیچھے جا کرے۔ مگر مسکرا دیے۔

”بس یہی حل میرا ہوا تھا۔ اچھا سوال نامہ ہے سروے کے لیے۔ جلدی جلدی سوال کے جواب سوچو۔“ وہ بے چین تھے۔

”آپ نے پڑھ بھی لیا۔“ میں نے آنکھیں

دکھائیں۔

”ہاں تو تم بھی تو میرا FB پاس ورڈ جانتی ہو۔ اور چار مرتبہ چیک کرتی ہو میرا اکاؤنٹ۔“ انہوں نے بھی آنکھیں دکھائیں اور میں۔

”بس رہنے دیں نا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔“

”اچھا ابھی تو مجھے خط دیکھنے دیں۔ پھر آرام سے جواب لکھیں گے۔“ میں نے خط کھول کر دکھا۔ اور

بس دیکھتی ہی رہی عقیدت سے۔

سات دن ہو گئے۔ مگر میرا خط کو دیکھ دیکھ کے ہی جی نہ بھرا۔ میاں صاحب بھی دن میں دو مرتبہ تو ضرور مانگ کے پڑھتے اور مشورے بھی دیتے۔ مگر میں لکھنے پہ تیار ہوں تب نا۔

”کیا لکھوں۔“ ساتویں دن اٹھتے ہی میاں صاحب نے یاد دہانی کر دالی۔ میں رو پائی ہو گئی۔

”کیا لکھوں۔ مجھے خط لکھنا نہیں آتا۔ اگر انہوں نے رنجیکٹ کر دیا تو؟“

”تو بھی پورے ملک میں بینر تو نہیں لگا دیں گے۔ تم لکھو تو۔“ وہ ہنسد ہوئے میرے قلم سے اپنے کان کھرچتے ہوئے۔

”اچھا میرا قلم تو دیں نا۔“

”اوہ سوری۔ میں نے سوچا میں بھی تمہاری اہلب کراؤں۔“ وہ سر کھجا کر رہ گئے۔ ”رہنے دیں آپ سے کبھی اہلب ہوئی بھی ہے۔“

”اچھا جناب۔ سب سے پہلا قاری تو میں ہی ہوتا ہوں تمہارے افسانے کا۔ اور پھر پوسٹ بھی تو میں ہی کرتا ہوں۔“ میں نے فوراً ”کان پکڑ لیے۔“ ویسے سچ بتاؤ پہلی تحریر کے وقت تمہیں کیا محسوس ہوا تھا۔“

ان کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ میں بھی چند سال پیچھے چلی گئی۔

”ہماری پوری فیملی ان رسالوں کی دیوانی ہے۔ خصوصاً امی کو مجھ میں یہ ہنر نظر آتا تھا۔ اور ان کی خواہش تھی کہ کبھی میں بھی اس ادارے کے لیے لکھوں۔ میں اپنی وجہ سے ان کی آنکھوں اور ہرے پہ وہ خوشی دیکھنا چاہتی تھیں۔ جو مجھے لگتا میری تحریر سے ضرور انہیں ملے گی۔

میں نے تحریر بھیجی تو بسبھی نے مذاق اڑایا کہ واپس آجائے گی۔ کیونکہ خواتین میں منجھی ہوئی رائٹرز کو ہی جگہ ملتی ہے۔ بس میں نے بھی خود ہی سے حمد کر لیا۔

کہ پہلی کہانی چھپے کی تو صرف خواتین میں ورنہ لکھنا چھوڑ دوں گی۔ ان دنوں میں شدید بیمار تھی اور مزید پریشان ہوئی کہ اگر شائع نہ ہوئی تو۔ لیکن خیر۔ میں نے

خدا کی ذات پر بھروسہ رکھا اور تحریر شائع ہو گئی۔

”اور تمہاری یہ اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے والی عادت ہی تو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔“ میاں صاحب نے فخر سے کہا تو میں نے خود کو مزید پھولتا محسوس کیا۔

”اچھا اب اور مت پھولو۔ دوسرے حصے کا جواب لکھو۔“ انہوں نے خود ہی غبارے سے ہوائ نکال دی۔



میں منہ نہ دیتی۔

”پڑھ لکھی کا بس اتنا اندازہ تھا کہ یہاں امی اور فیملی سب بہت خوش ہوں گے۔ مگر اس وقت میری کیا حالت ہوئی میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب میرے اساتذہ ’میری دوستوں اور شر کے لوگوں نے میرا نمبر ڈھونڈ کر مجھے مبارکباد دی۔ میری تعریف کی۔ مجھے سراہا۔ مجھے تب ہی پتا چلا کہ میری تحریر خواتین میں آئی ہے۔ پھر کیا تھا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنا شروع۔ میں پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔“ میری پلکیں آج بھی جھپکنے لگیں وہ سب یاد کر کے میاں صاحب نے مجھے خود سے لگا لیا۔

”میری طرف سے عنبرہ سید کا نام لکھ دینا۔“ میں نے پسندیدہ راسٹرز میں اپنی تمام راسٹرز کا نام لکھا جیسے شازیہ چوہدری، راحت جبین، عالیہ بخاری، نگہت عبداللہ تو میاں صاحب نے بھی لقمہ دیا۔

”جی جی۔ یہ نام بھی شامل ہے۔ فکر نہ کریں۔“ میں مسکرائی۔ اور خواتین کے علاوہ اپنے پسندیدہ راسٹرز لکھنے لگی۔

”اشفاق احمد، ہاشم ندیم اور ابن صفی“

”کمال ہے تم تو بہت کھری کتابیں پڑھتی ہو۔“

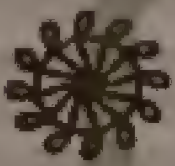
میاں صاحب کو آج پتا چلا اور میں آخری سوال پر پریشان۔ ”کیا لکھوں“

”صبح صبح لکھ دو کہ سوائے فراغت کے سب کر لیتی ہو۔“ کتنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ مسکرائے۔ میں تیزی سے قلم چلائے لگی۔

”صبح نماز کے بعد کچھ وقت اکیلے گزارنا ہے حد پسند ہے اس کے بعد ہاؤس وائف والی ساری ذمہ داریاں سنبھالتی ہوں۔ جیسے بچوں، اماں اور میاں کے لیے ناشتا تیار کرنا، پھر بچوں کو اسکول اور میاں کو آفس بھیجنا، اماں کے ساتھ بھی وقت گزارنا، صفائیاں، کپڑے دھونا، کھانا پکانا، سب گھریلو کام، درمیان میں ایک گھنٹہ فارغ ملتا ہے جو مطالعے میں گزرتا ہے۔ پھر سے کام میں لگ جاتی ہوں۔ جو رات نو تک چلتے ہیں۔ نوبت کے بعد کچھ لکھتی ہوں یا پڑھتی ہوں۔ دس بجے تلاوت کر کے خود کو تسکین دیتی ہوں اور گیارہ تک لازمی سو جاتی ہوں۔ ٹی وی، فلم، میوزک چھوڑ دیتے ہیں۔ جب سے ہجرت کی۔ تعلیم شادی کے بعد مکمل کی۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز اور انجوائی کیشن میں پچھل کر گیا ہے۔

”لو جی، ٹینشن ختم۔ شکر میرے مالک کا میں نے خط لکھ ہی لیا۔“ میری یہ حالت دیکھ کر میاں جی مسکرا دیئے۔

”میری طرف سے بھی سالگرہ مبارک کہہ دینا۔ تم تو جانتی ہونا خواتین میرا بھی اپنا رسالہ ہے۔“ انہوں نے کہا تو میں کھل کے مسکرا دی۔ اس میں بھی کوئی شک تھا بھلا؟ وہ میری طرح اس رسالے کے دیوانے ہیں۔



مبارک باد

10 اپریل کی ایک سہانی شام میں مقبول مصنفہ نازیہ کنول نازی باہل کا آنگن سونا کر کے پیا کے گھر سدھار گئیں۔

اس پُرسرت موقع پر ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارکباد۔

ہماری دعا ہے کہ زندگی کا یہ خوب صورت موڑ اور ان کا ہم سفران کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)

اور تو کچھ بھی نہیں،

اور تو کچھ بھی نہیں

ہاں بس

ایک بار کھل کے رونا چاہتی ہوں

اور تو کچھ بھی نہیں

ہاں بس

ایک بار تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی

ہوں

اور تو کچھ بھی نہیں

ہاں بس

ایک بار صرف

ایک بار تم سے بھرپور نفرت کرنا چاہتی

ہوں۔

منجہ نسیم

ناصر زیدی



رابطہ و ضبط باہم میں دخل ہو کسی کو کیا

جان بھی چلی جائے اُس کے واسطے سو کیا

راز داں بتا آخر تجھ کو تو خبر ہوگی

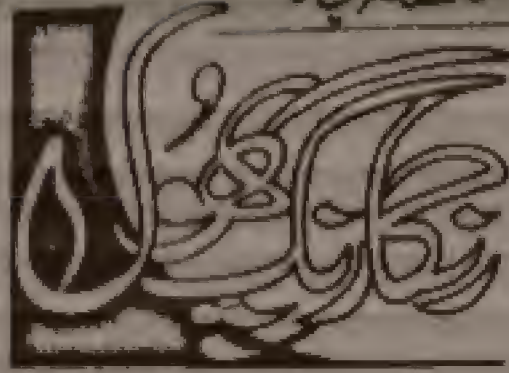
میرا نام سن کے بھی سوچتے رہے وہ کیا

دوست داریوں میں بھی کلفتیں تو ہوتی ہیں

کتنے لوگ پھڑپھڑے ہیں تم پھڑکے تو کیا

ہے خبر کہ مرتے ہو ایک آفتِ جاں پر

پھر سے ان دنوں ناصر باؤلے ہوئے ہو کیا



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی رکھے گا۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل ۱۔

۱۔ پردہ پوشی سے مراد کسی کے گناہ یا عیب کو ظاہر کرنے اور اس کی تشہیر سے اجتناب کرنا ہے۔
۲۔ کوئی انسان عیب اور غلطی سے پاک نہیں، لہذا دوسروں کو بدنام کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

۳۔ آخرت میں پردہ رکھنے کا مطلب اس کے گناہوں کی معافی ہے۔

۴۔ کسی پر احسان کرنے کا اچھا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ انسان دوسروں سے جس قسم کا سلوک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔

کیا فائدہ،

معافی بن سلیمان اپنے دوست کے ساتھ چل رہے تھے۔ دوست نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا: ”اُتب آج کتنی سردی ہے۔“

معافی نے کہا: ”اب تمہیں گرمی مل گئی ہے۔“ وہ بولا: ”نہیں۔“

اس پر معافی نے کہا: ”پھر مذمت کرنے کا کیا فائدہ۔ اگر سبحان اللہ کہہ دیتے تو بات بھی تھی۔“

بددعا،

امیر المومنین محمد امین کو اپنی ایک کینسر سے بہت

محبت تھی۔ اس کا نام فادرہ تھا اور حسن و جمال کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔
امین اس کی محبت میں اکثر اس سے کہتا کہ مجھے یہ خوف ہے کہ میں مر گیا تو مامون دولت کا لالچ دے کر تمہیں اپنے نکاح میں لے آئے گا۔

فادرہ اس کے خواب میں قیسمیں کھا کر یقین دلاتی کہ وہ اس کے سوا زندگی میں کسی کی صورت نہیں دیکھے گی۔

چند ہی روز بعد امین مارا گیا اور مامون خلیفہ بنایا گیا۔ فادرہ کے جن کاچر پہلے ہی تھا۔ مامون نے اس کو نکاح کا پیغام بھجوایا تھا اس نے قبول کر لیا۔ نکاح کے بعد پہلی رات تھی۔ فادرہ، مامون کے پہلو میں سو رہی تھی۔ اس نے خواب دیکھا مامون اس کے سر ہاتھ کھڑا فادرہ کو مخاطب کر کے —
وعدہ خلائی پر موت کی بددعا دے رہا ہے۔
فادرہ نے چیخ ماری اور جاگ اٹھی۔ مامون کو سارا واقعہ سنایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ صبح کو مامون نے دیکھا کہ امین کی بددعا پوری ہوئی اور فادرہ بستر پر مردہ پڑی تھی۔

فارسی دان،

شاہ ایران کی خاطر گورنر ہاؤس لاہور میں قوالی کا اہتمام کیا گیا۔ ایک قوال نے امیر خسرو کا فارسی کلام گانا شروع کیا تو شاہ ایران نے پوچھا: ”یہ کس زبان میں گا رہے ہیں؟“
رضوانہ رشتی۔ السہ ملک ملتان

رام کہانی،

ایک صاحب رات گئے گھر پہنچے اور بیوی

سے بولے۔
 ”کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں اتنی دیر تک
 کہاں رہا تھا؟“
 بیوی بولی۔ ”بالکل اندازہ لگا سکتی ہوں تاہم
 تم اپنی کہانی بھی سننا ڈالو“

محبت

محبت ایسا پودا ہے جو تب بھی سبز رہتا ہے
 کہ جب موسم نہیں ہوتا
 محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روکھ بھی جلے
 تو پانی کم نہیں ہوتا
 ثمرین اکرام۔ میر پور خاص

تعمیل

مغل بادشاہ شاہجہاں کے انتقال کے بعد اس کی
 جان نشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس
 کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عالمگیر اور دوسرے کا نام
 دارا شکوہ تھا۔ دونوں میں تخت نشینی کے لیے رقابت
 پیدا ہو گئی۔

عالمگیر کو اپنے والد کی جان نشینی اور بادشاہت کی
 طلب تھی اور اس کے بھائی دارا شکوہ کو بھی بادشاہت
 کرنے کی خواہش تھی۔ ریاست کے جو بڑے لوگ تھے
 ان میں سے کچھ دارا شکوہ اور کچھ عالمگیر کے حق میں بات
 کرتے تھے۔ کیونکہ عالمگیر ایک نیک دل انسان تھا جبکہ
 دارا شکوہ کے کچھ نظریات شریعت سے مطابقت نہ
 رکھتے تھے۔ اس کے ہاتھ اقتدار آنے سے ملک کے
 اسلامی شخص کے لیے خطرات تھے۔ ان کے زمانے میں
 ایک مشہور بزرگ تھے۔ لوگوں نے سوچا کہ دونوں بھائیوں
 کو ان بزرگ کے پاس بھیجتے ہیں۔ وہ جس کو سلطنت
 کا بادشاہ بنائیں گے، ہمیں منظور ہوگا۔ دونوں بھائیوں
 نے بھی یہی ارادہ کیا کہ ان بزرگ کے پاس جا کر اپنے حق
 میں دعا کرائی جائے اور وہ جو فیصلہ کریں، اسے قبول
 کیا جائے۔

پہلے دارا شکوہ ان بزرگ کے پاس دعا اور دیارت
 کے لیے پہنچا۔ اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے

تھے۔ انہوں نے دارا شکوہ کو تخت پر بیٹھنے کے لیے
 کہا تو اس نے کہا۔
 ”میں نیچے ہی ٹھیک ہوں“
 اس کے بعد عالمگیر آئے۔ وہ جیسے نیچے بیٹھنے لگے
 تو بزرگ نے فرمایا۔

”تم یہاں میرے پاس آ جاؤ“
 وہ خود آئے اور تخت پر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے
 انہیں کچھ نصیحت فرمادی۔
 جب عالمگیر واپس چلے گئے اور لوگوں نے بزرگ
 سے پوچھا۔

”آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“
 انہوں نے کہا۔ ”ان دونوں بھائیوں نے اپنا فیصلہ
 خود کر لیا۔ دارا شکوہ کو ہم نے تخت پیش کیا۔ اس نے انکار
 کر دیا اور عالمگیر کو پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔ اب
 تخت شاہی عالمگیر کو ملے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔“

عقل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات
 کا حکم دے تو چاہے اس پر عمل کرنا ادب کے خلاف ہی
 معلوم ہو رہا ہو مگر اس کی تعمیل کرنی چاہیے کہ اسی میں
 بھلائی ہے۔“ مقولہ مشہور ہے۔

”حکم کا درجہ ادب سے بڑھ کر ہے لیکن یہ بھی لازم
 ہے کہ بزرگ کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو۔“

تمہیں کیوں دوں

ایک امریکی کروڑپتی سے ایک خیراتی ادارے کا
 رضا کار چندہ مانگنے آیا۔ رضا کار پوری تیاری کر کے گیا تھا۔
 کروڑپتی سے کہنے لگا۔

”جناب! ہماری اطلاع کے مطابق فلاں بینک میں
 آپ کے اتنے کروڑ اور فلاں بینک میں اتنے کروڑ جمع
 ہیں۔ فلاں ریاست میں اتنی زمین اور فلاں شہر میں
 اتنی عمارتیں ہیں۔ بے شمار کارخانوں میں آپ جتنے دار
 ہیں۔ مگر آپ نے کبھی کسی خیراتی ادارے کو کچھ نہیں دیا۔“
 کروڑپتی نے بڑے کھلے سارے بات سنی اور پھر
 خیراتی ادارے والے سے کہنے لگا۔

”تمہاری معلومات مکمل طور پر درست ہیں۔ مگر کیا

شکر پارے،

مستقبل بین لڑکی ماضی پرست مرد سے نفرت کرتی ہے۔
(ایون ایسار)
اگر آپ ایک خوبصورت اور دلکش عورت میں فرق جانا چاہتے ہیں تو یاد رکھیے، خوبصورت عورت وہ ہے جس پر آپ کی نظر پڑتی ہے اور دلکش عورت وہ ہے جس کی نظر آپ پر پڑتی ہے۔

(ایڈ لائی سٹیوٹن)
اگر آپ ایک پونڈ پر ہی راضی ہو جائیں تو ایک لاکھ پونڈ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔
(برن ولنر)
ارم کمال۔ فیصل آباد

آزادی،

- آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہے۔ (روسو)
- انسانی آزادی کو یا مال کرنے کے لیے ہمیشہ نظر ضرورت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ آدمیوں کی دلیل ہے اور غلاموں کا مذہب ہے۔ (ولیم پیٹ)
- انسانی عظمت اور مسرت کے لیے شخصی آزادی سب سے ضروری ہے۔ (بل ورلٹن)
لاریب، ماہ ذیہب۔ چوہنیاں



تمہیں اس بات کا علم ہے کہ میری ماں فلاں شہر میں اکیلے رہتی ہے۔ اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں؟
رضا کار بولا: "نہیں جناب، مجھے علم نہیں"
کر وڑ جی نے کہا: "اور کیا تمہیں علم ہے کہ میرا ایک بھائی معذور ہے، جو خود کچھ نہیں کما سکتا"
رضا کار شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا: "نہیں سر! مجھے پتا نہیں تھا!"

کر وڑ جی نے کہا: "اور کیا تمہیں پتا ہے کہ میری بہن اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ان کا کمانے والا بھی کوئی نہیں!"

رضا کار بولا: "میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے پتا ہوتا کہ آپ پہلے ہی اتنے لوگوں کو پال رہے ہیں تو میں قطعاً آپ کے پاس نہ آتا!"

کر وڑ جی گرج کر بولا: "یہ بات نہیں، اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ان عزیز رشتے داروں کو کچھ نہیں دیتا تو تمہیں کیوں دوں؟"
دعا شاہد۔ کراچی

نیکی،

نیکی سچ کی طرح ہوتی ہے۔ آپ آٹھ تولے کالے بیج بڑتے ہیں، پانی دیتے ہیں۔ اس بیج میں سے ایک کونسل نکلتی ہے اور یہ کونسل آگے چل کر سینکڑوں ٹن کے درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان زمین میں ہمیشہ تیس فٹ کا درخت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر شخص باآسانی سینکڑوں ہزاروں درختوں کے بیج بوسکتا ہے۔

(زیرو پوائنٹ 3 جاوید چوہدری)

اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تنزیلہ ریاض "عہد الست" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس ماہ ان کی قسط شامل نہیں ہے۔ اس کے لیے قارئین سے معذرت۔
ان شاء اللہ آئندہ ماہ ہمیں "عہد الست" کی قسط پڑھ سکیں گی۔

خلی کی ڈاڑھی

اسبر گل

حلی کی ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر سلیم کوثر کی یہ خوبصورت غزل آپ سب قاریوں کی نذر۔

یاد کہاں رکھنی ہے، تیرا خواب کہاں رکھنا ہے
دل میں یا پھر آنکھوں میں مہتاب کہاں رکھنا ہے

گھر اور آگن دونوں ہی تقسیم کی مند ہوئے ہیں
تجھے کہاں ٹھہرانا ہے، اسباب کہاں رکھنا ہے

جو کچھ تھا، سب بانٹ دیا ہے، جو ہے تمہارے جاؤ
سو دو زیاں کا ہم ایسوں نے حساب کہاں رکھنا ہے

وہ کہتا ہے آخری باب عشق مکمل کر لیں
اور میں سوچ رہا ہوں، پہلا باب کہاں رکھنا ہے

حسن کی یکتائی کا بس اتنا احساس ہے مجھ کو
کائناتوں کی ترتیب میں، ایک گلاب کہاں رکھنا ہے

ملیقہ فاطمہ

حلی کی ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔ نظم لکھنے میں امجد اسلام امجد کو جو ملکہ حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور کو حاصل ہو۔ آپ سب کی نذر۔

میں نے ٹھیک کیا ہے تا ۹۰۰

کہتے ہیں جب گھر میں اچانک
ایسی آگ بھڑک اٹھے
جو چشمِ نعلین میں

ہر ایک شے کو اپنی لپیٹ میں لے لے
آگ بجھانا مشکل ہو اور
گھر کا اثاثہ اس سے بچانا ناممکن ... تو
ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے

جو بچتا ہے، وہی بچاؤ
گھر کی سب سے قیمتی چیز ہاتھ میں لو اور
اس سے دودھ نکل جاؤ
میرے دل میں بھی ایسی ہی آگ لگی ہے
میں نے جلدی جلدی آنکھ میں تیرے بچتے خواب
بیسے
تیری یاد کے ٹکڑے جن کر دھیان میں رکھے
وہ اس آگ میں دل کو ملتا چھوڑ کر دودھ نکل آیا ہوں
میں نے ٹھیک کیا ہے نا ...؟

قرۃ العین کیفی

حلی کی ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر عزال آپ سب کے نام۔
بہت فرسودہ لکھے ہیں مجھے اب پیار کے قفقے
علی و علزار کی باتیں، لب و دھار کے قفقے

یہاں سب کے مقدّم میں فقط زخمِ جدائی ہے
سبھی جوئے فلسفے ہیں وصالِ یاد کے قفقے

بھلا عشق و محبت سے کسی کا پیٹ بھر لے
سنو تم کو سُنا تا ہوں میں کار و بار کے قفقے

میرے احباب کہتے ہیں یہی اک عیب مجھ میں
سیرِ دیوار لکھتا ہوں، پس دیوار کے قفقے

میں اکثر اس لیے جا کر لوگوں سے خود نہیں ملتا
وہی بیکار کی باتیں، وہی بیکار کے قفقے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



اُمّ عسید، روینہ عتیق _____ کبر والا
بارش ہوئی تو پھولوں کے تن جاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے
بادل کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند وہالا فخر خاک ہو گئے

نمرہ کشور _____ میلیسی
اور کچھ روز یہ چہرہ ہے، یہ آنکھیں ہیں، یہ خواب
اور کچھ روز رہے گا یہ تماشا ہم سے
صائمہ جیمی _____ کراچی

تیرے روز و شب کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں دن ہے نہ رات
فروا، ثانیہ یعقوب _____ کبر والا
لڑکیوں کے دکھ عجب ہوتے ہیں سکھ اس سے عجیب
ہنسی جاتی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ
حناسلم احوان _____ آخون باندی
میرے چارہ گر کو نید ہو صف دشمنان کو خبر کرو !
وہ جو قمرن رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکویا
جوڑ کے تو کوہ گراں تھے ہم غوطے تو جاں سے گز گئے
رہ یا رہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا
کنزئی شاہین _____ آملی باندی

کوئی مریج گل سے کہہ دے نہ چلے چل چل کے
وہ نظر بدل گئی ہے، میری زندگی بدل کے
شب ماہ مختصر تھی، مجھے ہائے کیا خبر تھی
کہ طلوع پھر نہ ہو گا میرا ہتاب دہل کے
سونیا حسین _____ قال پور
نہ جانے کس کو پسند آگئی ہے میری آنکھوں کی نمی نے خدا
میں بننا بھی چاہا، تو یہ پلکیں بھیگ جاتی ہیں

فرحت اشرف گمن _____ سید والا
وہی منصف، وہی قاتل، عدالت اس کی وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرف داری بھی ہوتی ہے
شنا عابد _____ نارووال

جو ہم کلام ہو ہم سے، اسی کے ہوتے ہیں
ہم ایک وقت میں ایک آدمی کے ہوتے ہیں
نمرہ، افراد _____ کراچی

کئی جہاں میں خوشی سے گزارنا چاہے
تو بے شمار بہانے خوشی کے ہوتے ہیں
نخبہ اکرم _____ گاؤں گویلی

جمالیات کے پرچے میں آنکھ نو نمبر
فقط شگفتگی و دل کشی کے ہوتے ہیں
شنا عبدالقیوم _____ بنکہ پیٹمہ

یہ کناروں سے کھیلنے والے
دوب جایش تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساعز
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

پاکیزہ ہاشمی _____ بہاول پور

بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہو گا
ہمارے بیچ جو مائل ہے، وہ حقیقت ہے
سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

نازیہ سرور _____ لاہور

مجھے چپ لگی ہے مدد کہتے کہتے
رنگے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا تھا
تھانہ دل زار کا کہتے کہتے



سہر دلِ عزیزِ فنکارہ

صباحِ بخاری سے ملاقات

شاہین رشید

کامیاب فنکارہ ہیں۔
 ”جی صاحت! کیسی ہیں آپ؟“
 ”بالکل ٹھیک ٹھاک، اللہ کا شکر ہے۔“
 ”کیا مصروفیات ہیں آج کل آپ کی؟ کیا انڈر
 پروڈکشن ہیں اور کیا آن ایر ہیں؟“
 ”اس وقت تین ڈرامے ”آن ایر“ ہیں اور تین ہی
 انڈر پروڈکشن ہیں تو مصروفیات تو ڈراموں کے حوالے
 سے ہی ہے۔“
 ”مجھے یاد ہے کہ بہت یگ اتج سے آپ اس فیلڈ
 میں ہیں۔ پہلے آپ ہوسٹ تھیں اور پھر ڈراموں میں
 آئیں۔ اب مزید تفصیلات آپ بتائیں؟“

ہماری فنکارائیں جب ٹل اتج میں آتی ہیں تو
 فیلڈ سے کنار کشی اختیار کرتی ہیں کہ انہیں ماؤں کے
 رول کرنا پسند نہیں ہوتا، مگر اگر عمر کی حقیقت کو تسلیم
 کر لیا جائے تو نہ صرف انسان فیلڈ میں آن رہتا ہے
 بلکہ اس کی عزت و توقیر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔
 صاحت بخاری بہت یگ اتج میں اس فیلڈ میں
 آئیں، اچھا کام کیا۔ اپنے آپ کو منوایا اور پھر یگ اتج
 میں ہی ماں کے رول کرنے لگیں۔ کیونکہ انہیں اس
 میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ کام کو
 اہمیت دیتی ہیں نام کو نہیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں
 کہ ”صاحت بخاری“ کا بہت نام ہے۔ یہ بہت

”اس فیلڈ میں آنے کا شوق تو مجھے بہت یکنگ ایتج سے ہی تھا۔ فیلڈ میں آنے کی اجازت تو پھر بھی مل گئی تھی، مگر ڈراموں میں کام کرنے کی بالکل بھی اجازت نہیں تھی فیلڈ کی طرف سے۔ خیر ڈراموں میں کام کرنے کا شوق تو مجھے بعد میں ہوا البتہ نیوز پڑھنے کا بہت شوق تھا مجھے۔ تو کسی کے ذریعے سے میں ٹی وی گئی نیوز کاسٹرز کے آڈیشن کے لیے، مگر میرا بیڈ لک کہ نیوز کاسٹرز کے لیے ان کے آڈیشن مکمل ہو چکے تھے، لیکن اس وقت کے پی ایم ”اعظم خورشید صاحب اور جی ایم رفق وڑائچ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ تھوڑی لیٹ ہو گئی ہیں، کیونکہ نیوز کاسٹرز کا انتخاب تو ہو چکا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بحیثیت اناؤنسنگ کے

آپ ہمارے یہاں کام کریں تو ہمیں خوشی ہوگی“ تو بس میرا تو یہ حال تھا کہ ”اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں“ تو جب آفر آئی تو میں نے فوراً ”ہاں کر دی۔ یہ بات ہے 1989ء کی۔ بہت اچھا تجربہ رہا اناؤنسمنٹ کا اور تقریباً ایک یا دو ڈھ سال میں نے ٹی وی پر اناؤنسمنٹ کی۔ اسی دوران ”نیلام گھر“ جو کراچی سے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا تھا، وہ لاہور شفٹ ہوا تو میں نے نیلام گھر میں بھی طارق عزیز کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دیے، مگر کچھ مزہ نہیں آیا تو میں نے نیلام گھر چھوڑ دیا اور واپس اناؤنسمنٹ میں آگئی کیونکہ اس فیلڈ کی یا اس شعبے کی کلاس ہی کچھ اور تھی۔“

”کچھ عرصہ آپ غائب بھی رہیں اس فیلڈ سے؟“

”جی ہاں۔ بڑھائی بھی مکمل کر لی تھی، بڑھائی کے لیے کلج کا سلسلہ شروع ہو گیا تو چھوڑنا پڑا مجھے۔ اس دوران پھر ایر لائن جوائن کرنے کا شوق ہوا۔ اس زمانے میں کچھ پرائیویٹ ایر لائنز کا آغاز ہوا تو جابز نکلیں تو میں نے بھی اپلائی کیا تو میرا انتخاب ہو گیا اور کچھ عرصہ اس شوق کو بھی پورا کیا۔ ڈومیسٹک فلائٹ ہوتی تھیں۔ سب سے پہلے ”ہجویری ایر لائن“ کا آغاز ہوا تھا تو اس میں میں نے جاب کی تھی بحیثیت ایر ہو سٹس کے اس کے بعد جسنی بھی پرائیویٹ ایر لائنز

آئیں ان سب میں ہی میں نے کام لیا، کسی میں چھ ماہ، کسی میں سال۔ کسی میں کچھ تو کسی میں پچھ۔ یہ سب ڈومیسٹک تھیں البتہ ”ایروایشیا“ کی فلائٹ ”عمان“ تک گئیں تو میرا سفر بھی انٹرنیشنل اتنا ہی رہا۔“

”فیلڈ کی طرف سے اجازت نہیں تھی، مگر پھر بھی آپ اس فیلڈ میں آئیں تو زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یا سب کچھ سیٹ ہو گیا؟“

”شروع میں والد صاحب کی طرف سے کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن والدہ نے بہت سپورٹ کیا تو امی کی حمایت دیکھ کر والد صاحب بھی مان گئے بس وہ یہ چاہتے تھے کہ باعزت جاب ہونی چاہیے اور اس زمانے میں تو سرپرست پٹالے کر اناؤنسنگ آیا کرتی تھیں تو یہ بات والد صاحب کو اچھی لگی تو پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔“

”ایر ہو سٹس کی جاب کا تجربہ کیسا رہا؟“

”اچھا رہا۔ بڑے شہروں کے مسافر ذرا جذباتی قسم کے ہوتے تھے۔ ایک تو انہیں پیاس بہت لگتی ہے سیٹ پہ بیٹھتے ہی انہیں پانی چاہیے ہوتا تھا تو یہ ذرا مشکل فلائٹ ہوتی تھی۔ کونٹے کے مسافر اتنے معصوم اور اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ کبھی مشکل نہیں ہوتی تھی، کھانا دیتے تھے ہم لوگ تو وہ شکریہ ہی ادا کرتے رہتے تھے اب کافی حد تک چینیج آ گیا ہے، مگر ابھی بھی وہ لوگ جو پہلی بار سفر کرتے ہیں یا نئے نئے مسافر بنتے ہیں جہاز کے، وہ ابھی بھی ایسے ہی ہیں۔“

”کون سی جاب میں زیادہ مزہ آیا۔ ٹی وی کی یا ایر لائن کی؟“

”دونوں میں مزہ آیا، لیکن آپ کو بتاؤں کہ ایک وقت آیا کہ میں فلائی کرنے سے تنگ آگئی، کیونکہ فلائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ کافی پرابلمز شروع ہو جاتی ہیں۔ آکسیجن کا بھی مسئلہ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر بیک پین پرابلم شروع ہو جاتا ہے۔ ٹیک آف کے وقت اور لینڈنگ کے جہاز کی پوزیشن



ایسی ہوتی ہے کہ تکلیف کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گی کہ ایر اسٹاف کو ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو جب میرے ساتھ بھی یہ مسائل شروع ہوئے تو پھر میں نے یہ جاب چھوڑ دی۔ ایر جاب کی وجہ سے زیادہ تر کراچی میں ہی رہنا ہوتا تھا پھر جب یہ جاب چھوڑی تو کراچی لی لی وی کئی۔ اس وقت منزلور قمری بی ایم تھے اور عبدالکریم بلوچ جی ایم تھے۔ پہلے میں نے ان سے فون پر بات کی۔ انہوں نے مجھے فوراً بلایا اور اس وقت کمپیوٹرنگ کا کوئی پروگرام تھا جس کی آخر انہوں نے مجھے دے دی اور اس پروگرام کا نام ”صبح سویرا“ تھا اسی دوران حیدر امام رضوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ڈراموں میں کام کرنے کی آفر دے دی۔ وہ پی لی وی کے لیے ایک بے بنارے تھے جو کہ ”سٹ کام“ تھا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ اسلم

بھٹو کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں طلعت اقبال، صنم اقبال اور میں تھے اور میں نے اپنا ٹیلنٹ دکھانے کے لیے اس پیشکش کو قبول کیا اور پہلے ہی بے کا مجھے اچھا رسپانس ملا تو پھر بس اداکاری کی فیلڈ میں بھی آ گئی۔

”آپ ماشاء اللہ کافی اچھی اور اسمارٹ ہیں اور جس وقت آپ فیلڈ میں آئیں تو کافی خوب صورت تھیں تو خوبصورتی کام آئی یا ٹیلنٹ؟“

”دونوں۔ اور اگر ٹیلنٹ نہ ہو تو خوبصورتی زیادہ دیر تک چلتی نہیں ہے ایک آدھ ڈرامے میں ہی لوگ برداشت کرتے ہیں زیادہ عرصے تک نہیں۔“

”جس وقت آپ فیلڈ میں آئیں اس وقت این ٹی ایم تھا اور پی لی وی اب چینلز کی بھرمار ہے۔ اس وقت اور اب کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟“

”کام کے لحاظ سے پہلے والا وقت زیادہ اچھا تھا کیونکہ ایک پروفیشنل ازم تھا اور آج کے دور میں تو آگے جانے کی دوڑ میں پروفیشنل ازم کو ختم کر چکے ہیں اب صرف چل چلاؤ والا کام ہو رہا ہے۔ ٹیکنیکلی ہم جتنے اسٹونگ ہو رہے ہیں اتنا ہی ہم پروڈکشن میں پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ ایک نمایاں فرق دیکھا

ہے میں نے اس وقت اور اس وقت میں۔ اور اداکاری کا معیار بھی زیادہ گرا ہے۔ اب زیادہ تر پرچی کام کرتی ہے اب جو پروڈکشن ہاؤسز ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی کم سے کم پیسوں میں کام کرنے والا مل جائے مثلاً ”اگر ہزار روپے پروڈے کام کرنے والا مل جائے تو وہ اس سے کام کرنا پسند کریں گے۔ نسبت اس کے جس کو صحیح معنوں میں اداکاری آتی ہوگی اس لیے اداکاری کا معیار بہت گرا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو اپنے ڈراموں کے ساتھ ساتھ انڈین اور ترکش ڈرامے ہر چینل پر نظر آ رہے ہوتے ہیں۔“

”اب تو غیر ملکی ڈرامے دیکھنے کا رجحان کم ہو گیا ہے کیا خیال ہے؟“

”رجحان کم ہوا ہے۔ ڈرامے کم نہیں ہوئے ہیں شاید ہمارے یہاں اتنا کام نہیں ہو رہا۔ یا ہم شاید چینلز کا پیٹ نہیں بھرا رہے یا پھر شاید ان کو مہنگا پڑتا

ہے جس کی وجہ سے انڈین ڈرامے اور انڈین پروگرام اور ترکش ڈرامے زیادہ چلانے شروع کر دیے ہیں۔

محشیت ایک سینئر آرٹسٹ کے آپ ان معاملات میں بولتی ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے؟

”انڈین ڈراموں کے لیے میں ضرور کہوں گی کہ وہ ہمارے یہاں نہیں چلنے چاہئیں۔ میں اس کے خلاف ہوں اور گلیمو کے حساب سے دیکھا جائے تو ترکش بھی نہیں چلنے چاہئیں، لیکن چونکہ ڈراموں میں ڈنگ ہوتی ہے تو نہ صرف ٹیلنٹ سامنے آتا ہے بلکہ لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے اور اچھے چینلز نے اچھے ڈرامے چلانے کے لیے اچھے آرٹسٹوں کو محشیت ڈنگ آرٹسٹ کے لینا شروع کر دیا اور خوش قسمتی سے میں بھی اس میں شامل ہوں۔ تو کلچر کو دیکھتے ہوئے ہم تھوڑا اعتراض کر سکتے ہیں مگر ویسے نہیں۔ اور انڈین کے لیے یہ اعتراض ہے کہ جب وہ ہمارے ڈرامے نہیں چلاتے تو ہم ان کے ڈرامے کیوں چلاتے ہیں۔ ہم تو انڈیا سے اتنے زیادہ متاثر ہیں کہ ان کے بغیر ہمارا سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے جتنے بھی شو بزمیگزین ہوتے ہیں ان میں ہم اپنے کسی آرٹسٹ کے بارے میں نہیں بتا رہے ہوتے بلکہ کترینہ کیف، سیف علی خان اور دیگر کے بارے میں بتا رہے ہوتے ہیں کہ آج ان کی سالگرہ ہے تو آج یہ ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ — پاکستانی آرٹسٹ یا ماڈل کی سالگرہ کی کوئی نیوز کسی چینل نے چلائی ہو۔“

”کافی بنگ آج سے آپ نے ماں کے رول کرنا شروع کر دیے کیوں؟“

”کیوں؟۔ ہاں یہ ایک اچھا سوال ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ آپ جو ہیں وہ نظر آرہے ہیں اسکرین پہ تو کیا حرج ہے اداکاری تو آپ نے کرنی ہی ہے تو ضروری نہیں کہ ہیروئن بن کر ہی آپ اداکاری کریں۔ آپ مختلف رولز میں ناظرین کو اپنی صلاحیتیں دکھائیں تو زیادہ بہتر ہے۔“

”آپ نے ماڈرن ماں کے اور مسرتی ماں کے رول بھی کئے ہیں مگر گیٹ اپ والے رول جیسے ہماری

دیگر فنکارائیں کرتی ہیں آپ نے نہیں کیے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔“

”میں گیٹ اپ والے رول کرنا چاہتی ہوں اور مجھے پسند بھی بہت ہیں، مگر کیا کریں کہ ہمارے یہاں جب کسی پہ کسی کردار کی چھاپ لگ جاتی ہے تو پھر ڈائریکٹرز حضرات کوئی اور کام لیتے ہی نہیں ہیں۔ اور چونکہ میں نے ہمیشہ بہت ہی ڈیفنٹ ماڈرن اور خوشحال گھرانے کی ماں کے رول کیے ہیں تو شاید سامنے والا سمجھتا ہے کہ یہ اس ٹائپ کے رول کر سکتی ہیں۔ اس لیے مجھے گیٹ اپ والے رولز آفرز نہیں ہوتے۔ میرے اندر بہت وراثتی ہے اور میں ہر طرح کے رول کرنا چاہوں گی۔“

”آپ نے کبھی اظہار کیا؟“

”ہاں ایک دو بلوز فرینڈز کے ساتھ اظہار کیا، مگر ہر ایک کے ساتھ تو نہیں۔ سب کے ذہن میں یہ ہے کہ صباحت ایک ہی طرح کے کرداروں میں صحیح لگتی ہے۔ یا شاید آزمانا نہیں چاہتے۔“

”کیا ڈراموں کے موضوعات شرم نہیں گئے؟ لڑکیاں روئے جا رہی ہوتی ہیں۔“

”جی۔ بالکل ایسا ہے۔ ہمارے یہاں عورت کو اتنا زیادہ مظلوم دکھایا جاتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ اس ملک میں عورت پر بہت ظلم ہو رہا ہے اور بے شک ظلم ہو بھی رہا ہے، مگر وہ سری سائیڈ پہ لڑکیاں بہت زیادہ پڑھ لکھ بھی رہی ہیں اور بہت بڑے بڑے کام بھی کر رہی ہیں، مگر اس سائیڈ کو نہیں دکھایا جاتا۔ اور ہماری بات سنی ہوئی اس سلسلے میں تو بتایا گیا کہ جو اسپانسر کرتے ہیں جو مارکیٹنگ کرتے ہیں ان کی یہ ڈیمانڈ ہے کہ آپ رونی ہوئی عورت دکھائیں، جتنا زیادہ ظلم دکھائیں گے اتنا ہی لوگ دیکھیں گے۔ اتنا ہی ریٹنگ میں اضافہ ہو گا۔ یہ عجیب سی سوچ ہے جسے چیلنج نہیں کر سکتے۔“

”سینئر بھی نرم ہو گیا ہے۔“

”بالکل ہو گیا ہے اور اس پر بھی بات ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسے سین ہوتے ہیں جو آپ نہیں کرنا چاہ رہیں تو اگر ڈائریکٹر اچھا ہے اور آپ کی بات سنتا ہے تو

ہیں۔ یعنی ایک بہن اور ایک ہی بھائی۔ کوئی اس فیلڈ میں نہیں ہے۔ دونوں جاب کرتے ہیں۔“
 ”اور یہ بھی کہتے ہوں گے کہ آپ زیادہ اچھا کماتی ہیں، ہم جاب والے تو اتنا نہیں کماتے؟“
 ہنستے ہوئے۔ ”ہاں ہاں۔ بالکل ایسا کہتے ہیں، مگر میں سمجھتی ہوں کہ ہر کوئی اپنی اپنی فیلڈ میں ماسٹر ہوتا ہے اور سب کو اپنے اپنے نصیب سے ملتا ہے۔“
 ”شادی ہوئی۔“

”جی شادی ہوئی، میری پسند سے ہوئی۔ ایک بیٹا ہے اور ماشاء اللہ سے گیارہ سال کا ہے۔“
 ”گھر داری؟“

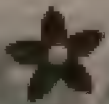
”گھر داری کا اور کوئی شوق ہے۔ میرے بیٹے کو کچھ چیزیں میرے ہاتھ کی پکی ہوئی پسند ہیں تو وہ فرمائش کرتا رہتا ہے۔“
 ”لوگ ملتے ہیں تو کس طرح؟“

”بہت پیار سے ملتے ہیں، بہت تعریف کرتے ہیں۔ بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں، بہت عزت کرتے ہیں۔ اور یہی ہمارا فیڈ بیک ہوتا ہے کہ ہم کہیں جاتے ہیں اور لوگ ہمیں پہچانتے ہیں اور میں تو اس وقت اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں۔“
 ”میاں صاحب کو تو نہیں پہچانتے ہوں گے نہ بیٹے کو؟“

”جی۔ مگر میرے میاں صاحب اور میرا بیٹا بہت خوش ہوتے ہیں، میری شہرت اور عزت دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ لوگ سیلفی بنوا رہے ہوتے ہیں۔“
 ”بیٹے کو شوق ہے۔“

”بیٹے کو شوق تھا اور اس نے ڈرامہ سیریل ”میرا سائیں“ میں کام کیا بھی تھا، لیکن پھر اس نے توبہ کر لی کہ میں نہ اتنا انتظار کر سکتا ہوں اور نہ ہی وقت ضائع کر سکتا ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صابحت بخاری سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔



آپ سے تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔“
 یہ بتائیں کہ آج کل کون زیادہ اچھا لکھ رہا ہے، مرد رائٹرز یا خواتین رائٹرز؟“

”خواتین رائٹرز ہی زیادہ لکھ رہی ہیں۔ اور اچھا لکھ رہی ہیں، مگر اتنا زیادہ اچھا بھی نہیں لکھ رہیں۔ ہمیں آج کل جو اسکرپٹ نظر آ رہے ہیں ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس کو پڑھ کر کہیں کہ واہ واہ۔ کیا بات ہے۔ اور اب تو اتنے لمبے لمبے ڈانٹلاگ ہوتے ہیں کہ ماں کا سین ہو یا کسی کا بھی بس وہ بولتے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں سمجھ آتی کہ رائٹر کیا سوچ کر اتنے لمبے لمبے ڈانٹلاگ لکھتے ہیں۔ اب لوگوں کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے کہ لمبے ڈانٹلاگز کو برداشت کریں۔“

”اب تو یہ حال ہے کہ ایک اینٹ اٹھاؤ تو رائٹرز ڈائریکٹرز اور آرٹسٹوں کا اتنا ہار نکل آتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے“ اب تو میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ وہ رائٹر بھی خود ہیں اور ڈائریکٹر بھی خود ہیں۔ اور سارا کچھ خود ہی ہوتے ہیں۔“
 ”آپ نے وائس اور بھی کی، ماڈلنگ بھی کی۔ آج کل کافی فلمیں بن رہی ہیں ہمارے ملک میں۔ اور بچل بھی اور ری مکس بھی۔ آپ کو آفرز آئیں۔“
 ”نہیں جی۔ فلم ابھی تک نہیں کی۔ دو فلموں کے لیے مجھے کہا گیا تھا لیکن پھر بتا نہیں کیا ہوا کہ دوبارہ نہیں کہا۔ ہمارے یہاں تو فلم کی آفر کرتے ہیں تو اس طرح کہ دھوپ میں پکوڑے مل لو ان کے بجٹ ہی ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ کام کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا۔“

”جی جناب فیلڈ کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں۔ اب کچھ اپنے بارے میں اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟“

”لاہور سے میرا تعلق ہے، پنجابی ہوں، لاہور میں ہی پیدا ہوئی اور ساری تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ انجوائنٹمن کی 25 اکتوبر کو پیدا ہوئی۔ والا صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسی حیات ہیں۔ ہم تین بہن بھائی

ج۔ پیاری کہکشاں! معذرت خواہ ہیں کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آج خواتین ڈائجسٹ کا جو معیار ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری قارئین ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور پسندیدگی کی وجہ سے ہی خواتین ڈائجسٹ اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اچھی مصنفین کے ساتھ باذوق قارئین بھی ملی ہیں۔ جو اچھی تحریروں کو سراہتی ہیں اور اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

رضوانہ شکیل تنولی۔ سیالکوٹ

مجھے خط لکھنے پر مجبور نمبر احمد کے مکمل ناول ”نمل“ نے کیا۔ نمبر احمد تم کس طرح اتنے پیارے پیارے ناول لکھ لیتی ہو۔ اللہ تمہیں نظریہ سے بچائے ”آئین“ دوسرا ناول عفت سحر طاہر کا ”بن مانگی دعا“ بہت زبردست جا رہا ہے۔

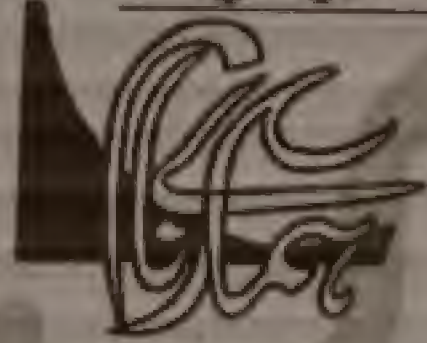
ج۔ پیاری رضوانہ! آپ نے دس سال کی خاموشی توڑ کر ہمیں خط لکھا، بہت شکریہ۔ نمبر اور عفت سحر طاہر تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

غزالہ ایمان۔ ملکانی شریف

مت پوچھیے کہ کتنی مشکلوں کے بعد میں یہ خط لکھ رہی ہوں سب سے مشکل مرحلہ تو بھائی سے لغافہ منگوانا تھا۔ میں خواتین اور شعاع کی تب سے قاری ہوں جب چار سال پہلے ناول ”پیر کامل“ پڑھا تھا۔ ”نمل“ میں مجھے حنین یوسف اور سعدی یوسف کے کردار بہت زبردست لگتے ہیں اور ہاشم پر بہت غصہ آتا ہے ویسے عجیب بات نہیں ہے نہ ہی سعدی کی کوئی ہیروئن ہے اور نہ ہی حنین کا کوئی ہیرو، اور نہ ہی ہاشم کی کسی ہیروئن کا وجود جس طرح نیپیکل اسٹوریوں میں ہوتا ہے۔ مجھے اس طرح کے ناول جیسے نمل بہت پسند ہیں اور تنزیلہ آبی آپ جب بھی لکھتی ہیں نہایت شاندار لکھتی ہیں۔ بہت سے ایسے سوال جن کا ہمیں پہلے نہیں پتا تھا۔ اب پتا چل رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ نیپو کی شادی ڈاکٹر زارا سے ہو جائے گی اور عمیرہ آبی آپ سے کہنا چاہوں گی کہ ”آب حیات“ پیر کامل سے اتنا مختلف کیوں ہے۔ ویسے سالار اور امامہ کی نوک جھونک



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

کہکشاں، رمان۔ کویت

اب آپ کو خط لکھنے کی وجہ بتاتے ہیں کہ پرچے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اپنے پسندیدہ ناول جو کہ سلسلے وار ناولز ہیں ان کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ ”نمل“ بہت خوب صورت ناول ہے جو بہت دنوں تک دماغ میں رہے گا۔ نمبر کی کہانی ہمیشہ لاجواب ہوتی ہے اور میری بہن اور مجھے ”سعدی“ کا کردار بہت پسند ہے۔ حنین کی حاضر جوالی بہت بھاتی ہے۔ پھپھو اور بھتیجیوں کا پیار دیکھ بہت خوشی ہوتی ہے یہ ہمارا موسٹ فیورٹ ناول اس کے علاوہ عمیرہ جی بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ ”پیر کامل“ کا سیکوئل ”آب حیات“ گھونٹ گھونٹ پی رہے ہیں۔ سالار کا کردار بہت اچھا ہے۔ بہت مزہ آرہا ہے۔ آبی خواتین ڈائجسٹ اور آل بہت زبردست ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا معیار گر رہا ہے تو ہم ان کی بات سے بالکل متفق نہیں ہیں۔

بہت مزہ دیتی تے اور ہاں آسیہ رزاقی جی کے کالم "میرے استاد" نے ان کی کمی کو پورا کر دیا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ہم بھی ایسے ادیب خاندان کی پیداوار ہوتے تو کیا بات تھی۔ آپ کو پتا ہے، میری امی ڈائجسٹ پڑھنے پر بہت ڈانٹ سنا تی ہیں بھلے فارغ وقت میں کیوں نہ پڑھوں۔ ڈیر عائشہ میں نے آپ کے لیے بہت دعا کی ان شاء اللہ آپ جلد صحت و مالک ہو جائیں گی۔ اور امبر گل میں آپ کا بہت تھینکس کرنا چاہتی ہوں میں یہ بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ عمیرہ آلی کاناول "دربار دل" کب اور کس شمارے میں شائع ہوا تھا پلیز بتا دیجیے گا۔

ج۔ پیاری غزالہ! آپ نے اتنی دشواریوں سے گزر کر ہمیں خط لکھا تو ہم شائع کیوں نہیں کریں گے۔ آپ کی امی سے ہم درخواست کریں گے کہ وہ آپ کو پڑھنے سے منع نہیں کریں۔ مطالعہ کرنے سے ذہن کو جلا ملتی ہے۔ ہم اپنے بچوں میں کوئی بھی ایسی بات شائع نہیں کرتے جو زنانوں کو بگاڑنے کا سبب بنے یا لڑکیوں کو غلط راہ دکھائے۔ "دربار دل" کب شائع ہوا تھا، ہمیں یاد نہیں اگر کسی قاری بہن کو یاد ہوا اور اس نے ہمیں خط لکھا تو ہم شائع کر دیں گے۔

عائشہ جمیل۔ بلدیہ ٹاؤن، کراچی

مصطفین سے سروے میں "اقبال بانو" سارہ رضا اور عمیرہ حمید کے جوابات پڑھ کر بہت مزا آیا۔ (آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے اسے مستقل سلسلہ بنادیا) "لو کی بہار" میں تلے ہوئے لو کی کے چھلکے یہ دُش کچھ عجیب سی ہی لگی اور لو کی کا بالکل ایسا ہی مزے دار سارا نسخہ میری امی جی بھی بناتی ہیں۔ آپ کے باورچی خانے میں جھانکا تو محترمہ حرا قریشی براجمان تھیں۔ مذاق رات کے ڈی جے محسن عباس سے تفصیلی ملاقات خوب رہی۔ ایمن خان کی باتیں بھی اچھی لگیں۔ خاتون کی ڈائری سے بیچہ رضوان کا انتخاب پسند آیا۔ میری بیاض میں شاعرا عبد کا شعر اچھا لگا۔ نظم اور غزلیں بھی اچھی تھیں۔ کرن کرن روشنی کا سلسلہ چاند کی طرح چمکتا ہوا لگا۔ عمیرہ احمد کا "آب حیات" زبردست ناول ہے۔ امامہ (سلی گرل) کو تھوڑا سا عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔ نمبر احمد کا "مکمل" بہت اچھا ناول ہے۔ جس میں حسین کا کردار اچھا لگتا ہے، مگر یہ (موٹو) کیا کر بیٹھی؟ جواہرات کا کردار ویسے بھی پسند نہ تھا۔ اوپر سے ایک اور نا

کارنامہ۔۔۔ بے شک ماں بن کر اپنے بچوں کے لیے کیا، مگر وہ جو سعدی کو کہانی سنار ہی تھی تو انہیں اپنا آپ کتنا مظلوم لگ رہا تھا، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ جانور بے زبان ہیں۔ عقل و شعور سے بے گالی مخلوق بے شک وہ ماں بھی مگر تھیں تو باشعور انسان۔

عبدالست (تنزیلہ ریاض) اور بن مانگی دعا (عفت سحر طاہر) کاناول بھی بہت ہی زبردست ہیں بہت ہی اعلا۔ آئینہ نعیمہ ناز کا سبق آموز ناول تھا۔ پر خار راستوں پر بہار (فاخرہ جبین) نے بھی اچھا لکھا۔ انسانوں میں سب ہی افسانے اچھے تھے، مگر بدگمان اور ابرگریزاں یہ دونوں زیادہ پسند آئے۔

ج۔ پیاری عائشہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حمیرا قریشی۔ حیدر آباد

کئی سالوں سے رسالہ پڑھتی ہوں اس کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ بن مانگی دعا بیسٹ ہے۔ تمام رائٹرز بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ خواتین میں اپنے نام کی جگہ دیکھنے کی حسرت حسرت ہی رہ جائے گی۔ میں نے کہانی اور اشعار پوسٹ کئے تھے، مگر کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ج۔ پیاری حمیرا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

نازش خان۔ کراچی

میں 9th کلاس سے خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں اور اب تو ایم اے (I.R) کر چکی ہوں اور درس تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود میں کبھی خواتین ڈائجسٹ پڑھنا مس نہیں کرتی، بلکہ اکثر فارغ اوقات ملنے پر اپنے پاس موجود پرانے خواتین رسالے دوبارہ پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں اور خواتین ڈائجسٹ تو میرے لیے نایاب ہے جس نے مجھے زندگی کے مختلف امتحانوں میں نہ صرف بہتر اور صحیح فیصلے کرنے کی قوت اور ہمت دی، بلکہ شعور و آگہی سے بھی روشناس کرایا۔

ج۔ بہت شکریہ نازش! آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

مد نظر رکھ کر لکھتی ہیں۔ آپ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ پہلے پورا ناول پڑھ لیں پھر فیصلہ کریں۔

سدرہ حیات۔ انگ

عمیرہ احمد کے آب حیات کی پہلی قسط پڑھتے ہوئے ہر سین میں گمان ہوتا کہ یہ امامہ اور سالار تو نہیں اور دل چاہتا یہ ان دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔ امامہ اور سالار کی زندگیوں کو کون سا نیا موڑ ملنے والا ہے؟ یہ تو عمیرہ احمد ہی جانتی ہیں۔ نمرہ احمد کی ہر تحریر پچھلی سے زیادہ دل چھو لینے والی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی کہانی میں جو سسپنس پھیلاتی ہیں۔ ان کی گڑبڑوں کو بہت احتیاط سے کھولتی ہیں۔ نمرہ بخاری صاحبہ سے گزارش ہے کہ ”ہم سے ہے زمانہ“ باقاعدگی سے لکھیں اور ایک شکایت جو مجھے اپنی رائٹرز سے ہے جس نے مجھے خط لکھنے پر مائل کیا وہ ہیروئینوں سے منسلک ہے۔ آخر ہیروئین ہر دوسرے سین میں ہیرو کے کندھے سے کیوں لگ جاتی ہے جبکہ ہیرو سے اس کا کوئی محرم رشتہ نہیں ہوتا۔ میری تمام رائٹرز سے گزارش ہے کہ ہیروز کو بلاوجہ کے ہاتھ پکڑنے کی عادت پر سخت سزا دی جائے اور ہیروئین کے بلکتے ہوئے وجود کو کسی اور کا سہارا دیا جائے۔

ج۔ سدرہ! ہم ہر ممکن احتیاط رکھتے ہیں کہ ہیرو اور ہیروئین کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا جائے پھر بھی اگر کہیں غلطی ہو جاتی ہے تو اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ آئندہ مزید احتیاط رکھیں گے۔

زوباریہ خالد۔ لاہور

رنگارنگ ٹائٹل بہت زیادہ پسند آیا۔ ”آب حیات“ کی قسط پڑھ کر ہمیشہ کی طرح مزا آیا۔ اگلی قسط کاشدیت سے انتظار تھا۔ ”نمل“ میں ”نمرہ احمد“ ماضی کے ہریاب کو بہت اچھے طریقے سے واضح کر رہی ہیں۔ اس بار حال کا کوئی سین ہی نہیں تھا۔ فاترہ افتخار کو کہیں کہ وہ ہمارے لیے کوئی سلسلے وار ناول لکھیں۔ اس بار اتنے کم خطوط؟ یہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آئندہ اجالا، شاعبد اور نادیہ جہانگیر کے اشعار پسند آئے۔

ج۔ زوباریہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ فاترہ افتخار تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ عمیرہ جی کا ناول ”آب حیات“ ہے اس ماہ کی قسط بہت ہی زبردست تھی۔ جب سالار نے امامہ کو ڈانٹا تو بہت ہی مزا آیا۔ اس کے بعد نمرہ جی کا ناول ”نمل“ بہت ہی زبردست جا رہا ہے۔ جواہرات کو اس کی بڑی سزا ملنی چاہیے نمرہ جی۔ جنین کا پڑھ کر ہم تو شک میں رہ گئے۔ نمرہ جی آپ ”نمل“ بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔ عفت جی کا ”بن ماگلی دعا“ ناول بھی مجھے بہت پسند ہے۔

ج۔ پیاری نایاب! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

زارا محفوظ۔ راولپنڈی، چکالہ ایر پورٹ

10 اپریل کی اس اداس صبح مجھے یہ خط لکھتے ہوئے خوشی اور افسوس دونوں نے خوشی اس لیے کہ آج تقریباً 20 سال میں ’میں پہلی دفعہ آپ سے مخاطب ہوں‘ چھٹی کلاس میں تھی جب شعاع پڑھنا شروع کیا اس وقت خوب صورت ترین ناول ماہا جی کا جو چلے تو جاں سے گزر گئے چھپتا تھا پھر رفعت سراج دل دیا دلیز کے ساتھ آئیں پھر جیس سسٹرز اور پھر ان کے بعد عمیرہ جی اپنے پہلے ناول جہاں تک میری معلومات ہے کے مطابق وہ جواگ صبح کا تارا ہے اور ہمیں سے ہمارے پسندیدہ ترین رائٹرز میں شمار ہونے لگیں اور موسٹ فیورٹ (پیر کامل) تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا کہ ہم کہتے تھے کہ کاش سارا ڈائجسٹ ہی عمیرہ جی کے ناول سے مزین ہو مگر پھر ایک لمبی خاموشی اور جب یہ خاموشی ٹوٹی تو پتا چلا کہ یہ ہماری عمیرہ نہیں ہیں یہ تو کوئی اور ہے۔ امامہ بھی بدل گئی ہے۔

ج۔ پیاری زار! عمیرہ احمد کی خواتین ڈائجسٹ میں پہلی تحریر ”میری ذات ذرہ بے نشان“ تھی جو اکتوبر 99ء میں شائع ہوئی۔

آپ نے آب حیات اور امامہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے آپ کے بہت سے سوالات کے جوابات تو اس قسط میں ہی آپ گول جائیں گے۔

عمیرہ احمد کی تحریروں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں کچھ بھی بلا جواز نہیں ہوتا وہ بہت مدلل انداز میں لکھتی ہیں اور انسانی فطرت کے تمام پہلو

ماریہ صدیق، سیکرٹری شاہین۔ جام پور

چار سال سے "خواتین ڈائجسٹ" مستقل طور پر زیر مطالعہ ہے، لیکن شمارہ وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے یہ مشکل ہے کہ رواں ماہ شائع ہونے والے ناولوں پر کوئی خصوصی تبصرہ کر سکوں۔ تمام ناولز خوب ہوتے ہیں کیونکہ کچھ مصنفین بہت مضبوط پلاٹ پیش کرتی ہیں تو کچھ اعلا وارفع خیالات کو خوب صورت لفظوں کا پیراہن پہنا کر قارئین کو مبسوت کر دیتی ہیں، لیکن جس ناول کو پڑھ کر یہ خیال ذہن میں گوندا کہ مصنف دنیا کی ذہین ترین مخلوق ہیں، وہ بشری سعید کا ناول "سفال گر" تھا۔ مشرقی و مغربی تہذیب کو بے حد متاثر کن انداز میں بیان کیا۔ صوفیہ بشیر کا ناول "توبہ" اچھی تحریر تھی۔ "مصحف" ناول میں گو کہ پلاٹ کی وہ

مضبوطی نظر نہ آئی جو نمرہ احمد کا خاصہ ہے، لیکن بہت شاندار تحریر تھی۔ عنیزہ سید نے "جور کے ٹوکہ گراں تھے ہم" میں بڑے اچھوتے انداز میں چھوٹے بڑے واقعات "الفاظ" حتی کہ جذبات کو بھی ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ نگت سیما بڑی تحقیق کے بعد قلم اٹھاتی ہیں۔ "نہل" کے "آنسو" کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں۔ کبھی یہ ناول تاریخ کی کتاب، کبھی انسانی نفسیات کا مضمون، تو کبھی آج کے صحافی اور مختلف روگراموں کے میزبانوں کے نقاب کو چیدہ چیدہ کرنے کا نثر لکھتا ہے، لیکن اس ناول کا اختتام بڑے ہنگامی انداز میں ہوا۔

"عبدالست" تنزیلہ ریاض کا شاہکار، جس کا ہر لفظ مجھے اپنے سحر میں جکڑتا ہے۔ "Longinus" کہتا ہے: is an echo of soul.

"Sublimity

تو بلاشبہ تنزیلہ ریاض کا یہ تخلیقی کام اپنی مصنفہ کی اعلا وارفع ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ نمرہ احمد بہت اچھے انداز میں "تمل" کے تمام کرداروں کو بیان کر رہی ہیں۔ کہانی کے علاوہ اشعار کا چناؤ بہت خوب ہوتا ہے۔ "سحر عترت" ایک نیا موضوع تھا۔ سائرہ رضا کے ناول زندگی کے نئے رخ سے روشناس کراتے ہیں۔ ج۔ ماریہ اور سیکرٹری! آپ نے جن کہانیوں کا ذکر کیا۔ وہ واقعی بہترین کہلانے کی مستحق ہیں اور ہمیشہ یاد رہنے والی ہیں۔

ایک مصنف کے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے

کہ اس کی تحریریں قارئین کے ذہنوں میں اس طرح محفوظ ہو جائیں کہ وقت ان کو دھندلانہ سکے۔

اقصی شرافت۔ ہارون آباد

واہ واہ! کیا کہنے۔۔۔ خواتین ڈائجسٹ ایک زبردست اور نامور رسالہ ہے۔ ہر کہانی میں ایک منفرد رنگ ہوتا ہے۔ آج کل بن مانگی دعا بہت زبردست ہے۔ نمرہ جی آپ تو کیا خوب لکھتی ہیں۔ بہت خوب صورت انداز ہے آپ کا۔ عمیرہ جی آپ کے تو کیا کہنے۔ لیکن پلیز عمیرہ جی اب "آپ حیات" میں سالار اور امامہ کو الگ الگ مت کیجئے گا اور نہ ہی کسی کو مارے گا۔

ج۔ بہت شکریہ اقصی! آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔

سمیرا خان۔ ملتان

سرورق اچھا تھا۔ سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" اس سلسلے میں بنیادی مسائل پر روشنی ڈالیں وضو۔ غسل۔ وغیرہ اور عورتوں کے بارے میں کچھ مخصوص مسائل اس لیے کہ خواتین تو ہے ہی عورتوں کا رسالہ۔

آپ حیات پڑھا بہت لطف آیا۔ خطوط پڑھے۔ عمیرہ جی کی تو کیا ہی بات ہے انہوں نے حقیقت کا رنگ دے کر کہانی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

ج۔ بہت شکریہ سمیرا! عمیرہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

افشاں شہزاد۔ کراچی

اقبال بانو، سائرہ رضا اور سمیرا حمیر جی کے جوابات پڑھے۔ ایمین خان سے ملاقات بھی مزے دار تھی۔ حسن عباس سے مل کر بھی اچھا لگا۔ افسانے چاروں ہی زبردست تھے۔ خاص کر بدگمان، تمثیلہ زاہد اور ایسا بھی ہوتا ہے، سعدیہ ملک زیادہ پسند آئے۔ ناولٹ فاخرہ جبیں صاحبہ کا رخسار راستوں پر بہار تھا، جو کہ ایک معصوم لڑکی کی کہانی تھی۔ کردار نگاری، جملہ، بہت سب ہی کچھ لا جواب رہا۔ یہی حال کچھ آئینہ کے بارے میں بھی۔ زبردست۔ باقی قسط وار ناولز کی تو کیا بات ہے۔ جیسے لکھنے والے نام ہیں ویسے ہی ناول بھی۔

ج: پیاری افشاں! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔
افسانہ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ خواتین کی
پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نمرہ احمد ش۔ چوکی

نعیمہ ناز کا آئینہ بہت اچھی تحریر رہی۔ عفت سحر طاہر کا
”بن مانگی دعا“ بیسٹ جارہا ہے۔ ایسا، معییز اور عون
دونوں پیارے پیارے کردار ہیں۔

فاخرہ حبیب مانیہ + ریان جہانگیر بڑا اچھا لگا۔

نئے منے افسانے ابرگر ہزاں + چابی دونوں بہت با مقصد
رہے۔

عمیرہ احمد، آب حیات میں دیکھے سالار کے ساتھ کیا
کریں۔ سالار کا امتحان تو امامہ بنے گی ہی، دکھائی دے رہا
ہے! اور امامہ کا امتحان لگتا ہے سالار کے بعد اشارت

ہوگا۔ میری بیاض سے گزیا شاہ نے بڑا پیارا شعر لکھا۔

کل کی طرح بلند ہیں سب حوصلے میرے

کشتی بھنور میں آتی ہے کردار تو نہیں

اس کے علاوہ ہمارے نام فیورٹ سلسلوں میں سے
خطوط پڑھنا، لکھنا، تبصرے بڑا لطف آتا ہے۔ اللہ کرے
رو نقیسی اسی طرح دوبالا رہیں۔ رنگا رنگ پھول میں سب
ہی پھول اچھے لگتے ہیں۔

ج: پیاری نمرہ! کیاں تھیں آپ؟ کافی دن بعد خط لکھا
آپ نے؟ خیریت تھی نا؟ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ
مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

آمنہ حسین۔ شہدادپور

آپ کے کہنے پر نمل کی اب تک کی اقساط ایک ساتھ
پڑھیں۔ واقعی بہت اچھا ناول ہے۔ اب میں ہر ماہ اسے
باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔

ج: شکریہ آئینہ! ناول قسط دار پڑھنے اور ہر ماہ انتظار کا اپنا
مزہ ہے، آپ کی تعریف نمرہ احمد تک پہنچا رہے ہیں۔

پاکیزہ ہاشمی۔ بھاولپور

دل بہت ادا اس ہے اور اس اداسی میں اضافہ ”آب
حیات“ کی اس لائن نے کیا۔ ”جو مقدر میں نہیں ہوتا وہ
ایڑی کا کٹا بن جاتا ہے۔“ پتا نہیں ہمارے لفظ اس قابل
نہیں رہے کہ خواتین کی زینت بنے؟ آئینہ بہت اچھی

تحریر تھی۔ پلیز ہند بھنڈی کی ترتیب بتادیں۔

ج: آپ کے الفاظ کس قابل ہیں، یہ ہم آپ کو کیا
بتائیں؟ آپ کے الفاظ ہمارے دل میں جگہ پاتے ہیں۔
صفحات البتہ محدود ہیں۔ شامل نہیں کر پائے۔ آپ اسے
ہماری مجبوری سمجھیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

جس دن اپریل کا شمارہ ہاتھ میں آیا، اسی دن مجھے چاب
کی آخر ہوئی، کچھ کر دکھانے کا جنون مجھ میں خواتین
ڈائجسٹ کے توسط سے ہی آیا۔ دسمبر 2015 میں کنیر
نور علی کے افسانے ”اندر کی آواز“ نے مجھے بہت زیادہ
انسپائر کیا۔ اس کا جملہ ”راستہ اگر ڈھونڈنے سے نہ ملے تو
خود بنا پڑتا ہے۔“ خاص طور پر سالگرہ نمبر کے سروے میں
سمیرا حمید کی باتوں نے بھی بہت زیادہ متاثر کیا۔ ”ہمارے
والدین نے ہمیں گھر، غذا، بنیادی تعلیم دے دی ہے، ان پر
بوجھ نہ ڈالیں، اپنی خواہشات کے لیے اپنے دماغ اور ہاتھ
پیروں کا استعمال کریں، ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے ہونے کا
حق ادا کریں۔“ تب سے میری یہ بڑی خواہش تھی کہ میں
اپنی صلاحیت اور ہنر کو کسی کام لاسکوں۔

”آب حیات“ کی یہ قسط کافی ڈپرنگ تھی۔ سالار کا
امامہ کے ساتھ جلال کو لے کر جھگڑا کرنا اور جذباتی ہونا کچھ
غلط بھی نہیں تھا۔ جلال سے ملنے کے بعد بھی امامہ کی
غائب دماغی کی وجہ سے ویڈنگ رنگ کو ہی واش روم میں
بھول کر جانا سالار کے لیے کیسے قابل برداشت ہو سکتا تھا۔
”بن مانگی دعا“ کی یہ قسط نارمل رہی۔ کل بہت ہی پُر تجسس

تحریر ہے، کب کیا ہو جائے، کچھ بھی اندازہ کرنا بہت ہی
مشکل ہے۔ نمرہ نے اور رنگ زیب کے قتل کی پجویشن کی
منظر نگاری بہت زبردست کی ہے۔ ”آئینہ“ نعیمہ جی بہت
ہی کمال کی تحریر لکھی، بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ اس
جملے نے بہت ہی متاثر کیا۔ اڑان اتنی ہی اونچی بھرنی
چاہیے جتنا پیروں میں دم ہو، اپنی اوقات سے زیادہ اڑنے
میں انسان تھک ہار کر نیچے ہی آن گرتا ہے۔

”عمد الست“ کی یہ قسط روح کو جھنجھوڑنے والی تھی۔
سفید فام لڑکوں کا مذاق اڑانا۔ تنزیلہ جی نے اس پجویشن کی
جس طرح منظر نگاری کی۔ اس نے رونے پر بھی مجبور
کر دیا۔ افسانوں میں ”ابرگر ہزاں“ بہت ہی زبردست تحریر

اور "ایسا بھی ہوتا ہے" بہت متاثر کن تحریر تھی۔ مصنفین سے سروے بہت ہی انٹرننگ تھا۔ پڑھ کر مزا آیا۔ ج۔ نہ سرت! سب سے پہلے جاب کی مبارک باد پھر آپ کو اور صائمہ کو 4 مئی کا دن مبارک ہو، آپ دونوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ خواتین پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس بار بھی آپ نے تفصیل سے ہر کہانی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا، بہت شکریہ۔

منہزہ نعیم۔ راولپنڈی

یہ 43 واں سالگرہ نمبر تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ اس رسالے کو پڑھتے ہوئے ہمیں 37 یا 38 سال ہو گئے۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ خاموش قاری تھے۔ جب میں عبد اللہ کلج کراچی میں پڑھتی تھی تب ہم بہت سے رسالے پڑھتے تھے اور شعاع بھی میں 85 سے پڑھ رہی ہوں۔ کب سے سوچ رہی تھی مگر لکھ نہ سکی۔ اب لکھنے لگی ہوں تو دل اداس سا ہے کہ نہ محمود ریاض صاحب ہیں نہ محمود خاور اور نہ میرے زوقی بھیا، عدنان بھائی کے مشورے پڑھ کر ہم اس وقت اچھی بیوی، اچھی ماں کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ سالگرہ نمبر میں تمام بہنوں نے اچھا لکھا ہے، نئی لکھنے والی بہنیں اچھا لکھ رہی ہیں۔

ج۔ منیژہ! ایک طویل عرصہ کی خاموشی کے بعد آپ نے اپنی رائے کا اظہار کر لیا، بہت شکریہ۔ آئندہ خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں پر تبصرہ بھی کیجئے۔

عروج مغل۔ لہٹ ٹاؤن

کیا بتاؤں آپ کو کن حالات میں، میں خواتین پڑھتی ہوں۔ ہم دونوں تبہیں مل کر ڈائجسٹ لیتی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی پہلی باری اس کی ہوئی ہے اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔ اس لیے جس دن خواتین آتا ہے اس دن شکل پہ مسکینی طاری کر کے بڑی چباچی بن کر بیٹھ جاتی ہوں، تاکہ میری بہن کو میری شکل دیکھ کر مجھ پر ترس آجائے اور وہ مجھے خواتین دے دے اور میں اکثر کامیاب ہوتی ہوں۔ کیونکہ وہ مجھے دے دیتی ہے۔ اف یہ

سالار اور امامہ کے جھگڑے بھی نا اور اب یہ ہاشم مبین، اللہ ان جیسے لوگوں کو پوچھے، اس باب کا نام غارت کر ہے اور نمل میں بھی ایک باب کا نام غارت کر تھا۔ "میڈم! زمر کا بھرم رکھے ہوں۔" اپنے فارس بھائی اس بات نے جہاں خوشی دی وہیں جواہر تکی قتل کرنے والی حرکت نے شاکہ کر دیا۔ حنہ واقعی ہی جینٹل ہے۔ فارس غازی کے دکھی انداز پر ہم بہت دکھی ہوئے۔ سعدی یوسف دی گریٹ! ایسا گریٹر جو مثالی ہے اور اب تک گناہ کے راستے سے دور۔ "بن مانگی دعا" اچھا جا رہا ہے۔



قارئین متوجہ ہوں!

- 1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر جبری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تفہیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ سب صورتوں میں ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

آفان و گھید قریشی کے (باتیں)

شاہن رشید

1 "پورا نام؟"

"آفان و گھید قریشی۔"

2 "پیار کا نام؟"

"بچپن میں امی، عفی مگر اب سب آفان ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"

"29 ستمبر اور شہر کراچی۔"

4 "مادری زبان؟"

"پنجابی، پنجاب سے تعلق ہے۔"

5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"

"چار بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی دو بہنیں رتیرا۔"

6 "قد / ستارہ؟"

"5 فٹ 11 انچ ریزان۔"

7 "تعلیمی ڈگری؟"

"این سی اے لاہور کا گریجویٹ ہوں۔"

8 "کیسے طالب علم تھے؟"

"بہت بریلیٹ۔ زندگی میں کبھی سیکنڈ نہیں آیا ہمیشہ

فرسٹ آیا ہوں۔"

9 "شوہر کا نام؟"

"حادثاتی طور پر آیا۔ پہلے ریڈیو پہ تھا آر جے پھر ٹی وی پہ

آیا۔"

10 "پہلا ڈرامہ؟ وجہ شہرت؟"

"تیرے پہلو میں راور کی وجہ شہرت کہہ لیں یا پہچان کہہ

لیں۔"

11 "پہلی کمائی؟"

"پہلی کمائی ریڈیو کی تھی اور شاید چار ہزار چھ سو تھی اور یہ

بات پندرہ سال پہلے کی ہے۔ تو گھروالوں پہ ہی خرچ کی۔"

12 "شوہر میں برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟"

"شوہر میں بہت پیارے لوگ بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی

ہیں جن سے آپ نہیں ملنا چاہتے۔"

13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"مجھے جلدی اٹھنے کی عادت ہے مگر شوہر میں آکر بگڑ گیا

ہوں اور زیادہ سے زیادہ نو بجے تک سوتا ہوں بس۔"

14 "اور رات؟"

"حد سے حد رات بارہ یا ایک بجے تک سو جاتا ہوں۔"

15 "صبح اٹھتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"

"کہ فجر کی نماز پڑھ لوں۔ قضا پڑھتا ہوں۔"

16 "گھروالوں سے کوئی شکایت؟"

"بالکل بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آئیڈیل والدین

دیے ہیں۔"

17 "کون سے تہوار شوق سے مناتے ہیں؟"

"عید، بقر عید بس۔۔۔ اپنی سالگرہ بھی نہیں مناتا۔"

18 "زندگی بدل گئی؟"

"جب سے میں نے باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کی۔"

19 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے

ہیں؟"

"اللہ نے اچھا قد کاٹھ دیا ہے، یہ بھی کرم ہے کہ جو کھاتا

ہوں، موٹا نہیں ہوتا مگر پھر بھی لگتا ہے کہ میں تھوڑا دبلا

ہوں اور مجھے جم جو اٹن کر لینا چاہیے۔"

20 "شدید بھوک میں کیفیت؟"

"برداشت کرتا ہوں۔ خاموش رہتا ہوں۔ اظہار نہیں

کرتا۔"

21 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"ہر شہری کو بنیادی سولتیں مل جائیں اور تعلیم عام ہو

جائے تو کیا کہنے پھر جرائم بھی کم ہو جائیں گے۔"

22 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"ڈرامہ آن ایر ہونے کے بعد "فیڈ بیک" کا۔"



- 23 "شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟"
- 28 "کوئی خوب صورت لڑکی گھورے تو؟"
- 24 "کیس نہیں.... میرا دل چاہتا ہے گھر پر ہی رہوں اور جس نے مجھ سے ملنا ہے وہ گھر آجائے۔"
- 29 "پرائز بانڈ لیتے ہیں؟"
- 24 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"
- 30 "کیا وقت سے پہلے بھی کچھ ملتا ہے؟"
- 25 "طبیعت میں ضد ہے؟"
- 31 "کیا پسند ہے جوائنٹ یا سنگل اکاؤنٹ؟"
- 32 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"
- 33 "شاپنگ کے شوقین ہیں؟"
- 34 "دند و شاپنگ پسند ہے؟"
- 26 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"
- 27 "خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
- 28 "اس کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میرا موڈ خراب ہے تو چھوٹی سی بات پر میٹر گھوم جاتا ہے۔"
- 29 "خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
- 30 "میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ وقت سے پہلے کچھ نہیں ملتا۔"
- 31 "سنگل.... اپنا اپنا۔"
- 32 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"
- 33 "میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ وقت سے پہلے کچھ نہیں ملتا۔"
- 34 "دند و شاپنگ پسند ہے؟"
- 25 "طبیعت میں ضد ہے؟"
- 26 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"
- 27 "خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
- 28 "اس کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میرا موڈ خراب ہے تو چھوٹی سی بات پر میٹر گھوم جاتا ہے۔"
- 29 "خواتین کی کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
- 30 "میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ وقت سے پہلے کچھ نہیں ملتا۔"
- 31 "سنگل.... اپنا اپنا۔"
- 32 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"
- 33 "شاپنگ کے شوقین ہیں؟"
- 34 "دند و شاپنگ پسند ہے؟"

”ہاں جی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ملازمین گھومنا پھرنا کھانا پینا بہت پسند ہے۔ چیزوں کو دیکھنا۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔“

35 ”بچت کی عادت ہے؟ یا شاہ خرچ ہیں؟“

”میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جو بچت کر لیتے ہیں میں تو بچت کر ہی نہیں سکتا۔“

36 ”بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟“

”مجھے تحفے دینا بھی اچھا لگتا ہے اور لینا بھی۔ مجھے پرفیومز بہت پسند ہیں۔“

37 ”موڈ کب اچھا ہو جاتا ہے؟“

”تین چار باتیں ہیں۔ مگر میں بات یہ ہے کہ جب کوئی کتا ہے کہ آپ آگے بڑھ رہے ہیں آپ کی پرفارمنس میں نکھار آ رہا ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے۔“

38 ”آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟“

”بالکل بھی نہیں۔ اگر کوئی مجبوری نہ ہو۔ پندرہ بیس منٹ تو سوچ کے اور پھر بہت کر کے اٹھتا ہوں۔“

39 ”کن لوگوں کے خلوص پہ شک نہیں کیا جاسکتا؟“

”صرف اور صرف والدین کے خلوص پہ۔“

40 ”لباس میں کیا پسند ہے؟“

”جینز اور شرٹ۔“

41 ”عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟“

”میزان لوگ تو ہوتے ہی بہت حسن پرست ہیں لیکن ذہانت کے بغیر گزارا نہیں میرا۔ حسن کے بغیر شاید کسی پوائنٹ پہ گزارہ ہو جائے مگر ذہانت کے بغیر تو ایک لمحہ بھی مشکل ہے۔“

42 ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“

”مجھ پر کچھ وقت ایسے آتے ہیں کہ مجھے اپنے کمرے میں سکون ملتا ہے۔ کچھ دن ایسے ہوتے ہیں کہ گھر کے لاونج میں سکون ملتا ہے امی ابو کے ساتھ۔“

43 ”کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں؟“

”مانیہ سعید کے ساتھ۔“

44 ”کیا ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟“

”وہ زمانے بیت گئے۔ جب ایس ایم ایس کا انتظار ہوتا

تھا۔ اب تو لیٹ Reply ہی کرتا ہوں۔“

45 ”یوریت کس طرح دور کرتے ہیں؟“

”کتاب پڑھ لیتا ہوں بہت مطالعہ کرتا ہوں۔ یا پھر میوزک۔“

46 ”کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟“

”ہاں جی ایک بار نہیں کئی بار۔“

47 ”مہمانوں کی آمد وہ بھی اچانک کیسی لگتی ہے؟“

”مہمانوں کی آمد ہمیشہ اچھی لگتی ہے کیونکہ اس سے موڈ میں تھوڑا چینج آتا ہے۔“

48 ”اگر پاور میں آجائیں تو پہلا کام؟“

”میں کبھی پاور میں نہیں آتا چاہوں گا۔ بہت خوف آتا ہے۔“

49 ”کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟“

”کتابیں۔ میں نے بتایا نا کہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے۔“

50 ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“

”آنان! میڈیا میں سوچ سمجھ کر کام کرنا زیادہ ڈرامے مت کرنا۔ پتا نہیں ان باتوں کا کیا مقصد ہوتا ہے۔“

51 ”انسان کی زندگی کا سب سے بہترین دور کون سا ہوتا ہے؟“

”بچپن.... بہت یاد آتا ہے۔“

52 ”کن لوگوں پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟“

”اپنے والدین پہ.... خاص طور پر اپنی امی پہ۔“

53 ”اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا قیمتی چیز خریدی؟“

”گاڑی.... جو کہ بہت مہنگی تھی۔“

54 ”کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی، ٹیبل یا اپنا بیڈ؟“

”اپنا بیڈ۔“

55 ”ہاتھ سے کھاتے ہیں یا چھری کانٹے سے؟“

”ریسٹورنٹ میں مجبوری کے تحت چھری کانٹے سے کھاتا ہوں ورنہ ہاتھ سے ہی کھاتا ہوں اور پیزا بھی ہاتھ سے ہی کھاتا ہوں۔“

56 ”دنیا سے کیا لینا چاہتے ہیں؟“

”دنیا کچھ نہیں دے سکتی دنیا سے آخرت کمانا چاہتا ہوں۔“

282 مئی 2015

57 "فیس بک اور انٹرنیٹ سے دلچسپی؟"

"صرف ناٹم Kill کرنے کی حد تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

58 "وہی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟"

"ایک زمانہ تھا جب وہی کھانے بہت پسند تھے اور بدیسی کھانوں سے بہت ایشو تھا مگر اب بدیسی کھانے زیادہ پسند ہیں۔"

59 "ایک بات جو لوگ آپ کے لیے کہتے ہیں؟"

"کہ آپ کو شیفت ہونا چاہیے تھا کیونکہ میں بہت اچھا کھانا پکاتا ہوں۔"

60 "عشق کے بخار؟"

"میری زندگی کے کچھ پچھتاوے ہیں جو کہ یہی ہیں۔"

61 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"

"میں نے ویسے کچھ عورتوں کو بہت سخت دل بھی دیکھا ہے لیکن اگر مردوں سے موازنہ کریں تو پھر عورت نرم دل ہوتی ہے۔"

62 "ایک سوال جو آپ کو برا لگتا ہو؟"

"نہیں۔ ایسا کوئی سوال نہیں ہے اور برا لگے تو منع کر دیتا ہوں۔"

63 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے چھپکلی سے انتہائی خوف اور انتہائی گھمن آتی ہے۔"

64 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"اندھی؟۔۔۔ محبت کے ہاتھ پاؤں سر پیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

65 "کب بہت تکلیف ہوتی ہے؟"

"جب کوئی جھوٹ بولے اور جھوٹ بول کر کہے کہ وہ آپ کے ساتھ مخلص ہے اور جبکہ وہ مخلص نہیں ہوتا اور جب آپ کسی کے لیے ایک دم سے امپورٹنٹ نہیں رہتے تو وہ چیز ہضم کرنا بہت مشکل کام ہے۔"

66 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"شادی میں ہندی کیونکہ ڈانس وغیرہ ہوتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

67 "تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"شادی میں تو کیش ہی دینا چاہیے۔"

68 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"ناشتہ زیادہ شوق سے کرتا نہیں ہوں ہاں کھانا مجھے اپنی بہن کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے۔"

69 "کیا بار بار فون نمبرز تبدیل کرتے ہیں؟"

"گزشتہ چودہ سال سے میرے پاس ایک ہی نمبر ہے۔"

70 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"اپنا والٹ اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی۔"

71 "کیا آپ عام لوگوں جیسے ہیں؟"

"گھر سے باہر عام لوگوں جیسا نہیں ہوں ہاں گھر کے اندر میں ویسا ہی ہوں جیسے ہمیشہ سے تھا۔"

72 "ماں ناراض ہو جائے تو؟"

"امی اگر ناراض ہوتی ہیں تو ہم دونوں کو پتا چل جاتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے بات کر لینی ہے اور بالکل نارمل طریقے سے۔"

73 "انہی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"

"کبھی مشکل سے کبھی فوراً۔"

74 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"

"میں تو دل کے ہاتھوں بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔ میں

چاہتا ہوں کہ دماغ کی سنوں۔"

75 "غصے میں پہلا لفظ؟"

"وہ میں بتا نہیں سکتا۔" قہقہہ

76 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"

"جب آپ کے اندر غرور سر اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔"

77 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے یا؟"

"میں تو بستر کے راستے میں ہی ہوتا ہوں کہ مجھے نیند آ جاتی ہے۔"

99 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"

"میں اس چیز کے لیے بہت زیادہ تیار ہوں۔ اس دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔"



(شرمین مغرب والے تو مسلمانوں کو پہلے ہی اجڈ اور وحشی سمجھتے ہیں، آپ یہ ”تعمیری“ کام کر کے آسکر تو بیت لکیں لیکن پاکستان کا میچ؟)

راستہ

یہ خبر تو آپ روز ہی پڑھتے ہوں گے کہ فلاں پاکستانی اداکار یا اداکارہ بولی ووڈ میں کام کر رہی ہے یا کر رہا ہے اور کامیاب بھی ہو رہا ہے۔ وہاں پاکستانی فنکاروں کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ لیکن اب تک کسی بھارتی فنکار نے پاکستانی فلم میں کام نہیں کیا سوائے نصیر الدین شاہ کے، جنہوں نے شعیب منصور کی فلم ”خدا کے لیے“ میں مختصر مگر جامع کردار کیا تھا۔ لیکن اب شاید بھارتی فنکاروں کا پاکستانی انڈسٹری میں راستہ کھل جائے۔



خبرگی ویرگی

واصفہ سہیل

تعمیری کام

کیوں کہ ہدایت کار جمشید جان نے اپنی فلم ”سوالِ سمات سو کروڑ کا“ میں بھارت کے مقبول مزاحیہ اداکار

پاکستان کی واحد آسکر اوارڈ یافتہ فلم ساز شرمین عبید چنائے کی نئی دستاویزی فلم ”سونگ آف لاہور“ کو 14 ویں سالانہ ٹری بیکا فلم فیسٹول کے لیے نامزد کر لیا گیا ہے۔ (کیا پاکستان میں شرمین سے اچھی ڈاکیومنٹری کوئی نہیں بناتا جو ہر بار...) اس سال اس فلمی میلے میں 80 ممالک کی 160 سے زیادہ فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جائیں گی۔

دستاویزی فلموں کے متعلق شرمین عبید چنائے کہتی ہیں کہ دستاویزی فلمیں بنانے میں میری دلچسپی کا آغاز 2001ء میں اس وقت ہوا جب گیارہ ستمبر کا واقعہ پیش آیا تو دنیا کی توجہ پاکستان اور افغانستان کی طرف ہوئی۔ اس وقت مجھے لگا کہ میں مشرق کی معلومات مغرب کو منتقل کرنے کا تعمیری کام کر سکوں گی۔

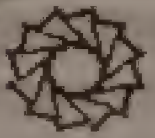


سے پسند ہیں۔) میرا چاہتی ہیں کہ شاہدہ منی انہیں اپنی ویڈیو میں کاسٹ کریں۔ جب وہ انہیں کہیں گی وہ ویڈیو شوٹ کے لیے حاضر ہو جائیں گی۔ (میرا کام نہ ملنے کے باعث یہ صورت حال ہو گئی ہے کہ آپ شاہدہ منی سے کام مانگ رہی ہیں۔؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ٹیلی ویژن چینلز کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت نے سیاسی سوالات پر از خود غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کی جگہ سوچنے کا ذمہ ہمارے اشار بنے اینکروں نے اپنے سر لے لیا ہے اسی لیے ٹیلی ویژن اسکرین پر اب حقائق نہیں ڈرامے نظر آتے ہیں اور شو بزدلوں کے وہ تمام ہتھکنڈے جو نیکی اور بدی کے درمیان کسی بڑی جنگ میں اپنے تئیں حق کے طرف دار بنے مجاہدوں کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

(نصرت جاوید)



”راج پال یادو“ کو کاسٹ کر لیا ہے۔ (کیا قلم کا نام دیکھ کر راضی ہو گئے راج پال؟)

امکان

لیجئے جناب اب کراچی ”یو آر کلنگ می“ (نہ نہ بخدا یہ ہم نہیں کہہ رہے) بلکہ پاکستانی صحافی صبا امتیاز کا ناول ہے یہ۔ اس پر بھارتی ہدایت کار نے فلم بنانے کا اعلان کر دیا ہے (پر کراچی پر ہی کیوں۔؟) اور بھارتی فلم ساز اور صبا امتیاز مل کر اس کو بھارتی سیاق و سباق میں ڈھال رہے ہیں (شکر ہے! ورنہ ہم تو ڈر ہی گئے تھے کہ۔۔؟) اس فلم کا نام ”دہلی یو آر کلنگ می“ رکھے جانے کا امکان ہے۔ جس میں پرانی دہلی کو فلمایا جائے گا (کیوں نئی دہلی میں۔؟)

مانگ

اداکار میرا شاہدہ منی کی ویڈیو میں بلا معاوضہ کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ (دیکھا ہم کہتے ہیں تاکہ میرا خبروں میں رہنے کے فن سے آشنا ہیں۔) لاہور میں ایک میوزیکل ٹائٹ میں اداکار میرا نے رفاہ منس دی۔ میرا نے کہا کہ وہ شاہدہ منی کی بہت بڑی فین ہیں۔ جب وہ اداکاری کرتی تھیں اور جب سے انہوں نے (بھئی شاہدہ منی نے) گلوکاری شروع کی ہے وہ ان کی ڈبل فین ہو گئی ہیں (مطلب صاف ہے بھئی کہ بچپن

آپ کا باورچی خانہ

کائنات خالد

ہیں تو ہٹا کے ہی جاتے ہیں۔ امی کھانا بہت زبردست بناتی ہیں۔ اس لیے جو ایک ڈش وہ بہنوئی کی فرمائش پر بناتی ہیں اس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔

لب شیریں

اجزاء :

دودھ

سویاں

چینی

چھوہارے

پستہ بادام

ناریل ثابت

چھوٹی الائچی

کیوٹہ

کارن فلور

خشک دودھ

ترکیب :

ایک کلو
آدھا پکٹ
حسب نشا
چار عدد (باریک کٹے ہوئے)
دس عدد
حسب پسند
چار دانے
چند قطرے
دو چمچے
ایک گپ

سب سے پہلے دیکھی میں اچھی طرح دودھ کو ابل لیں۔ پھر اس میں سویاں ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پکنے دیں۔ تھوڑی دیر بعد چینی ڈال کر اس طرح پکا میں کہ چینی اس میں اچھی طرح گھل جائے۔ اب ایک بڑے سے پیالے میں خشک دودھ ڈالیں۔ کارن فلور ڈالیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر اس مکسچر کو دیکھی میں ڈال دیں اور اس وقت تک چمچ ہلاتی رہیں جب تک کارن فلور اچھی طرح اس میں سوچ بس نہ جائے۔ (تقریباً پانچ منٹ تک چمچ ہلاتی رہیں کیونکہ

کچن روزمرہ کی زندگی کا وہ حصہ ہے جسے اگر صاف رکھا جائے تو عورت کی سلیقہ مندی کی گواہی کوئی بھی دیکھ کے دے سکتا ہے۔

1۔ جب امی کھانا بناتی تھیں تب بھی اور جب سے میں نے کھانا بنانا شروع کیا ہے تو میں بھی پسند و ناپسند کا خیال ضرور رکھتی ہوں۔ میں زیادہ تر بھائیوں کے کھانے کی پسند کا خیال رکھتی ہوں کیونکہ زبیر بھائی اور عمیر بہت موڈی ہیں میرے ابو (خالد ممتاز) وہ کھانے کے معاملے میں غرے نہیں کرتے میں اور چھوٹا بھائی نوٹی وہ نارمل ہیں اور امی (ناگلہ خالد) وہ بھی غریبی نہیں بس یہ دونوں بھائی پتا نہیں کس پہ چلے گئے۔ اسی لیے زیادہ تر ہمارے گھر میں دو ڈشیں لازمی بنتی ہیں زیادہ تر کھانا امی ہی بناتی ہیں۔ اور پسند و ناپسند کی عادت میں نے ان ہی سے سیکھی ہیں ویسے سچ کہوں تو کھانے کے معاملے میں میں بھی بہت موڈی ہوں مگر غریبی نہیں۔

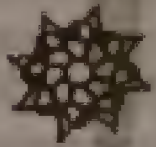
2۔ ہمارے گھر مہمان زیادہ تر عید یا کسی خاص موقع آتے ہیں اور ان کی خاطر تواضع کا اہتمام زیادہ تر باہر کی چیزوں پہ ہوتا ہے لیکن اگر ماسوں کی لیمپیز یا بڑی بہن (صبا جہاں زیب جس کی شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے) وہ آجائے تو بس پھر کیا امی کچن اور میں۔ امی کھانا بناتی ہیں۔ میں مدد کرائی جاتی ہوں اور ساتھ ساتھ پورے گھر کی صفائی اور برتنوں کی دھلائی بڑی بہن اور بھتی رشتہ دار جب کھانا وغیرہ کے لیے آتے ہیں تو پہلے سے ہٹا کے آتے ہیں اور میرے خیال سے یہ اچھی بات ہے کیونکہ ہم بھی جب کسی کے گھر جاتے

بڑے ہمیں خود باہر کھانا وغیرہ کھلا کے ہمارا شوق پورا کر دیتے ہیں۔

6۔ کھانا موسم کے حساب سے بنانا ضرور چاہیے اور میں تو اس چیز کا خیال ضرور رکھتی ہوں کہ اگر گرمیاں ہوں تو جو سبز وغیرہ سردیوں میں سوپ وغیرہ۔ اس لحاظ سے (جو کہ میرے مطلب کی چیزیں ہیں) میں خیال رکھتی ہوں۔ بارش کے موسم یا گرمی، سردی کے موسم، میری امی ماشاء اللہ کھانے کے لحاظ سے بہت اہتمام کرتی ہیں۔ بارش کا موسم ہو اور امی کے ہاتھ کی بیسنی روٹی، مزہ آجاتا ہے سچ میں۔

7۔ کھانا ہمیشہ دل سے بنانا چاہیے تب ہی وہ د سروں کو پسند آتا ہے، کیونکہ اچھا کھانا وہی ہوتا ہے جو لگن سے اور محنت سے بنایا جائے۔ اسی لیے جب بھی کھانا پنائیں دل سے بنائیں۔ کیونکہ اسی طرح آپ کی تعریف ہو سکتی ہے اور آپ کی محنت وصول ہو سکتی ہے۔

8۔ کھانا بنانے سے پہلے بسم اللہ ضرور پڑھیں، کیونکہ اس سے کھانے میں برکت پیدا ہوتی ہے اور ایک بات جب بھی کھانا پیش کریں، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پیش کریں، کیونکہ اگر کھانا برا بھی بنا ہو تو کیا پتا آپ کی مسکراہٹ سے اسے وہ بھی اچھا لگ جائے، اس لیے کھانا اچھا ہو برا، مسکراہٹ زندہ باو۔



سرواق کی شخصیت

ماڈل ----- آمنہ کریم
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا

کارن فلور ڈالنے کے بعد ایسا نہ کرنے کی صورت میں گٹھلیاں بن جاتی ہیں۔) پھر اس کے بعد الائچی، کیوٹہ، چھوہارے اور بانی میوہ جات ڈال کر اچھی طرح پکائیں۔ دس منٹ بعد ڈش میں نکال لیں۔ چاندی کے ورق سے سجا میں اور مزے سے کھائیں اور میری امی کو دعا میں دیں۔

3۔ ہم۔ ہم۔ یہ کام کا سوال ہے۔ میرا مطلب ہے میرے مطلب کا، کیونکہ مجھے بچن کی صفائی کا خطبہ ہے۔ میں چاہے کھانا بناؤں یا نہ۔ مگر بچن گندہ ہو، میں مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں گندی ہوں اور گھر کا کوئی کونا صاف کروں یا نہ کروں، لیکن بچن صاف میں ضرور رکھتی ہوں اور سچ بات ہے کہ اگر بچن صاف ہو تو کھانا دل سے پکایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ہر تھوڑی دیر بعد میں بچن میں ضرور جاتی ہوں کہ اگر کوئی چیز الٹ پلٹ پڑی ہے تو اسے اس کی درست جگہ پر رکھ سکوں۔

4۔ ناشتا عام دنوں میں ہمارے گھر چائے، پاپوں پر ہوتا ہے، لیکن چھٹی والے دن اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ کبھی حلوہ پوری، کبھی باہر کے پرائے وغیرہ، ہم بہن بھائیوں کی پسند کھانے کے معاملے میں بہت ملتی ہے۔ اسی لیے ناشتا میں پسند و ناپسند کا چکر زیادہ نہیں چلتا۔

5۔ ہماری تائی (نادرہ جو کہ ہماری خالہ بھی ہیں) کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور ان ہی کی وجہ سے ہمیں باہر جانے کا موقع (کھانے وغیرہ کے لیے) بہت کم ملتا ہے، کیونکہ وہ اپنے پکوانوں سے ہماری گھر بیٹھے ہی باہر کی سیر کرا دیتی ہیں، لیکن ایسا نہیں کہ ہم نے بالکل بھی باہر کھانا نہیں کھایا، ہم نے باہر کھانا ندا کے ساتھ بھی بہت تو نہیں، لیکن کھایا ہے۔ (ندا میری بہترین دوست کزن ہے) جب بھی وہ آتی ہے تو میں لایا ابو سے اصرار کر کے اس کے ساتھ گھومنے کا پروگرام ضرور رکھتی ہوں۔ لیکن ہم لڑکیاں آج تک علیحدہ کے بغیر خود سے باہر نہیں گئیں، کیونکہ نہ ہمیں پسند ہے اور نہ ہی ہمیں اجازت ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے

میری شادی کو چار سال ہونے والے ہیں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اڑھائی سال کی بیٹی ہے اور گجرات میں گریڈ 9 پر گورنمنٹ نیچر اپائنمنٹ ہوئی ہے لیکن بیٹی میرے بغیر نہیں رہ سکتی اور اسکول ساتھ لے کر جانے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح کے چھوٹے موٹے مسائل کی بنا پر میرا دل جاب سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ شوہر پرائیویٹ جاب کرتے ہیں، آٹھ ہزار تنخواہ پر گزارہ مشکل ہے۔

میں میکے میں تھی ایک سال پہلے میرے شوہر ناراضی ختم ہونے پر آکر مجھے لے گئے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے مجھے کئی دفعہ برملا کہا کہ تمہارے والد صاحب نے مجھے برا بھلا کہا تھا اس لیے تمہیں میکے صرف دروازے تک چھوڑنے جاؤں گا اور ایسا ہوا بھی بلکہ ایک دفعہ میں نے زیادہ زور دیا کہ اب گلی تک آگئے ہیں تو اندر ضرور آنا ہے لیکن انہوں نے ضد میں آکر بیک وغیرہ گلی کے درمیان ہی پھینک دیا اور واپس چلے گئے۔

میکے رہ کر جاب کرنے کی اجازت انہوں نے میری ساس کے کہنے پر دے تو دی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ وہ ادھر آکر رہ نہیں سکتے۔ سوچتی ہوں کہ وہ کو آپریٹ نہیں کرتے تو میں کیوں ان کی بیٹی بھی پالوں اور اکیلی سروائیو بھی کروں اور پھر انہیں کمائی کا حساب دوں کہ کتنا کمایا کتنا بچایا وغیرہ وغیرہ۔

اب جبکہ میں جاب چھوڑ چکی ہوں تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تم نفسیاتی مریضہ ہو اور اب تم جب گھر آؤ گی تو تمہاری پہلی جیسی عزت نہیں ہو گی اور سب کے طعنے سنو گی۔

بیج۔ اچھی بہن! آپ نے جاب چھوڑ کر واقعی غلطی کی۔ یہ تو آپ کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کو گورنمنٹ جاب مل گئی تھی۔ جہاں تک آپ کے شوہر کے رویہ کا تعلق ہے تو اس کی بڑی وجہ ان ذہنی پریشانی اور احساس کمتری ہے۔ آپ خود سوچیں اس منگائی کے دور میں آٹھ ہزار تنخواہ میں وہ آپ کا اور اپنی بیٹی کا خرچ کیسے اٹھا سکتے ہیں۔ آپ کی سوچ غلط تھی۔ اگر آپ تھوڑا برداشت اور تحمل سے کام لیتیں تو کچھ عرصہ بعد وہ آپ کے ساتھ آکر رہ لیتے۔

ازدواجی زندگی میں کسی بھی مسئلہ میں ضد جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آپ نے جلد بازی کی۔ اب آپ کو ساتھ رکھتے ہوئے وہ اسی لیے گھبرا رہے ہیں کہ خرچہ برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

آپ کو شش کریں کہ دوبارہ آپ کی جاب ہو جائے شوہر دوسری شادی کا ذکر کرتے ہیں تو کرنے دیں۔ اتنی کم تنخواہ میں دوسری شادی آسان نہیں ہے۔ اور یہ اطمینان رکھیں کہ کچھ عرصہ بعد وہ آپ کے پاس آجائیں گے۔ اور آپ کے ساتھ سہی رہیں گے۔

میری عمر 21 سال ہے۔ جبکہ میری تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔ میرے بابا شروع ہی سے بہت سخت مزاج کے تھے۔ جس کی وجہ سے میرے اندر خوف و ہراس، کم اعتمادی اور نگیٹو سوچ جیسی خامیاں اتر آئیں اور آج میرا یہ حال ہے کہ میں کسی کا بھی سامنا کرنے سے کتراتی ہوں اور ہر کام کو کرنے سے پہلے خوف میں مبتلا ہو جاتی ہوں کہ یہ مجھ سے غلط ہو جائے گا اور میں غلطیاں بھی بہت کرتی ہوں۔ میرے اندر ضد والی خانی بھی ہے اور یہ سب عادات اتنی پختہ ہو چکی ہیں کہ یہ کوشش کرنے کے باوجود نہیں جا رہیں۔ 21 سال کی عمر میں ہی لگتا ہے کہ جیسے میں ضعیف ہو چکی ہوں۔ جبکہ گریجویشن مجھے میری سسٹرن نے اپنے پیسوں سے کروایا جو جاب کرتی ہیں اور آج تک اپنی تمام تعلیمی اسناد اور ان کا خرچہ خود اٹھایا اور ہماری امی جو کہ 9 سال سے فالج کی مریضہ ہیں۔ اب گھر میں ان کی دیکھ بھال میں کرتی ہوں۔ میں زندگی کے بہت عجب بھنور میں پھنس چکی ہوں۔ مجھے آگے بڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جبکہ ایسے حالات میں میں کچھ نہیں کر سکتی۔

میرے ایک بھائی کو ایک بار ایسے حالات میں میں نے پایا تھا کہ وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔
میرے ایک بھائی کو ایک بار ایسے حالات میں میں نے پایا تھا کہ وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔
میرے ایک بھائی کو ایک بار ایسے حالات میں میں نے پایا تھا کہ وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔

ج : ذہن لوگوں کے ساتھ

ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت حساس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ آپ نہ بزدل ہیں نہ ذہنی

مریض نہ ہی آپ میں کوئی خرابی ہے۔۔۔ ذہنی مریض تو وہ استاد ہیں جنہوں نے آپ سے اس طرح کی باتیں کیں۔ کسی بھی نارمل اچھے بھلے آدمی سے یہ کہنا شروع کر دیں کہ وہ مینٹل تھیک نہیں ہے تو کچھ عرصے کے بعد وہ سچ سچ پاگل ہو جائے گا۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ آپ پریشان تھیں۔ ان بچہ کی باتوں نے آپ کو مزید پریشان کر دیا۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے خود اعتمادی پہلے ہی کم تھی، مزید خوف کا شکار ہو گئیں اور رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا۔

آپ کی صاف ستھری موتوں جیسی لکھائی رواں تحریر، خط لکھنے کا انداز بتاتا ہے کہ آپ پڑھی لکھی، سمجھ دار اور باشعور لڑکی ہیں۔۔۔ کچھ بننے کا جذبہ، کچھ کر دکھانے کا شوق یہ سب باتیں ایک ذہن اور باصلاحیت انسان میں ہی ہو سکتی ہیں۔ اور آپ نے خود لکھا ہے کہ لوگ آپ کو بہت ذہین سمجھتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں۔ یقیناً "آپ میں کوئی خوبی ہے تب ہی عزت کرتے ہیں۔

آپ کو صرف ذہنی سکون کی ضرورت ہے، ہر وقت کی پریشان کن سوچیں آپ کو سکون سے نہیں رہنے دیتیں۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے ذہنی سکون کے لیے کوئی دوا لے لیں۔ بھرپور نیند، اچھی خوراک سے آپ چند دنوں میں بالکل خوش باش اور ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی۔

پڑھی لکھی ہیں، گریجویشن کر چکی ہیں۔ آپ کی بہن جاب کرتی رہی ہیں۔ آپ بھی جاب کے بارے میں سوچیں، پریشانیوں اور پریشان کن سوچوں کا بہترین علاج مصروفیت ہے۔ اگر آپ میں شاعری کی صلاحیت ہے تو شاعری ضرور کریں۔

ن۔ پیچھے وطنی

میں تقریباً "بارہ تیرہ سال سے ذہنی مریض ہوں اور اس وقت میری عمر اٹھائیس سال ہے میرے ابو بہت کنجوس ہیں اور آج تک عید شب رات پر بھی انہوں نے ہمیں کپڑے بنا کر نہیں دیے جبکہ وہ بہت نمازی پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ وقت پر ادا کرتے ہیں۔ مگر میری جلدی بیماری پر ایک چوٹی تک خرچ نہیں کرتے۔ ہم پہلے شہر میں رہتے تھے پھر ابو کے اصرار پر ہم وہاں سے شفٹ ہو گئے۔ میری تعلیم بی اے ہے اور ہم شہر کے ماحول کے عادی ہیں۔ خاندان میں سب لڑکے شادی شدہ یا ہم سے بہت چھوٹے ہیں۔ ابو کی کنجوسی کی وجہ سے میری بہن کا رشتہ ٹوٹ گیا کہ نبھانے یہ لوگ ہمیں جہیز دیں گے یا نہیں۔ ہمارے لیے محلے کے آوارہ بے روزگار لڑکوں کے رشتے آتے ہیں اور میرے ابو کہتے ہیں کہ ان میں سے ہی کسی سے شادی کر لو ورنہ ساری زندگی بے شک کنواری بیٹھی رہو۔ میں ایک تو پہلے ہی ڈپریشن کی مریض ہوں۔ دوسرا ابو کی ضد اور سوچ اور اپنی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے روز بروز پریشان ہوتی جا رہی ہوں کہ ہمارا کیا بنے گا۔ اگر ابو کے مطابق کسی بے روزگار لڑکے سے شادی کر لوں تو شادی کے بعد میرے مسائل میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

جنت۔ اچھی بہن! آپ نے یہ کیسے طے کر لیا کہ آپ ذہنی مریض ہیں البتہ آپ کے حالات واقعی بہت پریشان کن ہیں لیکن پریشان رہنے سے کسی مسئلہ کا حل نہیں نکل سکتا۔ کسی جاہل آوارہ اور بے روزگار لڑکے سے شادی کرنا پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا ہے لڑکا شریف بڑھا لکھا ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ اسے کوئی نوکری مل جائے گی۔

آپ پڑھی لکھی ہیں۔ کوشش کریں کہ کہیں جاب مل جائے۔ اس طرح ایک تو مصروف رہیں گی دوسرے گھر کے ماحول سے دور رہیں گی۔ آپ ذہنی مریض نہیں ہیں، صرف پریشان ہیں اور ان ہی پریشانیوں نے آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کیا ہے آپ نے اپنی جلدی بیماری کے بارے میں نہیں لکھا بہت سی جلدی بیماریاں ذہنی پریشانی کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں۔ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ جب چاروں طرف سے پریشانیاں گھیر لیں اور کوئی راستہ نظر نہ آئے تو اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالتا ہے۔ ہر پریشانی کے بعد راحت ہے۔ آپ دعا کرتی رہیں ان شاء اللہ آپ کے حالات ضرور بہتر ہوں گے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

شاہدہ انجم.... کراچی

کوشش کریں۔ روزانہ دس سے پندرہ منٹ یہ عمل کریں ایک ماہ میں آپ نمایاں فرق محسوس کریں گی۔ وزن کم کرنے پر بھی توجہ دیں۔ آپ کو کم از کم تین سے پانچ کلو وزن کم کرنے کی ضرورت ہے پیدل چلنے اور غذا پر توجہ دینے سے آپ کا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ چکنائی والی اور میٹھی اشیاء کا استعمال ترک کر دیں۔

شاہدہ انجم.... لاہور

س۔ میرا کام ایسا ہے کہ مجھے باہر نکلنا پڑتا ہے دھوپ میں چل چل کر میری جلد بری طرح جھلس جاتی ہے۔ چہرہ گردن اور کلائیوں پر لکڑی ہیں جبکہ پہلے میرا رنگ بہت صاف تھا۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے میرا رنگ صاف ہو جائے۔

ج۔ شہد بہترین جراثیم کش ہے نیوزی لینڈ میں نوجوان طلبہ پر تجربہ کیا گیا جن کے چہرے پر لکڑی، مہاسے تھے۔ ان کے چہرے پر شہد کی کریم جب چہرہ کے ایک طرف لگائی گئی تو پتا چلا کہ جس طرف شہد لگایا گیا تھا۔ اس طرف کی جلد دانوں اور مہاسوں سے صاف ہو گئی۔ زخم پر شہد لگانے سے زخم جلد مندمل ہو جاتا ہے۔

دھوپ کی شدت سے مرجھائی اور جھلسی ہوئی جلد کے لیے شہد کا ماسک اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ماسک ہر قسم کی جلد کی حامل خواتین استعمال کر سکتی ہیں۔ شہد اور بیسن ہم وزن ایک پیالے میں لیں اور اچھی طرح مکس کریں تاکہ یہ آمیزہ کریم کی طرح گاڑھا ہو جائے۔ اب اسے چہرے، گردن اور بازوؤں پر لگائیں تقریباً بیس منٹ لگا رہنے دیں۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ یہ عمل دوہرائیں۔

س۔ میری عمر 25 سال ہے اور میرے اگلے چار دانت ٹیڑھے میڑھے اور قدرے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ جس سے اوپر کا ہونٹ اٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ دانتوں کا رنگ پیلا ہے۔ میں بڑی باقاعدگی سے صبح شام دانت صاف کرتی ہوں۔ کئی مہینے بھی استعمال کر کے دیکھ چکی ہوں۔ کوئی ترکیب بتائیں کہ جس سے دانت سفید اور چمک دار ہو جائیں۔

ج۔ چہرے کی خوب صورتی میں دانت بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر آپ کم عمری میں دانتوں کے گرد تار لگوا لیتیں تو یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ اب بھی ڈاکٹر سے مشورہ کریں تار لگوانے سے کسی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے ورنہ آپ یہ دانت نکلا کر مصنوعی دانت بھی لگوا سکتی ہیں۔

پہلے دانتوں پر پالش کرا کے انہیں سفید کیا جاسکتا ہے۔

منیزہ خان.... کراچی

س۔ میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ وزن بھی زیادہ ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے۔ پیٹ زیادہ بڑھا ہوا ہے کمر بھی بہت چوڑی ہے۔ میرا قد پانچ فٹ دو انچ اور وزن 55 کلو ہے۔ عمر 29 سال ہے۔

ج۔ بڑھے ہوئے پیٹ کے لیے آپ سیدھی لیٹ جائیں اور جس طرح سائیکل چلاتے ہیں اس طرح ٹانگوں کو حرکت دیں۔ روزانہ باقاعدگی سے یہ عمل کریں پہلے پانچ منٹ سے شروع کریں پھر بیس منٹ تک لے جائیں۔

2۔ بیٹھ کر ٹانگیں پھیلائیں اور اب ٹانگوں کو سیدھا رکھتے ہوئے ہاتھ سے پیر کے انگوٹھے چھونے کی